

www.urduchannel.in

آزاد کشمیر

آزاد کشمیر

اردو چینل

www.urduchannel.in

آخرِ شب کے مسافر

قرۃ العین حیدر

چودھری کبیر می

۳۱۳۔ ذوالقرنین چیمبرنگ پت روڈ، لاہور

ناشر ————— محمد خالد چودھری
اہتمام ————— میاں محمد اسلم
مطبع —————
قیمت ————— پینتیس روپے ۳۵

مطبوعہ
عبد اللہ سنز پرنٹرز
۱۴ - دربار مارکیٹ - لاہور

ابواب

نمبر صفحہ

۹

۱۔ چند رنگ

۱۷

۲۔ طوفان سے پہلے

۲۰

۳۔ وود کیت ٹنز

۲۲

۴۔ جوار بھانا کا گیت

۲۸

۵۔ کھاری اوارائے

۴۸

۶۔ ریور ٹڈ پال مقیمو بنرجی

۶۲

۷۔ نیا عجم نامہ

۶۶

۸۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ

۷۱

۹۔ کلثوم آیا

۷۵

۱۰۔ ویشنو بیراگی

۸۲

۱۱۔ رلی کاٹج

۹۱

۱۲۔ شانتی نکیتن

۹۴

۱۳۔ مس روزی بنرجی اور سولیدرٹی

۹۸

۱۴۔ اما پرانیہ آرام موئیر آئند

- ۱۰۱ - ۱۵۔ سندربن
۱۲۵ - ۱۶۔ ارجسند منزل
۱۳۷ - ۱۷۔ گوڑ ملہار
۱۵۱ - ۱۸۔ میٹھ رنجنی راگنی
۱۵۴ - ۱۹۔ بھیرلی کا خواب
۱۶۳ - ۲۰۔ ہرے بنگال کا "آئندہ کانن"
۱۶۸ - ۲۱۔ اگست اندولن اور سپلز وار
۱۷۱ - ۲۲۔ بدروی
۱۸۰ - ۲۳۔ گنگا اور برہمپتر
۱۸۹ - ۲۴۔ چارلس بارلو، "بنگال سولین"
۲۳۲ - ۲۵۔ فواب قمر الزماں چودھری
۲۳۷ - ۲۶۔ ریحان الدین احمد
۲۴۱ - ۲۷۔ جہاں آراء میگم
۲۴۷ - ۲۸۔ روٹگیلا نائیر مانجھی
۲۷۳ - ۲۹۔ شرمستی رادھیکا سانیاں
۲۷۹ - ۳۰۔ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار
۲۹۱ - ۳۱۔ دہن کی پاکھی
۲۹۹ - ۳۲۔ کھل اور کھل

- ۳۰۹ - بر دز آف پیراڈائر
۳۲۳ - ایستفگری بلائیرجی
۳۲۴ - ۳۵ - یاسین بلونٹ، "ڈارک ڈانسر"
۳۲۷ - ۳۶ - پائلٹ آفیسر اکمل مرشدزادہ
۳۳۲ - ۳۷ - شتگری کاناج
۳۳۵ - ۳۸ - گلڈنک ڈائری
۳۵۰ - ۳۹ - شہر زاد کر سینا بلونٹ
۳۵۳ - ۴۰ - سوای آتم آنند شتگری
۳۵۶ - ۴۱ - جلسہ گھر
۳۷۰ - ۴۲ - نامہ نجم السحر قادی
۳۷۶ - ۴۳ - رچرڈ بارلو
۳۸۲ - ۴۴ - آثار شناسی - ۹
۳۸۷ - ۴۵ - ذکاء راگی
۳۹۲ - ۴۶ - بھیروراک



چندر کچ

ڈھاکہ شہر کے ایک درمیانی درجے کے رہائشی علاقے میں ام اور کیلے کے درختوں میں جیسی وہ ایک پرانی دمنج کی سفید کوٹھی ہے۔ اس کی دیواریں کانٹے سے سبز ہو چکی ہیں اور روشن دالوں اور کھڑکیوں میں کئی جگہ پریشیوں کی جگہ ٹین کے کنستریٹ ٹکڑے اور رقتیاں لگی ہیں۔ سائے کے برآمدے میں ایک سرے پر باتھا کی مضبوط چٹائیاں کھڑی کر کے ایک کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ کمرے کے دروازے پر نیلے رنگ کی ادھی ساری کاپردہ۔ ٹنگا ہے۔ اندر ایک بیچ، ایک میز اور طبی معائنے کا ادنیٰ سا بلنگ بچھا ہے، جس کے گدے کا نیلا چمڑا جگہ جگہ سے ادھر لگایا ہے۔ دواؤں کی الماریاں اور نام جینی کی چلمی کا اسٹینڈ ایک دیوار کے برابر لگا ہوا ہے۔ میز کے پیچھے بڑا کیسلنڈر آویزاں ہے۔

برآمدے اور کٹنا دہ دیوار کمرے کے سرخ روغنی فرش باافراط پانی سے دھوئے جانے کی وجہ سے صاف ستھرے اور چمکیلے ہیں۔ برآمدے میں ایک بیچ اور دو تین موٹے پڑے ہیں اور دو ساٹھ لکھن کھڑی ہیں۔ برآمدے میں سے اندر "بیٹھک خانہ" صاف دکھلائی دینا ہے۔ اس میں مید کا ایک صوف اور چند بے جوڑ کرسیاں رکھی ہیں۔ کونے کی ایک میز پر کامنی غلاف سے ڈھکا ہارمونیم اور دیوار کے سہارے ایک ایسراج بھی موجود ہے۔ بیٹھک کی دیواروں پر آئینے سامنے ایک مرد اور ایک عورت کے دو بڑے پورٹریٹ آویزاں ہیں۔ ان پر ایسی دھندلی دھندلی سی کیفیت طاری ہے، جو کسی بڑا سرد نامعلوم کیمسٹری کے ذریعے ان لوگوں کی تصویروں پر آپ سے آپ چھا جاتی ہے، جو مریچکے ہیں۔ عورت نوجوان اور دلکش، ریشمی ساری سے سر ڈھانپنے اور ایک اٹلی اپنی ٹھوڑی پر رکھے خاصی خوبصورت آنکھوں سے کبیرے کو دیکھ رہی ہے۔ دوسری تصویر میں سنیدنتال لپیٹے ایک خوش شکل نوجوان سر جھکائے غور سے ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا ہے۔

رنگ دری پر کتبوں اور کابیوں کا ڈھیر۔

پچھلے برآمدے کے ایک سرے پر رسوئی گھر اور دوسرے پر گودام ہے، جس کے دروازے جس بھاری تالا پڑا ہے۔ غسلخانے برآمدے سے باہر آنگن میں ایک قطار میں بنے ہیں جن تک پہنچنے کے لئے ایک چوٹی نختے پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ غسلخانوں کے برابر میں سے زمین کو مٹی کی چھت پر بنے سرے اور زمین کے سائبان کی طرف جاتا ہے۔ سرسبز آنگن کے وسط میں تالاب جس میں روٹھو پھلیاں پللی ہیں۔ تالاب کے سامنے تنسی کا منقش گملا اور دو ایک گوشے میں آم کے گھنے درخت کے نیچے جھلیوں والی بند گاڑی کھڑی ہے۔ جس کی کھڑکیوں میں چڑھلیوں نے گھونسلے بنائے ہیں۔ لگن کے تین طرف سڑخ اینٹوں کی دیوار ہے۔ ڈیوڑھی کے چوڑے دروازے کے باہر اونچی پچی گھاس میں سے گزرتی ایک پگڈنڈی آگے جا کر پھوٹے کی سمنان سروٹک سے جالٹی ہے۔ ان میں کپڑوں کی خالی انگنی پر کڑے ان بیٹھے ہیں۔

فہارٹ ابھی برس کر کھلی ہے۔ کوٹھی میں بڑا سناٹا ہے۔ خالی کمرے میں بھگی ہوئی ہوا لے دروازوں میں سے گزرتی منڈلاتی پھر رہی ہے۔ ایک غسلخانے میں سے پانی گرنے کی آواز آرہی اور پھاٹک کے باہر ایک کھارا کڑوں میں ٹھاٹھ پی رہا ہے۔ جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں اس کی ہکی روشنی کبھی کبھی نیزی سے چمک اٹھتی ہے پھاٹک کے ایک ستون پر جو برسہا برس کی بازوئی دچھاڑ سے ترچھا ہو کر ایک طرف کو دھنس سا گیا ہے۔ ”ڈاکٹر بنوئے چند رسکار ایم بی۔ بی۔“ کا بورڈ لگا ہے۔ دوسرے ستون پر سنگ مرمر کے ٹکڑے پر رنگالی میں ”چندر کینج“ نقش ہے۔ اندر مطب کی دیوار پر لگے چرخہ کاتے گاندھی جی اور منہم جوان سال نمر کی بھدی رنگین رول والے کیلنڈر کے وزن بوڑھی گنگا پر سے آتی ہوئی اس ہگی ہوا میں آہستہ آہستہ چھٹیٹا ہے ہیں۔

اس روز، دسمبر ۱۹۵۷ء کی اس تاریک شام، جب سارا گھر سمنان بڑا تھا۔ چند رکنج کے برآمدے والے گودام میں جو رہی ہو گئی۔
سیندر گانے والی، اس گھر کی انیس سالہ بیٹی دیپالی تھی۔

ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار مطب بند کر کے حسب معمول ہوا خوری کے لئے باہر جا چکے تھے۔ ان کے تینوں لڑکے کھوکھو، شو تو اور ٹونو ابھی فٹ بال کے میدان سے نہیں لوٹے تھے اور عسائی نے میں پانی گرنے کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر سرکار کی بیوہ ہیں بھوتارنی دیہی اشنان کے چند منٹ بعد پوجا میں مصروف ہونے والی ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر سرکار کی اکلوتی لڑکی دیپالی لالیٹن ہاتھ میں لٹے زینے سے نیچے باغ میں اترتی، اُس کے دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اور وہ اندھیرا پڑنے تک کوٹھے والے کمرے میں جہاں بجلی کی روشنی نہیں تھی "ہوم ورک" کرتی رہی تھی۔ نیچے آکر اس نے لالیٹن تلخی لے گلے کے نیچے چھپا دی لور دے پاؤں برآمد کی میٹر میاں چڑھ کر اپنے کمرے میں گئی جو میٹھک خانے کے بائیں جانب تھا۔ دروازے کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ اس کی بیوہ بھی بھوتارنی دیہی غسل خانے سے نکل کر کھڑاڑ پینے کھٹ کھٹ کرتی چوبلی بل پر سے گزر کے اپنے کمرے کی طرف جا رہی ہیں۔

دیپالی دم سادھے کوٹھے کے نیچے کھڑی رہی اور چند منٹ بعد بیچوں کے بل چلتی بھوتارنی دیہی کے کمرے میں گئی جو سیتل پائی پڑتی پاتی میٹر گر لو بان سلگانے کے بعد آنکھیں بند کر کے دنیا دہا سے بے خبر ہو چکی تھیں۔ ان کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ دیپالی نے چند لمحوں کی پچھلا ہٹ کے بعد آگے بڑھ کر کنبیوں کا موٹا گچھا ان کی پشت پر پڑے تو سے کھولا اور باہر آگئی۔ تلخی کے نیچے سے لالیٹن لال کر گودام تک پہنچی اور ڈرتے ڈرتے نالا کھولا۔ اندر جا کر لالیٹن ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر رکھ دی اور چاروں طرف دیکھا۔ گودام میں شدت کا جیس اور سیلن تھی۔ آنکھ کے رخ والی مقفل کھڑکی کے شیشوں پر امرت بازار تریکا کے پیسے کاغذ چپکے ہوئے تھے۔ متعرق فالتو مسلمان کے علاوہ کوٹھری میں ایک بہت بڑا چوبلی صندوق اینٹوں کے اوپر رکھا تھا۔ اس صندوق میں بنارسی اور بالوچر بوٹے دارساریاں اور دوسرا قیمتی سامان مقفل تھا۔ برسوں جاڑوں میں بھوتارنی دیہی صندوق کھول کر بڑے اہتمام سے بالوچر ساریاں باہر نکالیں اور آنگلی میں چارپائیوں پر پھیلا کر ان کو دھوپ میں سُکھایا جاتا۔ اس کے بعد یہ بالوچر ساریاں پھونم کے پتوں کی تہ دے کر اسما احتیاط سے لکس میں واپس رکھ دی جاتیں۔

دیپالی نے سانس روک کر صندوق کا نالا کھولا۔ اس کے کپڑوں پر کچی کٹھیری شال سرکار تہ میں سے ساریاں نکالیں اور ان کو جلدی جلدی فرش پر رکھی گئی۔ بنارسی اور جاہلانگی کی ساریاں ایک طرف

کر کے اس نے ”باؤچر بوٹے دار“ ساریاں علیحدہ کیں جو خدا میں نہیں تھیں۔ باؤچر کی آواز پر کان لگاتے ہوئے اس نے لائین کی لواؤچی کر کے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔ ساریاں سید پرانی ہونے کے باوجود بالکل نئی معلوم ہو رہی تھیں جیسے ابھی ابھی نوابی کے مرشد آباد کے گڑھوں سے اتری ہوں۔ موقع کی نزاکت کے باوجود وہ ان کے آنچلوں پر بسنے نقش و نگار کو دیکھنے میں محو ہو گئی۔ کاستی، نارنجی، فیروزہ۔ کاستی ساری سب سے بیش قیمت تھی۔ اس کے آنچل پر ایک قطار میں مرشد آباد کے نواب بچوان نوشن گر رہے تھے۔ نارنجی ساری کے پلوپر ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ناؤ میں بیٹھے تھے۔ فیروزہ ساری کے آنچل پر منخل سیگمات ہاتھی کے ہودے پر بیٹھی گلاب کا پھول سونگھتے میں معروف تھیں۔ وقت لیشم کے اس نائے بانے میں الجھ کر خم چکا تھا۔

اچانک برآمدے میں آہٹ ہوئی۔ دیپالی نے پھرتی سے تیزوں ساریاں سفید مہل کے کھڑے میں بیٹیں۔ باقی سلمان صندوق میں واپس رکھا۔ اور سہم کر دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہوئی۔ مگر اب پھر ناموشی چھا چکی تھی۔ صحن میں کیلے اور سینا چھل کی ڈالیاں سرسرا رہی تھیں۔ بہت دور سڑک پر ایک ٹھوڑا گاڑی کھڑ کھڑاتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس گھپ اندھیرے میں نجانے کہاں جا رہی تھی۔

دیپالی نے لمبا سانس لیا اور ساریوں کا بندل اپنے آنچل میں چھپا کر باہر نکلی۔ گودام میں تالا ٹایا۔ بندل برآمدے کی سیڑھیوں پر ڈال دیا اور بھوتارنی دیہی کے کمرے میں جا کر نہایت صفائی سے کنبیاں ان کے پتوں میں باندھ دیں۔ بھوتارنی دیہی چڑچڑی اور تنک مزاج ہونے کے علاوہ جیوں کے معاملے میں حد سے زیادہ سخت گیر اور محتاط تھیں۔ وہ ڈولی تنگ کا تالا صرف اپنے تھ سے کھوتی تھیں۔ کنبیاں ان کے پتوں میں باندھنے کے بعد دیپالی نے پوری طرح آنکھیں کھول رہی تھیں کی مورنی کو دیکھا اور دروازے سے نکلی۔ سیڑھیوں پر سے بندل اٹھا کر آنگن میں سے ماگتی ڈیوڑھی سے تیر کی طرح نکل کے پھلی سڑک پر پہنچ گئی۔ پھاٹک پر بیٹھا کہاں جا رہا ہے ختم کر کے کہیں اسیب ہو چکا تھا۔ دیپالی نے چاروں طرف دیکھا اور چند قدم آگے بڑھی۔ سڑک کی پیلے کے نزدیک نوجوان سائیکل سنبھالے کھڑے نیازی سے آسمان کو تنک رہا تھا۔ دیپالی کو دیکھ کر اس نے تھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔

دیپالی دوڑ کر اس کے قریب پہنچی اور اچک کر سائیکل کے پیچھے کبر پر بیٹھ گئی۔

نواب پورے کی ایک گلی کے سرے پر ایک قدیم مکان کی بیچک میں چند نوجوان فرش پر بیٹھے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن میں سے ایک نے نظر اٹھا کر دیکھا دیسیاں سرکار سامنے کھڑی تھی۔ اس نے جھک کر بندل نوجوانوں کے سامنے رکھ دیا۔ ایسا نوجوان نے بندل کھولا۔

”دادا۔ اس سے زیادہ قیمتی چیز میرے گھر میں نہیں ہے۔“

اس نوجوان نے جسے دیسیاں نے مخاطب کہا تھا۔ ساریاں اٹھی بلیٹیں۔ ”باؤچر ساریاں“ اُس کے منہ سے نکلا۔ اس نوجوان نے اپنے شانوں پر زلفیں چھٹکارا کھی تھیں۔

”باؤچر۔!“ دوسرے نوجوانوں نے حیرت اور اشتیاق سے ساریوں پر ہاتھ پھیرا۔

”مگر جھائی ان کو خریدے گا کون۔؟ یہیں تو فوراً چھ سو روپے چاہئیں۔“

”بیار سو تک میں نہیں بک جائیں گی؟“ دیسیاں نے منتظر ہو کر پوچھا۔

”باؤچر ساریاں؟ آج کل دیسیاں اپر کلاس لیڈ میزا لگ رہی جا رہی ہے۔“

”مگر یہ۔۔۔ یہ تو بے مثالی چیز ہے اور نایاب۔“ دوسرے نوجوان نے کہا۔

”ہندوستان کا بیشتر پرانا فن نایاب اور بے مثال ہے۔ پہلے نے چڑھ کر جواب دیا۔“ اس سے

لیا فرق پڑتا ہے۔“ پھر وہ دیسیاں سے مخاطب ہوا۔ ”تمہارے پاس اور کچھ نہیں؟“

”دیسیاں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”دفعاً اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔“ ان کو بچنے یا گروا رکھنے کی

وشش تو کیجئے اکتے دادا۔“

زلفوں والا نوجوان گہرا سانس لے کر فرش پر سے اٹھا۔ ”اچھا۔ تھینک یو۔ دیسیاں۔ اب تم لوہیں

بھاگ جاؤ فوراً۔“ اور دفعتاً وہ تینوں نوجوان، جن میں سے تیسرا بالکل خاموش رہا تھا۔ بندل سمیت کونٹری

کے کچھلے دروازے سے نکل کر باہر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اب رات کے نوج رہے تھے اور میز پر کھانا چنا جا چکا تھا۔ بھوتارنی دیہی حسب عادت بڑ بڑاتی

ہوئی رسوئی گھر اور کھانے کے کمرے کے پھیرے کر رہی تھیں۔ کھو کھو، شو نو اور گونج سے واپس آ کر تندہی

سے کھیل پر بھرت کرنے میں مشغول تھے۔ ڈاکٹر سرکار چہل قدمی سے لوٹ آئے تھے اور اپنے کمرے میں آرام کر رہی

پر نیم دراز حسب عادت ایک پاؤں ہلانے ہوئے سوچ بچار میں مصروف تھے۔

”دیپالی۔“ انہوں نے آواز دی۔

دیپالی اپنے کمرے سے نکلی۔ ڈاکٹر سرکار آرام کرسی سے اٹھ کر بیچک خانے سے گزرتے کھانے کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ ایک بھاری جسم کے متین چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والے انسان تھے۔ ان کے چہرے کے سکون سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاموشی اور صبر کی دو سہ ماہی تازہ میں زندہ رہنا انہوں نے سیکھ لیا ہے۔

کھانے کی میز پر جا کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے دیپالی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں وہ اسی دقت اندر آرہی تھی۔ ڈاکٹر سرکار نے ذرا تعجب سے اس کا جائزہ لیا۔

”کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہے؟ اتنی گھرائی ہوئی کیوں ہو۔“

”جی نہیں۔ بابا۔ میں روزی۔ روزی کے گھر گئی تھی۔ واپس آرہی تھی تو۔ پلٹا کے پاس ایک بھینسہ مل گیا۔ اُس کے دُرسے دوڑتی دوڑتی آرہی ہوں۔“ اس نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسنا چاہا۔

”اتنی رات گئے روزی کے گھر سے اکیلی آرہی ہو؟“ ڈاکٹر سرکار نے ذرا درشتی سے اُسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

”جی۔ جی نہیں۔ جو ترف ساتھ آیا تھا۔“ وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کے تینوں چھوٹے بھائی شور مچاتے ہوئے کھانا کھانے میں جُٹ چکے تھے۔

”ایک خوش خبری تمہارے لئے۔“ کھانے کے دوران میں ڈاکٹر سرکار نے دیپالی سے کہا۔

وہ دھک سے رہ گئی۔ ”کیسی خوش خبری۔ بابا؟“

”اشیت بابو۔“ ڈاکٹر سرکار نے کرسی پیچھے سرکا کے جواب دیا۔ ”میں ابھی اشیت بابو کے

ہاں گیا تھا۔ وہاں ان کے بہنوئی آئے ہوئے ہیں۔“

”کلکتے والے؟ حیوتی بابو۔؟“

”حیوتی بابو۔ وہ تمہارے ریکارڈ بھرنے چاہتے ہیں۔ ایچ۔ ایم۔ دی ریکارڈ۔“

”میرے ریکارڈ ایچ بابا۔ سچ بتائیے۔!؟“

تینوں لڑکوں نے کھانا چھوڑ کر عمل میں ناشرورع کر دیا۔

”دیدہ کے ریکارڈ میں گئے۔ گھر گھر دیدہ کے ریکارڈ میں گئے۔ کچھ کچھ زنگیہ سے اعلان کیا۔
”دیدہ امیر ہو جائے گی۔“ منجھلا شو تو زور سے چلایا۔

”دیدہ ہم کو پیسے دے گی۔“ ٹونو نے سر جھکا کر نرمی سے کہا۔

”پہلے سائٹس ماسٹر شینل بابو کی بڑی دیدہ کے ریکارڈ سارے انڈیا میں بکتے ہیں۔ وہ اتنی
امیر ہو گی ہیں۔ اُن کے پاس تو موٹر بھی ہے۔ شو تو بولا۔“

”دیدہ ریڈیو سے جتنے پیسے ملتے ہیں لا کر تم لوگوں پر خرچ کر دیتی ہے۔“ کھوکھو نے ڈانٹ بنائی۔

”دیدہ اتنے پیسے کیا کرے گی؟“ سب سے چھوٹے ٹونو نے جو سب سے لاڈلا تھا ملاحظہ کیا۔

”اپنا جہیز بنائے گی، اور کیا تمہارا سر کرے گی۔“ بھوتارنی دیہی نے جواب تک تیوری پر بل

ڈالے چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول تھیں، گرج کر کہا۔

دیپاتی ذرا سی سرخ ہو گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ اس سارے ہنگامے میں وہ شام کی

مہم کو تقریباً بھول چکی تھی۔ وہ میز پر سے اٹھنے لگی تو ڈاکٹر سرکار نے اس سے کہا۔ ”جیوتی بابو۔“

انہوں نے تم سے کل ریڈیو اسٹیشن پر ملنے کو کہا ہے۔ تم کو ریکارڈنگ کے لئے ملکتے جانا ہو گا۔ تم ریڈیو

اسٹیشن کل کس وقت جاؤ گی؟“

”صبح کو بابا۔ دس بجے۔“

”کالج پھر ناغہ۔؟“

”بابا۔ اب تو چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ اور رات کے اب ہڑمچانے یا تھہ دھونے کیلئے

باہر جا چکے تھے۔ بھوتارنی دیہی چپ چاپ برتن میٹھنے میں مصروف تھیں) بابا۔ پروگرام کے پیسے جمع کر

کے پتوں کے کپڑے بنا دیئے تھے۔“ وہ ٹھٹھک گئی۔ ”بابا۔ میری ساریاں بھی بالکل بھٹنے والی ہو رہی

ہیں۔“ اس نے جھینپ کر بات ختم کی۔

ڈاکٹر سرکار نے سر جھکا لیا۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔ اور گودام کے نزدیک والے

نل کے پاس کھڑے ہو کر کلا کرنے لگے۔ دیپاتی چیکے چیکے پیچھے آئی اور گودام کے بند کواڑوں کو نور سے

دیکھا جن میں لگا لوہے کا وزنی تالا بجد ساکت اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

طوفان سے پہلے

”ابانی گنگو پادھیائے۔“

”پریڈنٹ۔“

”مولینا گھوشال۔“

”پریڈنٹ۔“

”روزی بنرجی۔“

”پریڈنٹ۔“

”جہاں آراچودھری“

”پریڈنٹ!“

”دیپالی سرکار“

”ایبسنٹ۔“

سوکس (civics) کی لیکچرر مسز بوس نے سیکنڈ ایر آرٹس کی حاضری لیتے ہوئے روزی بنرجی اور جہاں آراچودھری کے برابر والی تیسری خالی کرسی پر نظر ڈالی۔

”دیپالی پھر غائب ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”دیکھئے کرونا دی۔“ جہاں آرا نے پتو منہ پر رکھ کر کڑھی کھی کرتے ہوئے مسرور سنسی چھپانے کی کوشش کی۔

”دیپالی بیجا رہے۔“

”تم کو کیسے معلوم۔؟ تم تو اس کے گھر سے اتنی دور رہتی ہو۔؟“

”وہ کل۔۔ میرا مطلب ہے، کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ بیجا پڑ گئی ہے بے چاری۔“

”لڑکیو۔۔“ مسز بوس نے کلاس کو بڑے دکھ سے مخاطب کیا: ”فائنل امتحان سہ ماہی میں اور“

تم سب کی سب ہوگی فیمل۔ اور روزی۔

”ایس کردنادی۔“

”تم دونوں۔ تم اور دیپالی ہر وقت ڈرامے کرنے میں مجھی رہتی ہو۔ ہر وقت۔ ایک ٹیس ہوگی؟“

”کھی کھی کھی۔۔۔ روزی اور جہاں آرانے ہنسی روکی۔“

”کہہ دوں۔؟“ روزی نے چپکے سے جہاں آرا سے پوچھا۔

”کہہ دو۔“

”کردنادی۔ دیکھئے کردنادی۔ اصل میں دیپالی کلکتے جا رہی ہے۔ ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ بھر جانے

”ایچ۔ ایم۔ وی ریکارڈ۔“ ساری کلاس نے خرہ لگایا۔

”آج وہ گراموفون کمپنی کے ڈائریکٹر سے ملنے جا رہی تھی تو راستے میں میرے گھر پر چھٹی کی عینی

چھوڑ گئی۔“ روزی نے کہا۔

”کہاں بے عرضی۔؟“

”بھول آئی کردنادی۔ کھی کھی کھی۔“

مسز بوس ایک بینک دل اور شریف خاتون تھیں۔ انہوں نے ذرا جھلا کر روزی کو گھورا

اور باقیانہ کلاس کی ماضی لگانے کے بعد فوراً اپنا کلاس روم والا بے رنگ لہجہ اختیار کر کے سامنے

دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مغرب ۲۱۸ کھولو۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء۔“

”ادہ۔ سو۔ سو۔ اوہ۔۔۔ دیپالی کی خوشی میں کردنادی۔ آج جلدی چھٹی پلینز۔ پلینز۔ پلینز۔“

”جاؤ۔ جاگو۔ منہ جل چیرھیں۔“ آدھ گھنٹہ پڑھانے کے بعد مسز بوس نے مصنوعی عینے کے ساتھ

کتاب زور سے بند کی روکیاں بھلا بھلا کرتی کرے سے نکل کر باہر گھاس پر بکھریں۔

روزی اور جہاں آرا نے ٹلک شباب پر جا کر چاٹ خریدی۔

”ابانی نے قریب آکر چپکے سے روزی سے کہا۔“ چائٹ پر کوئی روکا دیپالی کو پوچھ رہا ہے۔“

”وہی۔؟“

”ہاں۔“

”میں جاتی ہوں۔“

روزہ بھاگتی ہوئی دوڑ چھاٹک پہنچی۔ نوجوان جوکل شام دیپالی کو سائیکل پر بھا
نواب پور لے گیا تھا، اطمینان سے درخت کی آڑ میں کھڑا پان چار با تھا۔ قریب ہی ایک گائے
س پر کھیرے چاٹ کے خالی دونوں پر منہ مارنے میں مصروف تھی۔

”دیپالی نہیں آئی ہے۔ کوئی پیغام؟“

”یاں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”اس سے کہتا ۱۹ تاریخ کی شام کو ریڈیو اسٹیشن کی برساتی
ٹھیک سات بجے ضرور پہنچ جائے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ جس کام کے لئے کل گئی تھی وہ امید
ایک دو دن میں ہو جائے گا۔“

”اور کچھ؟“

”بس۔ نو مشکار۔“ لڑکا سائیکل کے پیڈل پر پاؤں مارتا ہوا ہوا گیا۔
روزہ جو بے حد تیزی سے دوڑتی چھاٹک پر آئی تھی، اب سر جھکائے مسوچ میں ڈوبی ملک نشا
پہنچی۔ جہاں بہت سی لڑکیاں اکٹھی ہو کر کسی نئی خبر پر زور زور سے تبصرہ کر رہی تھیں۔
”اور سنائتم نے روزہ کی۔“ سندھیانے کہا۔ ”مس ہیڈ کے آج کہہ رہی تھیں کہ مس اومارے
م سے واپس آگئی ہیں اور شاید پھر یہاں پڑھانا شروع کر دیں۔“
”مارے گئے۔ دیدی کو انہوں نے پڑھایا تھا۔ دیدی کہتی ہیں کہ بس جان نکال لیتی تھیں۔“
ق نے کہا۔

”ہاں تو بھیا مزے ہیں۔ ہم تو انٹر کے بعد گھر بیٹھ جائیں گے۔ ابانے حکم دے دیا ہے!“
آرانے کیا۔ ”تم لوگ اپنے مرقی رہو۔“

”بترا تو۔ اس کا جہاں آرا کا نوکسی ڈھیل مولوی سے بیاہ ہو گا۔ جناب مولوی بے نو
ربین احمد صاحب۔“ مولیٰ مسخری رو مولانے منہ چھا کر مکر ماکرتے ہوئے کہا۔ اور چنے چھاتی ہو
مدارے ہٹ بھاگ۔“

”تو خود بھاگ۔“

سہ منزلہ عمارت میں پانچویں پیرید کی کھنسی بجی۔

”چلو بھائی۔ آگیا مس گرین فیملڈ کا کھنڈہ۔ پوروزی نے منہ بنا کر کہا۔“

”وہیں وہیں ہیں۔“ رومولا منڈیٹر ہا کر کے مس گرین فیلڈ کی نقل کرتی، چنے چھانکتی آگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے پیچھے روزمی بنرجی اور جہاں آراچو دہری لڑکیوں کے غول میں شامل عمارت کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اس وقت جاڑوں کی سہانی دھوپ ہماری زندگی پر بکھری ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ ایڈ گریز کالج کی بلند عمارت پڑھائی کی سنبیدہ خاموشی میں ڈوب گئیں۔ جس طرح جہاز آہستہ گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ ان عمارتوں کے روشن مکروں کی دیواروں پر لگی برطانیہ۔ شاہی خاندان اور بنگال کے سابق گورنروں کی سینڈ انکھیں چپ چاپ سامنے کے منظر کو دیکھ رہیں۔ جہاں بھانت بھانت کے سماجی اور اقتصادی پس منظر سے آئی ہوئی، قدیم بنگال کی بیٹیاں اپنی اپنی کتابوں پر جمی حصولِ علم میں مہنک تھیں اور کون کہہ سکتا تھا کہ باہر بیکراں پرانی جنگوں کی جھنکار سے گونج رہی ہے۔ ان جنگوں میں لڑنے والے جو زبانیں بولتے تھے، وہ دی گئیں۔ وہ قومیں اور نسلیں ختم ہو چکیں۔ جن وجوہات پر اور جن مقاصد کے لئے وہ لڑا کرتے تھے۔ وہ فراموش کر دیئے گئے۔ پرانے فیصلوں پر نظر ثانی کرنے کی ہمت دنیا کو ہنہ لیکن بیکراں زندگی میں برآواز، ہر کرب اور وقت کا برعکس موجود ہے اور زندہ ہے اور دفعتاً کالج پر پھیلایا ہوا سناٹا اتنا گہرا ہو گیا کہ اُسے باسانی سنا جاسکتا تھا۔ طوفان۔

چھانے والا سناٹا

۳

وِوِڈِلِیَنڈز

رسمنا کی ایک عالیشان کوٹھی کے ایک پہلو کے کمرے کے فرانسسیسی درجے میں سے م اور نیلا آسمان نظر آسکتا تھا کیونکہ حد نظر تک ہربالی کے علاوہ وہاں کچھ اور نہیں تھا۔ اکا دکا پورا

پھولوں کے تختوں میں پیچھے چپ چاپ اپنے کام میں مصروف تھے۔ دریچے کی سیٹ پر جوئرنرنگ ب کے پھولوں والے جھلدار غلاف سے ڈھکی ہوئی تھی، ایک نوجوان خاتون عینک لگاٹے بیت کے عالم میں بیٹھی خط لکھ رہی تھیں۔ سیزران کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ دریچے کے قریب لکڑی کی رائٹنگ ٹیبل پر چھوٹے چھوٹے بیسٹوئی فریموں میں چند اور اسٹوکر ٹینک گائی تین کی تصاویر جھلملا رہی تھیں۔ مکہ جو انگریزی اصطلاح میں مارننگ روم کہلاتا تھا۔ اس کی دیواروں پر گلاب کی سبل کے نلکے گلابی اور زرد، اور کاسنی اور سبز بیڑن والی والی منڈھا تھا۔ اس طرح کا وال پیپر ایک زمانہ میں امرائے کلکتہ خاص طور پر ولایت سے منگوا کر بنے مکروں میں لگواتے تھے۔

دیواروں پر سنہری فرموں والی بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ لارڈ بائرن یونان کے ساحل تی سے اتر رہے ہیں۔ کانسٹیبل کا ایک دیہاتی منظر۔ آبرمی بیڈ روم کی مشہور سلوٹ سے مکرو اٹلڈ والی جو سیاہ کپڑوں میں ملبوس، تھالی میں دھرے یو جٹا پیغمبر کے بریدہ، سر کے بال پکڑے ہیں بھر رہی ہے۔ ایک تصویر مسٹر پیک وگ کی تھی۔

دروازوں پر اور دیوچوں میں موٹی ریشمی ڈوریوں سے بندھے پھندہ لڑنے والے دیویشمی پردے لگے تھے۔ آئینہ دان پر ڈریڈن چائنا کی چرواہی بیٹھی تھی۔ اس کمرے کا اور سائے گھر کا طرز آرائش، طور پر مغربی اور دکھنری تھا۔

لیکن جو خاتون اس مارننگ روم میں موجود تھیں وہ دکھنری نہیں تھیں۔ وہ ایک جویشی باشعور اور سنجیدہ سیاسی کارکن تھیں جس بیڈ پر وہ خط لکھ رہی تھیں اس کے اوپر کے ایک کونے دو ڈیٹڈز، رمن، ڈھاکہ، گوٹھک پرنٹ میں ثبت تھا۔ مگر مکتوب ایہ لندن اسکول آف لٹس کا ایک برطانوی یہودی، کیونست پر وفسیر تھا۔

خط لکھتے لکھتے دفعتاً انہوں نے غصے سے توڑ ٹوڑ کر اسے دور پھینک دیا۔ فری سیزران۔ ذرا سے اٹھ کر اخلاقاً اس کی طرف لپکا۔ لیکن خاتون اسی طرح دل گرفتہ اور صہجھلائی ہوئی بیٹھی رہیں۔ لہذا کو بیاہ گیا تھا کہ یہ خط سارا کا سارا اسنسر کی نذر ہو جائے گا

چند منٹ بعد سہا تھوں میں لے کر وہ دریچے سے باہر دیکھنے لگیں اور بیچہ کرب سے انہوں نے

سوچا۔ اب مجھ پر دورہ پڑنے والا ہے۔ انہوں نے مینک انار کر آ نکھیں زور سے میچ لیں۔ اور اسی طرز
ساکت سٹیجی رہیں۔ اب وہ دانے گیمبریل روز بیٹیا کی دامتوزیل معلوم ہو سکتی تھیں۔

جب بیرسٹری تو شکار رائے نے اپنی ویسٹ ویز کو طلی کانام ”وڈ بیٹرز“ رکھا تو وہ آس
رواج کی تقلید کر رہے تھے۔ جس کے تحت ہندوستان کا نیا مغربی تعلیم یافتہ ادب ہی طبقہ تقریباً سو برس سے
اپنی کوٹھیوں کے انگریزی نام رکھنے میں مصروف تھا۔ ہمارا کوچ بہار کے کلکتے والے محل کانام بھی وڈ بیٹرز
تھا۔ مگر بیرسٹرائے کو یہ نام اس قدر پسند تھا کہ انہوں نے اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔
بیرسٹرائے برہمنو تھے۔ بنگال کے رائے اور ٹھاکر خاندان چودہری پر یواروں کی مانند زمیندار تھے
اور مذہبی لحاظ سے قدامت پسند ہندو۔ زیادہ تر دت، سیٹھ اور گپتا۔ غیر برہمن جاتیاں برہمنو ہو چکی تھیں۔
لیکن بیرسٹرائے کے دادا کیشپ چندر سین کے چیلے بن گئے تھے اور ان کا خاندان اب تقریباً پون صدی
سے برہمنو اور آزاد خیال تھا۔ بیرسٹرائے کی والدہ اور پھوپھیوں تک نے اسکول اور کالج میں پڑھا تھا۔
بیرسٹرائے کی بیوی مشہور ”سوشل فلر“ تھیں۔ اُن کا بڑا بڑا کانز ملینڈو، برڈ اینڈ مکنی مملکت میں اعلیٰ ایکریٹ
اور ”کنفرٹ بیلر“ تھا۔ اور زیادہ وقت ریس کورس پر اور شراب نوشی میں گزارتا تھا۔ بیرسٹرائے کو نکرتھی
کہ ان کی لڑکی بھی کہیں کنفرٹ اسپنسر بن جائے۔ آنا یہی نظر آتے تھے۔ مگر اس صورت حال کا مداوا
کے پاس نہیں تھا۔ اُن کے باپ کی نسل نے بچپن کی شادی اور دوسری سماجی خرابیوں کے خلاف جہاد
کیا تھا۔ اور آزادی نسوان کا پرچار کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے تھے۔ اور اب اوما اُن کی لڑکی
اٹھائیس سال کی ہونے کو آئی تھی اور شادی سے منکر تھی۔ اور وہ اور ان کی بیوی اوما کی خلاف ورزی
شادی پر مجبور نہ کر سکتے تھے۔ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے۔ بیرسٹرائے اکثر دکھ سے سوچ
ہماری ان ”بانیر“ خواتین کا جن میں اوما بھی شامل ہے، کیا انجام ہوگا؟ بنا بنگال سو برس سے ایک ترقی
یافتہ سماج ہے، مگر پرانی اور نئی اقدار کی اس آپریشن کی زد خود اپنی زندگی پر پڑے تو کیا کرنا چاہئے؟
اوما کی شکل بہت معمولی تھی۔ باپ کی دولت و ثروت کی وجہ سے اچھے رشتے اس کے لئے آ
سکتے تھے۔ لیکن وہ ریاست کے چکر میں مبتلا تھی۔ اوما یہی ایک گول مٹول چیرے والی گد بدی سی

رہا تھی خلیقی اور متواضع۔ گھیر اور تیز بین۔ لیکن اسے منصفہ بہت جلد آجاتا تھا۔ اور ماں باپ سمیت کوئی بھی اس کی خلاف مرضی کوئی بات اس سے کہتا تو وہ فوراً آگ بگولہ ہو جاتی تھی۔ میری بیٹی اپنی زندگی میں ایک ”بیک پنچر“ کبھی نہیں بنے گی۔ پیرسٹر رائے اکثر سوچنے اور مزید فکر مند ہونے لہتے۔ ڈھاکہ کی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد اس نے کچھ عرصہ گورنرز اسکول میں پڑھایا تھا اور اسی زمانے میں صوبے کی کینوسٹریٹک میں شامل ہو گئی تھی۔ پھر پیرسٹر رائے نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیا تھا۔ وہاں کرشنا میمن کی انڈیا لیگ اور جی پام دت کی برطانوی کینوسٹریٹک پارٹی کی وجہ سے گڑوا کر بلائیم چڑھ چکا تھا۔ لندن اسکول آف اکنامکس سے ڈگری حاصل کر کے آتا چند روز قبل ہی ڈھاکہ واپس آئی تھی اور پیرسٹر رائے کی ملاقات ایک تدریجی اور جی پام دت سے ہوئی تھی۔ پیرسٹر رائے کی گفت بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ اب تک انہوں نے ایک ”مغربی ذہن پرست رویہ“ سمجھ کر آتما کے سیاسی مشاغل پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ بیٹی کی محبت کے علاوہ وہ خود چالیس برس قبل کے انگلستان سے لبرل ازم کا سبق یاد رکھ کر آئے تھے (زندگی میں کتنے بہت سے رویے ایسے میں گڈ ریڈ رہتے ہیں) مگر اب حالات بے حد مختلف تھے۔ جنگ چھوڑ چکی تھی اور ہندوستانی کینوسٹریٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ پیرسٹر رائے کے سارے اور آتما کے ماموں دھرم سندر موہن سین ڈی۔ آئی جی پولس نے کئی بار اپنی سین اور ہینوٹی کو سمجھایا تھا کہ لڑکی کو قابو میں رکھیں۔ مسز رائے عرصہ ہوا قیصر ہند کا تمغہ حاصل کر چکی تھیں! اور پیرسٹر رائے کو سر کا خطاب ملا چاہتا تھا۔ عنقریب لائی کورٹ حج بننے۔ والے تھے۔

آتما کی سرگرمیاں اب ذہنی تفریح کی حدود سے آگے بڑھ کر طبی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھیں۔

آتما رائے نے مورنگ روم کے درجے کی سفید چوٹھ پر سے سر اٹھا کر زور سے کپٹیاں دباہیں اور دوبارہ عینک لگا کر باہر جھانکا۔ دو کاسٹیل آپس میں باتیں کرتے ٹھاس پر سے گزر کر سامنے رسائی کی سمیت حاد سے تھے۔ آتما اور رسائی کے درمیان سے

پہنچی تھیں۔ اُن کے ساموں دھرتی درمیان سین ڈی آئی۔ جی پولس، بھانجی کے سواگت کے لئے شمالی بنگال سے دو ڈولینڈز ڈھا کر آئے ہوئے تھے۔ اور اُن کے محلے کے کانٹیل اور پولس اسپیکٹور ڈولینڈز کے احاطے میں ہر طرف پٹختے پھر رہے تھے۔

ابھی ڈائینگ روم میں لیچ کا سر بلا کھنٹہ بچے گا۔ ماں اور بابا اور ماما کھانے کی طویل میز پر سیدنا لنگی سے آکر بیٹھیں گے اور کھڑکھڑاتے۔ سفید نیپکن کھولتے ہوئے اس سے بچی سفر کے حالات دریافت کریں گے۔ جنگ چھڑنے کے بعد اوما کے خیریت وطن واپس آجانے کی سزا کنبے میں خوشیاں منائی جائیں گی۔ اوما آدھے سر کے درد کی مریض تھیں۔ لندن جانے سے قبل اکثر ڈیوٹی جب درد سر کا دورہ پڑتا تھا تو وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے رائے خاندان کے کارڈن ہاؤس چلی جاتی تھیں۔ جو دریائے میگھنا کے ایک خوبصورت جزیرے پر پلاش کے درختوں میں چھپا کھڑا تھا۔ آج صبح بریک فاسٹ کی میز پر ماسوں نے ان کی مضمحل صورت دیکھ کر تجویز کیا تھا کہ وہ سفر کی تھکان دور کرنے کے لئے چند روز کو کارڈن ہاؤس چلی جائیں، لیکن خود ادمارائے کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت سخت بیمار پڑنے والی ہیں اور بہت سی متوجہ اور غیر متوجہ مصیبتوں، کلفتوں اور پریشانیوں کا انھیں بہت جلد سامنا کرنا ہے۔ سفید کشمیری شمال کندھوں سے اچھی طرح لپیٹ کر وہ دنڈو سیٹ پر سے اٹھیں اور آہستہ آہستہ قدم رکھتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

جو ارجھا ٹاگا گیت

ڈھا کر کے ایک مسلمان رئیس کی دو منزلہ کوٹھی کرائے پر لے کر حکومت نے حال ہی میں اس میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا۔ یہ کوٹھی بھی ڈھا کر کے کی ساری عمارتوں کی طرح قدیم، دقیانوسی اور ماضی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جب دیہاتی نے ریڈیو پر گانا شروع کیا۔ ڈاکٹر سرکار بڑی باقاعدگی سے اس کے ساتھ آتے تھے اور چھڑی کی موٹھ پر ہاتھ دھرے برآمدے کی ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھے

رہتے تھے۔ لیکن تین چار بار آنے کے بعد وہ آگتا گئے تھے۔ مطب کے حرج کی پرواہ انہیں نہیں تھی۔ مگر انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ریڈیو اسٹیشن غیر اخلاقی نئے نہیں ہے۔ کلکتہ شہر میں بڑی آزادی تھی۔ لیکن فیوڈل ڈھاکا ابھی سید قدامت پسند اور سہانہ تھا۔ اور خود ڈاکٹر مسٹر کار غفار کاؤنسلر میمن سنگھ کے جس مفلوک الحال زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس میں لڑکیوں کا تنہا گھر سے باہر نکلنا بہت محبوب سمجھا جاتا تھا۔ مگر اب دیپالی کی ریڈیو اسٹیشن آتی تھی یا کبھی کبھار کھوکھو اس کے ساتھ آجاتا تھا۔ وہ عباس الدین احمد کی شاگردی میں مشرقی بنگال اور بالخصوص میمن سنگھ کی لوک سنگیت کی ماہر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نغمہ پر پروگرام بھی مقبول ہو چکے تھے۔

۱۹ دسمبر کی شام، وہ اپنا پروگرام ختم کر کے اسٹوڈیو سے نکل رہی تھی کہ برابر کے ایک دروازے پر ڈاکٹر مسٹر کار کے پرانے دوست اور شائقِ نغمتوں کے پروفیسر، ماہر لسانیات سید مرتضیٰ حسین اس سے ٹکرا گئے۔ انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر اور چھڑی اٹھا کے گویا ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے بابا کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں کالا!“ وہ تیزی سے پھر آگے بڑھی۔ لیکن سید مرتضیٰ حسین اس کے پیچھے لپکے۔

”اور سنو لڑکی، تم نے ہمارے ہاں آنے کے متعلق کیا فیصلہ کیا؟“ سید مرتضیٰ حسین نے چھڑی

ہوا میں لہرائی۔ دیپالی نے غیر یقینی انداز میں سر ہلا دیا۔ اور گیلری کے سرے پر آدیں کلاک پر نظر ڈالی تینا کے سات بج رہے تھے۔ اب وہ دونوں صدر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ چاروں طرف ایک تارا اور ایسراج اٹھائے فن کاروں اور ریڈیو کے اراکین کی آمد و رفت جا رہی تھی۔

پروفیسر سید مرتضیٰ حسین جو ہندو تنان اور یورپ کی قدیم و جدید نہیں بچھیں زبانوں کے ماہر

تھے۔ برآمدے میں پہنچ کر ٹھٹھک گئے۔ ”بیوقوفوں کی طرح سر کیوں ہلا رہی ہو؟“ انھوں نے درستی سے مطالبہ کیا۔

اندر عباس الدین احمد نے کانا شروع کر دیا تھا اور ان کی خوبصورت جان لیوا آواز پدما کی

لہروں کی طرح سارے میں پھیلتی جا رہی تھی۔ پدما کے ہانجھی کا گیت۔ جو ابھی ٹانگہ۔ عباس الدین احمد کی اس سنگیت۔ بھٹیائی۔

دیپالی نے برآمدے کے ایک در سے ٹپک کر پل کی پل کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

”تم خوش قسمت ہو دیپالی کہ تم کو عباس الدین احمد کی شاگردی میسر ہے۔ زندگی کا یہ طرہ عقیمت جاؤ۔“

دور پیدما کی تاریک چڑسکون لہروں پر سے بہتی سید مرتضیٰ حسین کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ یہ میرا دلیس، یہ بد ما اور میگھنا اور برہم پتھر۔ یہ سنگیت۔ یہ جوان کلامار۔ یہ سب اسی طرح رہے گا۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تاریک راتوں میں اہم سازشیں ہو رہی ہیں۔ پروفیسر مرتضیٰ حسین کو جس شاید پوری طرح مطمئن ہیں کہ ہم کیا کرتے والے ہیں! وہ خود اور ہم سب کہاں ہیں۔ اس کی ہمت دوبارہ عود کر آئی اور اس نے ذرا ابتلاشت سے کہا۔ ”گالاب قرعہ میں ڈانٹے نرو۔ یا۔“

”کیا بات ہے۔ اتنی جلدی میں کیوں ہو۔“ پروفیسر نے دریافت کیا۔ اور اسے بڑے طور سے دیکھا۔ ”کبھی ایسا موقع زندگیاں میں آئے دینا کہ بعد میں پچھتاؤ کہ تم نے اپنے خواب کیوں تو پورے ہونے دیئے۔“ انہوں نے باہر نظر ڈالی۔ ”وہ دکھو تم کو کوئی بلانا ہے شاید۔ جاؤ۔ بھاگو۔“ اتنا کہہ کر وہ چھپا ک سے برابر کے کمرے میں گھس گئے۔

دیپالی سرعت سے برساتی میں اُتری۔ بیخامبر نوجوان نیم تاریک لان پر مزے سے ٹھیل رہا تھا اُسے دیکھ کر وہ سرٹک پر آگیا۔ وہ دونوں عمارت کے پھاٹک سے نکل کر باہر برٹک پر پہنچے۔ نوجوان نے کرنے کی جیب سے ایک لمبا، موٹا لٹافہ نکال کر اُسے نکال دیا۔ ”ریحان دوا۔ ریحان دانے کہا ہے یہ خط دیپالی سرکار کے ذریعے ہماری ادمارائے کو پہنچا دیا جائے۔ جلد از جلد۔“

”ادمارائے۔“ پروفیسر نے چیخے سے پوچھا۔ ”لیکن میں تو ان کو جانتی بھی نہیں۔“

”جان جاؤ گی۔“ نوجوان نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ سرٹک پر کچھ دور نکل آئے۔

”ادما دیدی، بیمار پڑی ہیں۔ ان کے ٹی آئی جی ماموں اُن کے یہاں مقیم ہیں۔ اس وجہ سے دو دنوں

پر پولیس کا بیہرہ ہے۔ ادما دیدی کے بیڈ روم تک دیپالی صرف ہتھیلی رسانی ہو سکتی ہے۔“ نوجوان نے

پھر بات متروک کی۔ ”چلو تم کو سریندر داس سے ملو اؤں۔ میری جگہ یہ اب تم سب سے رابطہ رکھیں گے

میں باہر سال جا رہا ہوں۔“

وہ دونوں تنگ اور نیم تاریک سرٹک پر ذرا اور اُگے بڑھے۔ ایک دیوار کے سائے میں ایک

نوجوان اُن کا منتظر تھا۔ ”بلو دیپالی۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”سریندر دوا۔“ دیپالی نے حیرت سے آنکھیں پھیلانیں۔ ”آپ کھلے خزانے گھوم رہے ہیں

کیا ساقی مانگ لی۔“ اُس نے غصے سے پوچھا۔

نوجوان ہنس پڑا۔ ”تم نے دیپاتی میرے متعلق غلط افواہ سنی تھیں میں ابھی بلیک لسٹ پر نہیں ہوں۔ تم وہی کلاسیکل ریولوشنریز (REVOLUTIONARIES) کے زمانے کی بات کرتی ہو! اب تکنیک بدل چکی ہے!“

”میکے کا کلاسیکل ریولوشنری تھے۔“ دیپاتی نے اُداسی سے کہا۔
 وہ تینوں سر جھکائے تیز تیز چلتے گھوڑا گاڑی اسپینڈ کی طرف بڑھنے لگے۔
 ”وہ ساڑھیاں تمہاری۔۔۔ بک کیس۔ پورے ساڑھے پانچ سو میں۔“ سرنیدر مگر جی نے سیگریٹ سلگانے کے بعد دیاسلانی جھٹک کر ایک طرف پھینکنے ہوئے کہا۔
 ”اچھا۔“ دیپاتی کا دل ڈوب گیا۔

”ہاں۔“ سرنیدر مگر جی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”جن صاحب کے پاس ہم یہ ساڑھیاں لے کر گئے وہ تو ان کو دیکھ کر بالکل اچھل پڑے۔ کہنے لگے بھائی یہ تو میوزیم بیسی ہیں۔ فوراً ٹاکٹ میوزیم کے لئے خریدو وانا ہوں۔ اور مزے کی بات یہ۔“ سرنیدر مگر جی نے سیگریٹ کی راکھ جھٹک کر بات جاری رکھی۔ ”مزے کی بات یہ کہ قیمت۔۔۔ جانتی ہو۔۔۔ کس نے ادا کی۔؟ خود سٹرکٹ ٹرکٹ نے۔“

”سٹرکٹ ویل نے۔؟“

”سٹرکٹ ویل آئی۔ سی۔ ایس نے۔“ سرنیدر نے جواب دیا۔
 ”او۔ ماں۔!“ خاندانی بادگاہوں کے کینے کا وقتی غم بھول کر دیپاتی کھٹکھٹا کر ہنس پڑی۔

”روپیہ ریجان دا وقت پر پہنچ گیا۔ کام شروع ہو چکا ہے۔“ سرنیدر مگر جی نے بات ختم کی۔
 وہ پانچ گاڑیوں کے اڈے پر چوراہے کے مدہم لمپ کے نیچے بیٹھ چکے تھے۔ سرنیدر مگر جی ایک لمخت جھلاوے کی مانند رات کے کھڑے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ دیپاتی سرکار جو اس کی طرح جھلاؤں کی عادی ہو چکی تھی۔ سکون سے ایک گھوڑا گاڑی کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوئی پینچا۔
 نوجوان مقابل کی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مسلمان کو جوان نے نیچے و نزار گھوڑے پر چابک لہرایا۔ گاڑی چرخ چوڑی کرتی کئی سڑک کے گڑھوں پر سے گزرتی دیپاتی کے گھر کی سمت روانہ ہو گئی۔

کھاری اومارائے

دوڑاب کے سبک پیڑوں کی لاقتنا ہی قطار سے مزین نارنجی افق پر سید سرخ سورج بہت آہستہ آہستہ اس طرح ڈوب رہا تھا۔ گویا شاہ باغ کی سستان، سایہ دار سڑک پر سے گزرتی بند گاڑی میں بیٹھی دیپاتی سرکار کے مسرور چہرے کا ابھی طرح نظارہ کرنا چاہتا ہو۔ کیونکہ شاید ایسا بے فکر چہرہ اسے دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔

سال، شیشم اور نیم کے پتے رمتا کی چوڑی سڑکوں پر نرم روی سے اڑتے پھر رہے تھے۔ فضائیں خنکی لگی تھی۔ پلڈہ لہریوں پر کھریاں دوڑ رہی تھیں۔ چٹانوں کی سفید بلیوں پر بچھے اکاؤٹا ملازم بیڑیاں پینے میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد ان سڑکوں پر مدھم مدھم لمپ جھللا اٹھیں گے۔ مکان، گھاس اور درختوں اور ہواؤں اور چاندنی رات کی نمفنی سنتے سنتے آرام سے سو جائیں گے۔ گھوڑے کی ٹاپا میں سڑک کی کنکریاں سطح پر بڑا پرسکون سا شور پیدا کر رہی تھیں۔ عبد القادر کوچوان سر جھکائے نہ جانے ان بہت ساری دنیاؤں میں سے کون سی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ اُس کی دنیا کون سی تھی؟ (ایک بانٹا کاجھوٹیرا یا شہر کی غلیظ گلی میں ایک تنگ ذناریک مکان، یا ایک شکستہ شاگرد پتھر۔ دس آدمیوں کا کتبہ اور مسلسل فکرِ محاش اور مسلسل غم زبیریت) عبد القادر کوچوان جو کچھ مردم شماری کے لئے ایک عدد اور اہل سیاست کے لئے ایک ووٹ کی حیثیت رکھنا تھا۔ ان دیکھے طوفانوں میں گھر اسیاتی سرکار کو ووٹ لینڈز لئے جا رہا تھا۔

موڈرین سٹیج کرکھلیوں والی بند گاڑی دوسری سڑک پر اس طرح نمودار ہوئی جیسے کہانی کا نیاباب کھلنا ہو۔ (دیاروں طرف زندگی کی کہانیوں کے باب کھلتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں اور کردار صفحات میں سے نکل کر قبروں میں جا بیٹھے ہیں۔ جتاؤں میں چھونگ دیئے جاتے ہیں۔ نیا صفحہ پلٹ کر قاری آگے بڑھتا ہے)

سے رہنے کے قابل بنایا گیا تھا۔ اس نے اپنے اُجاڑے دل و گنج کا تصور کیا جس کے خالی مطب میں بابا اُن مرلیوں کے انتظار میں صبر سے بیٹھے ہوں گے، جو کبھی کبھار اس طرف اُٹکتے تھے۔ دُھا کہ شہر کے ہزاروں ہلاکوں نیم تاریک مجلس مکان اور جھونپڑے، جن میں لائین اور مٹی کے دیئے ٹنڈے تھے۔ دور غبار گاؤں میں اس کا آبائی مکان جو تقریباً ڈھسے چکا تھا۔ ایسا افلاس، ایسی ویرانی اس ملک پر اس ہندوستان پر طاری ہے۔

گردہ دفعتاً ایک نئے جوش اور خود اعتمادی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انقلاب آنے والا ہے۔ اس انقلاب کے لانے والے ہم خود ہیں اور ہم کامران ہوں گے۔ اس انقلاب ہی کی عظمت ہے جس کی وجہ سے ووڈ لینڈز کے مالک کی بیٹی دھارے میں شامل ہو چکی ہے۔ جو ابرالال نہر دہی تو اُٹند بھون میں پروان چڑھے تھے۔

میرے تے باہر اگر پہلی بار اس سے بات کی۔ ”مس صاحب پلنگ میں نہیں اب اندر جائیے“
”کس طرف۔؟“ اس نے دریافت کیا۔

”مس صاحب مارٹنگ روم میں ہیں۔ ادھر۔“
دیپا کی سمجھ میں نہ آیا۔ شام کے وقت اگر مارٹنگ روم میں ہیں تو اسے ایونگ روم کیوں نہ کہنا چاہئے خیر بہر حال۔

میرے نے بھاری عتابی پردہ اٹھایا۔ وہ اندر گئی۔ پردہ اس کے پیچھے برابر ہو گیا۔ اب وہ اس بڑے کمرے میں کھڑی تھی، جس کے فرانسیسی دریچے کے نزدیک ایک کوچ پر کمری اور آرائش شال اوڑھے آنکھیں بند کئے کشتوں کے سہارے نیم دراز تھیں۔

ارے تو یہ ہیں اوما دیدی۔ اُسے ذرا سی مایوسی ہوئی۔ مگر فوراً اس نے اپنے آپ کو گھمایا۔ یہ میری بوڑھو اور مابینت ہے۔ میں کسی ناول کی ہیروئن کی متوقع کیوں تھی۔ اوما دیدی ایک فالتو، رومانی ہیروئن کی بجائے نئے ہندوستان کی نئی عورت ہیں۔ یہیں اپنے تیتاؤں کو خواہ مخواہ کلچر اٹرنز نہیں کرنا چاہئے۔

آہٹ سن کر اوما دیدی نے آنکھیں کھولیں اور نظر اٹھا کر سٹننے دیکھا۔
بڑے بڑے دریچوں والے کمرے میں شفق کی سہانی روشنی پھیل گئی تھی۔ کمرہ ایسا لگتا تھا،

اب دیپالی نے کھڑکی کی جھلی چڑھا کر باہر جھانکا۔ اسی راستے پر آگے جا کر ارجمند منزل تھی جس میں چہان آرا رہتی تھی۔ چہان آرا بیگم، جو اس دھندلی داستان کے آخری صفحات پر زندہ تھی جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر لے آباد کیا تھا۔ اسی راستے پر، اونچے اونچے معزور درختوں کے پیچھے ڈی ایم کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں رہنے والا ڈی ایم کینٹ ویل اس داستان کا ایک اہم کردار تھا جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر اجاڑا تھا۔ اسی راستے کے اختتام پر ”ووڈ لینڈز“ تھا۔ نئی داستان کے مصنفوں نے جہانگیر نگر کے فاتحین کے تعاون سے اپنے لئے کیسے کیسے ”ووڈ لینڈز“ تعمیر کئے تھے۔

دیپالی شادان و فرحان بیگم کی ایک نئے ڈرامے میں حصہ لے رہی تھی جس کے لیکچر ارجمند منزل اور ڈی ایمز ہاؤس اور ووڈ لینڈز کی بنیادیں ہلانے والے تھے۔ دیپالی کی آدرش وادی زندگی اس وقت بڑی مکمل تھی جس زندگی میں ہریان، سمجھ دار، درد مند رفیق اور ساقی موجود تھے۔ سب مل کر خطروں کا جیلنج قبول کر رہے تھے۔ آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ آزادی سے ملنے کی خوشی میں وہ رات بھر سو نہیں سکتی تھی۔ ان دیکھے ریحان دانے ایک اہم پیغام رسانی اُس کے سپرد کی تھی۔ ریحان داجیسے بڑے تیتا سے اب گویا اپنے اندرونی حلقے میں شامل کر چکے تھے۔ خوشی کے مارے اس کا بس نہ چلا کہ پرنگا لرا و مارا کے پاس پہنچ جائے۔

لیکن ووڈ لینڈز کے پھاٹک پر کانسٹیبل کھڑا دیکھ کے وہ دھک سے رہ گئی۔ بیگم مضبوطی سے ہتھام کر وہ جلدی سے نیچے اتری اور کانسٹیبل سے کہا کہ امارائے کی پرانی شاگرد ہے۔ کانسٹیبل نے بے پروائی سے سر ہلایا۔ غالباً دیپالی کو اتنا گھبرانے کی ضرورت نہ تھی۔ عبدالقادر کو کوکریہ ادا کرنے کے مددہ چند لمحوں کے لئے پھاٹک پر ٹھٹکی اور گاڑی کو واپس جانے دیکھتی رہی۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس اجنبی جگہ پر غیر محفوظ اور تنہا رہ گئی ہے۔ عید القادر کو چوان، حکام ادارہ اور لوہا کی اس قبائی دنیا میں اسے اکیلا چھوڑ کر سر جھکائے جھٹ پٹے کی نیم ناریکی میں سٹخ کرتا دور چلا جا رہا تھا۔ وہ ٹک کر باغ کی سرخ سڑک پر آئی تو سامنے گھاس پر پولس کا وردی پوش اعلیٰ افسر دہند و ستانی پر ایک اور چھ پوش اعلیٰ افسر (انگریز) بانوں میں ہتھک گھاس پر بٹلنے نظر آئے۔ تین تین جلتی ریساتی میں سچی تو میریز اس پر بھونکا۔ اس نے سر اسیگلی سے ”ادمان“ کا بلکا سا تودہ لگایا تو ایک عالمی شان بڑا اس کی سمت پکا۔ اس نے لپے الفاظ دہرائے: اودا دیہی کی پرانی شاگرد دیپالی سرکار بیٹے

چیرا اندر گیا۔ اور چند منٹ بعد سفید چپکن اور سبز مٹی والا بیروہ باہر آیا اور منہ سے کچھ بولے بغیر سر کی جنبش سے اس نے دیپائی کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ذرا جھکتے ہوئے طویل گیلری میں داخل ہوئی جس کی دیواروں پر دو رو بہ بارہ سنگھوں کے سرائی کا پینچ کی اسٹیموں سے ہر آنے جانے والے کو گھور رہے تھے۔ سیاہ اور سفید ٹائیلوں کے فرش پر سے گزرتے ہوئے دیپائی کو یاد آیا۔ پیر طر آٹے کے متعلق مشہور تھا کہ ان کے موکل اشرافیوں سے بھری قبیلیاں لالاکران کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور ان کی سیوی سز اچھا رائے اپنی سینڈلز میں میرے جڑواقی ہیں۔ دیپائی سوچنے لگی۔ اتنی دولت مند اوٹا دیسی تحریک کی مال بد رکوب نہیں کرتیں۔ جب عزت پڑتا ہے تو ہم جیسے زیب کارکنوں کو اپنے گھر میں سیندھ لگانا پڑتی ہے۔ اکتے ڈاٹوشن کرتے ہیں۔ سینڈرز مزدور ہے۔ محمود الحق پریس میں پر روت ریڈ ہے اور دن رات اپنی کمزور آنکھیں بھورتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بن پڑتا ہے یہ سب لاکر تحریک کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اوٹارے ایک محل میں رانیوں کی طرح رہتی ہیں اور ریمان داکسی پراسرار دیوتا کی طرح کہیں چھپے بیٹھے ہیں اور "ادپر" سے ریمان داکا طرف سے جو حکم ملتا ہے ہم سب اسے بجالانے کے لئے مستعد ہیں۔

اب وہ پیرے کے پیچھے پیچھے ایک ہال میں داخل ہوئی۔ جس کے وسط میں سنگ مرمر کی گول بیز پر کسی یونانی دیوی کا مرمیں مجسمہ اسنادہ تھا۔ فرش پر خمیر کی کھالیں اور بنا راکے قالین بچھے تھے۔ دیواروں کے برابر برابر لمبے تنجیم صونے رکھے ہوئے تھے۔ دیپائی نے ایسی شان و شوکت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ آئینہ منزل میں بھی نہیں۔ آئینہ منزل بھی بڑی عالیشان کوٹھی تھی۔ لگر دہاں کی ہر چیز بوسیدہ اور مضمحل سما معلوم ہوتی تھی۔ اوٹا دیسی سے ملاقات کی خوشی نے اسے راتے میں جس قدر مضطرب کیا تھا اس پر کیف اور جگمگانے ماحول کو دیکھ کر وہ بیک لخت اتنی ہی دل گرفتہ ہو گئی۔

کریم خان پیرے نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا کہ یہیں ٹھہر جائے (بیرا ملا تائیوں کی اوقات پہچان کہ بات کرتا تھا۔ اور ہاتھ کو اشاروں ہی پر پڑھاتا تھا) وہ ایک دروازے کا عتابی پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ دیپائی ایک کرسی کے کنارے پر ٹک گئی۔ اور ہال کی آرائش کو غور سے دیکھنے لگی۔ انسانوں کی زندگیوں میں اتنا شدید تضاد بھی ممکن ہے۔ اسے عبد القادر کو چوان کا شکستہ قبر ایسا مکان یاد آیا، جو چند رنگ کے کھنڈر ایسے شان گرد پینے میں ٹاٹ اور مین کے ٹکڑوں اور باشا کی بوسیدہ چٹائیوں کی مدد

جیسے باہر باغ میں شامل ہو گیا ہے۔ ہر شے ساکت اور متحیر اور منتظر تھی۔

”نوشکار۔ اوما دیدی۔“

”نوشکار۔ آؤ۔ آؤ۔ بیٹھو۔“

دیپاتی کوچ کے مقابل ایک کرسی بڑھ گئی۔

تب اومارائے نے نپائی پر سے اٹھا کر عینک لگائی اور نووارد اجنبی لڑکی کو تنکھی، گہری ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے اوما دیدی؟“

”کیا نام بتایا تھا تم نے۔ دیپاتی سرکار۔؟“

”جی۔“

”تم۔ اسکول میں کون سی کلاس میں تھیں؟“ اومارائے نے عینک اُتار کر ساری کے پتوں

سے صاف کرنے کے بعد دوبارہ تاک پر جمائی۔ ”سوری۔ میں تم کو پہچان نہیں سکی۔“

”جی۔ میں۔ اوما دیدی۔ مجھے سرنیدر دانے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ سرنیدر مگر جی نے“

اُس نے اپنے بیگ پر ہاتھ رکھ کر کڑبی آواز میں کہا۔

”اوہ۔“ اوما دیدی چونک کر اٹھ بیٹھیں۔ ہاتھ بڑھا کر کیو پڑ اور سائیکس کے سروں پر پھیلے سبز

جھاردار شیشہ والا بڑا الیمپ روشن کیا۔ شفق کا اُجا لائیز برقی روشنی میں ڈوب گیا۔ اب باغ میں پرندے

سیرالینے کے لئے چھپتا رہے تھے۔

”بڑی سردی ہے۔“ اوما دیدی نے شمال لپٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ کھڑکی بند کر دو۔“

دیپاتی نے اٹھ کر فرانسسی درپچے کے سلسلے وار پٹ بند کر دیئے اور واپس آکر کرسی پر بیٹھ

گئی۔ اوما دیدی اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہی تھیں۔

”تم کون ہو۔“

”دیپاتی سرکار۔“

”صرف نام دہرانے سے کام نہیں چلے گا۔ اس نام کے میرے لئے ابھی تک کوئی معنی نہیں

ہیں۔ تفصیل سے بتاؤ۔“ اومارائے نے جھنجھلا کر کہا اور انگلیوں سے کپٹیاں دبائیں۔ دیپاتی جو کانٹ

میں اوما رائے کی سخت گیری کی حکایتیں سن چکی تھی۔ اس اندازِ گفتگو سے زیادہ بہتیں گھرائی اور اطمینان سے دوبارہ مزاج پُرسی شروع کی۔ ”آپ کی طبیعت کیسی ہے اوما دیدی؟“

وہ خاموش رہیں۔ پھر کہا۔ ”کوئی پیغام لائی ہو۔؟“

”جی۔ سہرتیہ ردا ایراکوٹھیکٹ میں۔ میں کالج میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتی ہوں۔ میرے بابا بھائی چند سہرکار پرائیویٹ پریکٹس کرتے ہیں۔“ اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔

”کیا پیغام ہے۔؟“ اوما دیبائی نے پوچھا اور آنکھیں بند کر لیں۔

”ریمان دانی آپ کو خط بھجوا رہے ہیں۔“

”ریمان۔۔۔“ وہ اب چونک کر پھر سیدھی ہو بیٹھیں۔ ”ریمان کا خط ہے تو اتنی دیر سے فضول

باتوں میں وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ لاؤ۔“

دیبائی نے بڑے اطمینان سے بیگ کھولا۔

عین اسی وقت عنابا بی پردے کو جنبشی ہوئی۔ سفید ساری میں ملبوس ایک باؤتار عمر خانوں نے

اندراجھانکا۔ اور آواز دی۔ ”ہاؤ آریو اوما۔“

”آئی۔ ایم فائن۔“ اومانے خامی پزاری سے جواب دیا۔ ”میری ایک پرانی شاگرد آئی ہوئی

ہے ذرا چائے بھجواد دیجئے۔“

”اچھا۔“ لیکن واپس جانے کے بجائے مسز رائے اندرا گئیں۔ دیبائی نے تعظیم کھڑے ہو کر ان

کو فسخا کر لیا۔

”جینی رہو۔“ دیبائی پر سرسری سی نظر ڈال کر انہوں نے اوما کو نظر مندی سے دیکھا۔ ”رواپی

لی۔؟ ڈاکٹر چڑھی کہ رہے تھے، جب تک مرض کی تشخیص نہیں ہو جاتی۔“

”کمپٹی بار کموں گی ماں۔“ اومانے چہرہ مسز رائے کی بات کاٹی۔ ”مجھے کوئی مرض درجن نہیں۔

خالی سفر کی تکان ہے۔ آپ سب جانے کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

مسز رائے نے اس تلخ لمبے کی پرواہ کئے بغیر پھر کہا۔ ”ہم لوگ کلب جا رہے ہیں۔ وقت پر کھانا

کھا لینا۔“ اومانے کوئی جواب نہیں دیا۔

مسز رائے چند سیکنڈ تک اسی طرح کھڑی رہیں اور پھر کمرے سے باہر چلا گئیں۔

”اوہ۔ والین۔!“ اوما نے پہلی بار مسکرا کر دیپالی کو دیکھا۔ ”تمہارے والدین بھی اتنے

صبر آزمایں۔؟“

دیپالی اوما دی کے مزاج کی اس تبدیلی سے خوش ہوئی اور ہنس پڑی۔

”اچھا۔ اٹھو اور دروازہ بند کر کے اندر سے جھنجھنی لگا دو۔“

”لیکن ابھی تو اوما دی آپ نے جائے منگوائی ہے۔“

”ارے ہاں۔ بہت سمجھ دلانچی ہو واقعی!“

”ہجج۔ اوما دی، میں اس اپریل میں ایس برس کی ہو جاؤں گی۔“

”صرف تیس برس!“

”ذرا میری بستی ماں سے پوچھئے۔ ان کو یہی علم کھائے جا رہا ہے کہ میری سیاہ کی عمر سی مکمل ٹھی۔!“

دیپالی اپنی رومی کیسے گئی۔ اوما دفعتاً پھر تیوری پر لٹ ڈال کر سیدہ ہو گئیں اور مہرمت سے نفاذ چاک کیا۔

سائے کی طرح بیرے نے اندر آکر چپاؤ کی کشتی میز پر رکھی اور واپس چلا گیا۔ دیپالی نے چپاؤ

بنائی اور دروازہ اندر سے بند کیا۔ اوما سیانی سے ایک گھومتے بھر کر طول طویل خط پڑھنے میں مگن ہو گئیں۔

اپنی پیالی ختم کر کے دیپالی کرسی سے اٹھی اور ٹیل ٹیل کر دیواروں پر لگی تصویریں دیکھنے لگی۔ لارڈ

باٹرن، جی کے عقب میں طوفانی سمندر تھا۔ اور طاح ان کی کشتی کنا لے سے باندھ رہا تھا اور وہ فاح تلو

اپنی مخروط اور توانا مسکراہٹ کے ساتھ گویا اپنے قدموں پر چھکی ہوئی دنیا کا نظارہ کرنے میں مصروف تھا۔

دینیس اور ایڈونس۔ مسٹر کپک وک۔ اور سیاہ پوشا ک میں ملبوس ایک لڑخہ غیر عورت، جو ایک

باریش مرد کا بریدہ سر ہاتھوں میں لئے چچھیں مار رہی تھی۔ یہ بڑی پھیلاک تصویر تھی۔

دیپالی چند محنتوں تک اس تصویر کو دیکھتے نہ سنے کے بعد ذرا خوفزدہ سی ہو کر اپنی کرسی پر واپس

آ بیٹھی۔ اوما دی خط ختم کر کے گہری نگر اور پریشانی میں مبتلا آنکھیں بند کر چکی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا چھا گیا

تھا اور دیر کے نزدیک المٹاس کی ڈالیاں سر سر رہی تھیں۔ دود سے سیر کے بھونکنے کی آواز آئی۔ اوما

دیپالی نے آنکھیں کھولیں اور دیپالی کو بڑی سوختی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

”یہ کس کی تصویر ہے لوما دی۔؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”کون سی؟“

”یہ والی۔“ اُس نے اشارہ کیا۔

”ہتیس جانتیں؟ انٹرمیڈیٹ میں انگریزی پڑھتی ہو یا گھاس کھودتی ہو؟“

اس ڈانٹ سے وائس وہ سہم گئی۔

”یہ آسکر اولڈ کی سکوڑے ہے۔“ اومادی نے تڑھی سے کہا۔

”یہ کیکر ہی ہے اومادی؟“

”تم مجھے بہت بے وقوف معلوم ہوتی ہو۔“ اومادی اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”باہر بوقوف ہو یا بن رہی ہو؟“

اترے والی جیسٹی ہو گیاں بہت ہی بُری معلوم ہوتی ہیں۔ انہوں نے دل میں اضافہ کیا اور کہا ”کیا تم کو نظر

میں آیا کیکر ہی ہے؟“

”مگر اس کی کہانی کیا تھی اومادی۔“

”مجھے یاد نہیں۔ مجھے مذہبی اساطیر سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ کوچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

تم مجھ سے ڈیکورٹنٹ تصاویر پر گفتگو کرنے آئی ہو یا کچھ کام کرتا ہے؟“

”جی اومادی!۔“ دیپالی پھر ہنس دی۔

یہ لڑکی خوبصورت ہے اور بوقوف ہے۔ اس نے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ اومادی نے

لاکچر اور اکر کے مسٹی میں بھینچا۔ مگر حصول مقصد کے لئے رسک لینے ناگزیر ہیں۔ انہوں نے ایک گہری سانس

اور درندہ ویدٹ پر جا بیٹھیں۔

”ادھر آؤ۔ اور نولہ سے جو کچھ میں کہنے والی ہوں سنو۔“ انہوں نے درستی سے کہا۔

یکایک دیپالی کو اسی کیفیت نے اُن دلہ جا، جو اس پر ہال میں طاری ہوئی تھی۔ یہ میری استغاثی

ہی نہیں رہیں۔ بحر میں پت بڑی اہتیں ہیں۔ مگر مجھ پر اس طرح حکم کیوں چلا رہی ہیں۔؟ اسی لئے کہ

ن ترادی ہیں؟ اُس نے بڑھی بے خوفی سے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔ اومادی، مگر پہلے میں آپ سے ایک بات

پھینا چاہتی ہوں۔“

”کہو۔“

”آپ اتنی بے تمنا دو لہندہ ہیں۔ چپکے چپکے تحریک کی مالی مدد کیوں نہیں کرتیں؟“

بیوقوف ہے۔ اسی لئے نڈر اور مزہ چھٹ بھی ہے۔ اومانے دل میں سوچا پھر ایک گہرے سانس لے کر اُسے جواب دیا۔ ”دیپاتی یہاں آن کر بھٹو۔ ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے۔“ ابھی تک میرے جی پس منظر کو معاف نہیں کر سکے۔ انہوں نے دل میں کہا (تباہی سوال کا سیدہ سا جواب دیپاتی یہ ہے کہ میں تین برس سے لندن میں تھی اور چند روز قبل ڈھاکے واپس پہنچی ہوں۔ اور آئے ہی میاں پر لگئی۔ ساقیوں سے میرا پہلا رابطہ اس وقت تمہارے ذریعے قائم ہوا ہے اور ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں۔ چنانچہ غور سے سنو۔“

”اوہ۔“ دیپاتی نے بے حد نادام ہو کر کہا۔ ”آئی ایم سوری اومانہ دیدی۔“ وہ شرم سے پانی پانی ہوتی دھڑ دھڑ سبٹ پر جا بیٹھی۔

”اب میں چند سوال تم سے کرتی ہوں۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ کیونکہ ایک بڑی خطرناک ہم ہمارے سامنے ہے جس میں برسوں کی جیل کے علاوہ جانیں بھی جاسکتی ہیں۔“ پھر وہ چند لمحوں کیپ چُپ ہو کر سنیاتی پرائنگلیاں پھیرتی رہیں۔

”بتائیے اومانہ دی۔“

”بہت جلد اس علاقے میں کیونٹسٹوں کی عام گرفتاری شروع ہونے والی ہے۔ گرفتاریوں کی متعلق اور دوسرے خفیہ احکام کی خبر لگانے کے لئے ریحان الدین احمد نے لکھا ہے کہ۔ کہ دیپاتی ہر کام کی مدد لی جائے۔“

”میری۔ میری مدد۔؟“ دیپاتی ہکا بکارہ گئی۔ ”مگر ریحان دا تو مجھے جانتے بھی نہیں شاید میرے نام سے بھی واقف نہیں ہوں گے وہ۔ اور۔ میں کیا کر سکتی ہوں بھلا۔ اومانہ۔“

”تم ہر سارا کام کس طرح کرو گی۔ اس کی تفصیل ریحان نے مجھے کچھ بھیجی ہے۔“ اومانے لہانے پرانا رکھ دیا۔

”پہلے بتاؤ انگریزی بولنی آتی ہے؟“

”جی ہاں۔“

”انگریزی جب آپ میں تیز تیز لو لیں تو مجھے لوگی۔؟“

”جی ہاں۔ میں جتنی آؤں س سہلے ہم کو انگریزی پڑھاتی ہیں۔ اس لئے عادت ہو گئی ہے۔“

”گڈ۔ بہت ہے۔؟“

”جی ہاں۔ کافی ہمت ہے۔“
 ”ابھی تم یہاں آئیں تو تم کو کس کس نے دیکھا تھا۔ میرے اور میری والدہ کے علاوہ۔“
 ”ایک کانسٹبل اور ایک چراسی نے۔“
 ”میرے مانا کو پہچان سکتی ہو؟“
 ”شاید وہی بائیر ٹیل رہے تھے۔ ایک انگریز کے ساتھ۔“
 ”ہاں۔ اسپیشل آرڈر کانسٹیبلری والا کرسٹوفر ہیگ بھی ان سے ملنے آیا ہوا ہے۔ لویہ خط
 نو۔ بہت غور سے پڑھنا۔“

دیپالی نے اوما کے ہاتھ سے خط لیا اور پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اوما دیپالی سے بائیر دیکھنے
 ، بدن پر جائیوں کی دھند چھا چکی تھی۔ دیپالی نے خط دھڑو سیٹھ پر رکھ دیا۔ اور چھپکی بیٹی بری۔
 نے مڑ کر اس پر نظر ڈالی۔

”مجھے خود تعجب ہے کہ ایک نا تجربہ کار اور کمسن لڑکی پر اتنی بڑی ذمہ داری ریمان نے کس طرح
 ادا کی۔ ریمان کے اس خط سے ظاہر ہے کہ وہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے اور اسے یقین ہے کہ صرف
 بائیر کام باکسانی کر سکتی ہو۔“

”مگر اوما دی۔ ریمان دا مجھے بالکل نہیں جانتے۔ میں نے تو آج تک ان کی شکل کیا تصویر
 نہیں دیکھی۔“

”تم کو مجھ سے تعارف دلانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔“
 ”ادما دی۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ ریمان دا کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“
 اوما پھر جھلا گئیں۔ ”تم مجھے سکھلاؤ گی کہ انڈر گراؤنڈ کا کام کس طرح کیا جائے۔ یہ ریمان
 طرح کی ہدایات کس کو دے؟ میں ریمان کو بہت قریب سے جانتی ہوں یہ بھی مدت سوچ بیٹھنا
 ، کوئی دو مینٹک ہیر وہے۔ گو میں جانتی ہوں کہ سارے بنگال میں کالج کی لڑکیاں بہت دنوں سے
 پر زہر کھا رہی ہیں۔ خیر۔ تو یاد رکھو کہ وہ دو مینٹک نہیں ہے۔ بی بی پیکل پیکل اور انتہائی سمجھ دار
 نایہ۔ وہ کوئی ڈرامہ نہیں کھیل رہا ہے۔ دو مرتبہ اس کے عزیز دوست اس کو خندیدہ ہوا کادے چسکے
 اس لئے وہ بے انتہا محظوظ ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اس نے تم پر بھروسہ کیا ہے۔ سارے بنگال کی

فوجوان لڑکیاں۔“ انھوں نے سپاٹ، مضبوط آواز میں دہرایا۔“ ریحان الدین احمد پر عاشق ہیں۔ مگر اس کو جانتی صرف میں ہوں۔ صرف میں اس کی رفیق اور دوست ہوں۔ مجھ سے زیادہ کوئی اسے نہیں جانتا وہ دھاکر بونیورسٹی میں مجھ سے جو نیرتھا مگر لندن میں بھی ہم دونوں ایک ہی کالج میں تھے۔ اکٹھے ہم نے وہاں کی ٹرک میں کام کیا ہے۔ وہ پورٹری کی حیثیت سے اسپین بھی گیا۔ مجھے یہی افسوس مرتے دم تک رہے گا کہ میں محاذ نہ جاسکی۔ خیر۔ تو اس نے کھلبلیے کہ تم سیدھی اور قابل اعتماد ہو۔ ریحان انسان کو خوب پہچانتا ہے۔ نظر میں آدمی کو پہچان لیتا ہے۔ امید ہے کہ اس نے تم کو پہچاننے پر بھی غلطی نہ کی ہوگی۔“

”مگر وہ تو مجھ سے کھلی۔“ دیپاتی نے کڑنا شروع کیا اور پھر ڈر کر چُپ ہو گئی۔

”وہ تم کو پہچان سکتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ تمہارا اسے پہچانا قطعی مزوری نہیں۔“ اومادی نے بات ختم کر کے ریشمیں پر دے آبشاروں کی طرح سرسراہنے لگے۔ دفعتاً دیپاتی کو بڑا بڑے نکاح خیال اس وقت آیا۔ اومادی کے پاس بھی باجوہ بوڑے دارسایاں ہوں گی۔ ایک سے ایک تابیاب۔ خرمین کیا کیا جھکا۔ ہے۔ اور میں ایک پر خطر ہم پر جا رہی ہوں۔

”مجھے اپنے بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔“ اومادی آواز دور سے اس کے کان میں آئی۔

”کلاس کی بیک گراؤنڈ۔“

”ہاں۔“

”ڈل کلاس۔“

”اومادی نے خود سے سننا شروع کیا۔ گویا ہسپتال میں کیسی بڑی سس رہی ہوں۔

”تم نے کیا سہہ بتائی تھی۔؟“

”انیس سال اور اب تک سکندریٹر ہی میں ہوں۔“ دیپاتی نے تاسف سے کہا۔

”وجہ۔۔۔؟“

”بیس بارہ سال کی تھی جب ماں مر گئیں۔ ان کو۔۔۔ کینسر ہو گیا تھا۔ بابا پٹنہ لے کر گئے۔

ہسپتال میں مر گئیں۔ میں سب سے بڑی تھی۔ تینوں بھائی چھوٹے ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے میں اسکول چھوڑ دیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ کہے جاؤ۔“ اومادی کشتنوں پر کہنیاں رکھ کر غور سے سنتی رہیں۔

”بابا ماں پر عاشق تھے۔ ان کے مرنے کے بعد مجھ کو روہ لگے۔“
 ”پو پو مین۔“

یک نحت دیپاتی نے اوما پر نظر ڈالی۔ اور اسے خیال آیا۔ بابا کی بقیہ عمر بھی اسی طرح تنہا اور
 او اس گزر جائے گی۔ کاش انہیں اوما دی جیسی سمجھ دار اور درد مند عورت کی رفاقت میں سروسکتی
 پھر اس نے بے ساختہ بڑے فخر اور پیار سے کہا۔ ”میرے بابا بہت خوبصورت ہیں۔ دکھوں نے
 انھیں وقت سے بہت پیسے بوڑھا کر دیا ہے۔ مگر اب بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ اور میرے کا کا
 — میرے کا کا تو بابا سے بھی زیادہ —“ پھر اس کی آواز رو دھو گئی۔

”انتی جذباتیت سے کام نہیں چلے گا۔ دیپاتی سرکار۔“ اوما نے رشتی سے کہا۔

”تمہارے کا کا کو کیا ہوا۔؟“

”پھانسی۔“ دیپاتی نے مضبوطی سے جواب دیا۔

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سوری۔“ اوما دی نے آہستہ سے کہا۔

”کیا نام تھا تمہارے چچا کا۔؟“

”دنیش چندر سرکار۔“

”گڑ گڑ گاڈ۔ اوما دی سنبھل کر بڑھ گئیں۔ ”تم۔ تم دنیش چندر سرکار کی بھتیجی ہو؟“

”جی ہاں۔ وہ بابا کے اکوٹے چھوٹے بھائی تھے۔ جب اس کے عین ماں ریڈیم ہسپتال میں تھیں

جب کا کا کو دہشت پسندوں کے اس مشہور کمپن میں پکڑ لیا گیا۔ بابا نے۔ بابا نے پٹنے سے فقار کاڑھ

باکرساری آبا کی کھینٹ باڑی بیچ کھونچ پٹنے کا ایک بڑا بڑا بڑا کھڑا کیا (اسے یاد آیا بابا کہتے تھے کہ وہ شری پری تو ش

مسا دروائے کو کھڑا کرنا چاہتے تھے مگر ان کی فیس زیادہ تھی) مقدمہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ مگر یہ بڑا کھڑا کا کو پکڑ لیا

اور ان کو پھانسی ہو گئی۔ جس سال ماں مری ہیں، اس کے چھ مہینے بعد ہی کا کا کو پھانسی ہو گئی۔“

”تم کو یاد ہیں۔؟“

”خوب اچھی طرح یاد ہیں۔ چھ سال پہلے ہی کی تو بات ہے۔“ دیپاتی کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

لڑے کا کلاک ٹیک ٹیک کرتا رہا۔ چند لمحوں بعد دیپاتی نے کہا۔ ”اوما دی بعض دفعہ صبح منہ اندھیرے بڑی

آنکھ کھل جاتی ہے۔ جب ابھی پوری طرح اجالا نہیں پھیلتا۔ اور پانگ پر پڑے پڑے کھرکی سے باہر اندھیرے

آسمان کو دیکھ کر سوچتی رہتی ہوں، بالکل ایسے ہی وقت میں، پوچھنے کے وقت میں، کا کا انقلاب اور ہندوستان کی آزادی کے نعرے لگاتے تھے پر بیڑا ہ گئے تھے۔ اور میں خوب روتی ہوں اور سوچتی ہوں کا کا اور ان کے ہزاروں ساتھیوں کا خون رائیگاں نہ ہونے دوں گی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

سوئس کاٹچ کی شکل کا کلاک ٹیک کرتا رہا۔ اب رات کے پونے دس بج رہے تھے۔ دیپائی نے وقت پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔ "کا کا کی شہادت کے بعد بابا کا دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو گیا۔ اگر ہم بچوں کا بھڑانہ بیڑا تو وہ شاید سیاسی لے لیتے۔ مگر وہ مذہبی بھی نہیں ہیں۔ وہ کانگریس میں شامل تھے اور جیل بھی کاٹ چکے تھے، مگر لاڈ لے بھائی کی موت کے بعد سے ان کو ایک عجیب طرح کا ذریعہ ایجنٹ ہو گیا۔"

"سیاست سے نفرت ہو گئی؟"

"تقریباً۔ اب وہ دن بھر چپ چاپ کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں۔ غریبوں کا مفت علاج کرتے پھرتے ہیں۔ پریکٹس چلتی نہیں۔ بس اتنا کمالات ہے کہ گھر چل جائے۔"

"تم ابھی کھینٹی باڑی کی کیا بات کر رہی تھیں؟"

"غفار گاؤں کے نزدیک ہمارے یہاں مخلوں کی دی ہوئی زمینداری تھی۔ وہ بابا کے پیکھوں نے ناچ گانے اور شراب پینے میں اڑادی۔ اس غصے میں کہ لودو لے بنیوں کے آگے نہیں جھکیں گے۔"

"نیوڈل ڈیکریٹس جو انیسویں صدی کے برطانوی بوزروان نظام سے ٹکرا کر بنا گیا۔ آوا رائے نے سر ہلا کر کہا۔ دیپائی نے ذرا آنکھیں پھیلا کر انہیں دیکھا۔

"اب تمہارے کہنے میں کون کون باقی ہے؟"

"مخوڑے سے رشتہ دار ہیں، وہ غفار گاؤں میں چھوٹی موٹی سرکاری ملازمتیں کرتے ہیں۔ بابا کے ایک چچا زاد بھائی ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر ہیں۔ چند سال ہوئے وہ ٹری ٹیڈاڈ ہجرت کر گئے۔ وہاں ہزاروں کمار ہے ہیں۔ بس اور کوئی نہیں۔ ٹھا کر ماں کا پچھلے سال انتقال ہو گیا میری ماں کا میکہ سراج کونج میں ہے۔ وہ بھی ملازمت پیشہ لوگ ہیں۔ اور کیا بتاؤں۔ ہاں۔ یہ "چندر کونج" ہماری کونجی کتنے کی خوشالی

کے زمانے میں ٹھا کر دانے بنوائی تھی۔ ٹھا کر دانی زندگی ہی میں بابا اور کا کا قومی تحریک میں شامل ہو کر جیل یا نزا کے لئے چلے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت تھی جیسی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا۔ انگریز سے چھڑکا رانے کے بعد دیس کے ان سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔

”ایسا ضرور ہوگا۔ دیپالی۔ ایسا ضرور ہوگا“ اومارائے نے آہستہ سے کہا۔ ”تم بابو سی کا شکر کرا بھی نہ ہونا۔“

”میں بابو سی بالکل نہیں ہوں اومادی۔“ دیپالی نے دفعۃً ہنس کر کہا۔

”تم نے دوبارہ پڑھائی کیسے شروع کی؟“

”بابا کی ایک ہی سگی بہن ہیں۔ عمر میں ان سے بہت بڑی۔ چار سال ہوئے وہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کے شوہر فریڈ پور میں وکالت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بچپنی ماں ہمارے یہاں آگئیں۔ ذوالا ولد ہیں۔ انہوں نے آن کر گھر سنبھال لیا تو میں نے ہائی اسکول پاس کیا اور کالج میں داخل ہو گئی۔ ساتھ ہی عباس الدین احمد کے ہاں جا کر سنگیت بھی سیکھتی رہی۔ میں بابا کی مدد کے لئے ڈاکٹری پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن بابا جانتے ہیں کہ ڈاکٹری کی تعلیم میں میرا جی بالکل نہیں لگے گا، اس لئے انھوں نے سائینس نہیں لینے دیا۔ اب اس جولائی میں وہ مجھے شانتی نکلین بھیج رہے ہیں۔ ان کے دوست پروفیسر ترقی حسین کا بھی سمت ارار ہے کہ میں شانتی نکلین چلی جاؤں۔“ دیپالی نے پھر کلاک پر نظر ڈالی۔

”تحریک میں کس طرح شامل ہوئیں؟“ اومارائے کے سوالات ابھی ختم نہیں ہوئے تھے۔

دیپالی پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

”پھر وہ اسکول گرل لیگز۔۔۔“ اومارائے نے غصے سے کہا۔

دیپالی نے گلے پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ ”اس کا قصہ بہت دلچسپ ہے اومادی۔ ایک

روز۔ ایک روز شام کے وقت۔۔۔“

دفعۃً اومارائے نے اس کی بات کاٹی۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے کا کا اگر زندہ رہ جاتے

تو ہندوستان کے بہت بڑے مورخ بنتے؟“

”جی ہاں۔ میں نے ان کی کتاب کئی بار پڑھی ہے۔ مگر سمجھ میں نہیں آتی۔ بابا کہتے ہیں ابھی میرے سمجھنے کے لئے وہ موضوع ہی بہت، ٹھوس ہے۔۔۔ بنگال کی اقتصادی تاریخ“

”تم تحریک میں کس طرح شامل ہو گئیں؟“ ادا یہی نے سوال دہرایا۔

”پچھلے سال میں ایک روز شام کو برآمدے میں اکتائی ہوئی کھڑی اپنے بھائیوں کا انتظار کر رہی تھی، جو رات کے کھانے سے ذرا قبل فٹ بال کھیل کر لوٹتے ہیں۔ بستی ماں رسوئی میں تھیں اور بابا طبیب بند کر کے ہنانے کے برمنشل خانے میں جا چکے تھے۔ اتنے میں برآمدے میں سے کیا دیکھتی ہوں کہ ایک مسلمان فقیر چلے پڑھا۔ بے ایک تارہ لے۔ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے جھن سے ایک تارہ پھیرا اور بڑی دلدوز آواز میں باؤل گانا شروع کر دیا۔ بستی ماں فقیروں اور سنیاسیوں کو بڑی عقیدت سے دیتی دلاتی رہتی ہیں، اس لئے میں نے اُسے آواز دی کہ پھینک دو۔ اس کی ڈیوڑھی پر چلا جائے۔ مگر میری بات سن کر وہ جھپاک سے برآمدے میں آگیا اور کہنے لگا کہ ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہے۔ میں ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ اس کی نظر اندر سیٹھک خانے میں لگی کاکا کی بڑی تصویر پڑ گئی۔ اور اس نے جلدی سے کہا کہ اسے اس تصویر کی مددوں سے تلاش تھی۔ اور میری گھبراہٹ اور احتجاج کی مطلق پروا کئے بغیر جھٹ سے مکرے میں گھس گیا۔ اور دیوار کے پاس جا کر بڑی محویت سے پورٹریٹ کو دیکھنے لگا۔ میں بڑبڑا کر اندر گئی تو اس نے پوچھا ”اس تصویر کی ایک کاپی مل سکتی ہے“ اور پھر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اپنے جھولے میں سے کچھ کاغذ نکالے اور چاروں طرف دیکھ کر بولا۔

”تم کون ہو؟ دہیش بابو کی لڑکی ہو؟“

”میں ان کی بھینچی ہوں، ان کی شادی نہیں ہوئی تھی۔“ میں نے کہا۔ نو کہنے لگا۔ ”اچھا اپنے بابا کو بلاؤ۔“ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں ایک دم بہت ڈر گئی۔ اور پچھلے برآمدے میں جا کر بابا کو آواز دی۔ بابا جلدی آئے، ایک عیب سا فقیر آکر سیٹھک خانے میں بیٹھ گیا۔ بے بے بے۔ بابا تو لیکندھے پڑا لے جلدی سے باہر نکلے اور کمرے میں گئے تو وہ فقیر فوراً کھڑا ہو گیا۔ اور چپکے چپکے ان سے باتیں کرنے لگا۔ بابا اسے دیکھتے رہے پھر ادا سی سے مسکرا ڈئے۔ میں دروازے میں سے اندر جھانک رہی تھی۔ انہوں نے مجھے آواز دی کہ چائے بناؤں۔ میں چائے بنا کر لے گئی۔ اب وہ اور بابا پرانے دوستوں

کی طرح صوفے پر بیٹھے یا توں پر ہتھک تھے۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اپنا نام نور الرحمن میاں بتلایا۔ اور کہنے لگا کہ بارہ سال میں اس کا تکیہ ہے۔ جب میں اس کا مطلب نہ سمجھی تو ہنس پڑا۔ اور کہنے لگا کہ وہ ایک بنگالی دیہاتی کا ایڈیٹر ہے۔ اور کالکے متعلق ایک خاص عزیز نکال رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے آیا ہے۔ کالکے نجی حالات، ان کے پرانے مسودے حیل سے لکھے ہوئے خط۔ پرانی تصویریں، یہی سب۔ مجھے اس کی جھاڑ جھنکار ڈاڑھی پر پڑی ہنسی آئی۔ کہ ایڈیٹر لوگ تو باؤل فقیروں کا حلیہ بنا کر ایک تارہ نہیں جاتے پھرتے۔“

”پھر کیا ہوا۔“ اُمانے جواب بڑے غور سے یہ داستان سن رہی تھیں، سوال کیا۔

”تو بابا نے اس سے کہا کہ وہ ساری چیزیں بکسوں میں سے تلاش کر کے اس کے لئے نکال رکھیں گے اور اسے دو دن بعد آنے کے لئے کہا۔ انہیں میں میرے تینوں بھائی آگے اور ایک عجیب سے جہان کو اندر بیٹھا دیکھ کر کھڑکی میں سے جھانکنے لگے۔ توفیق نے یعنی نور الرحمن میاں نے مجھ سے کہا کہ میں دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اور بچوں کو بھگانے کے لئے باہر گئی۔ اتنی دیر میں نور الرحمن میاں۔ یعنی باؤل فقیر بھی ایک تارہ یا نابہر آکر جھپاک سے پھاٹک پر پہنچ گیا۔ ہمارے بڑے اور پھاٹک کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ دو دن بعد وہ کاغذات اور تصویریں لینے کیلئے اسی وقت اندر بھر پڑے آیا۔ بابا کو کسی برہن کو دیکھنے کے لئے باہر جانا پڑ گیا تھا۔ اور وہ ساری چیزیں میرے حوالے کر گئے تھے۔ فقیر بھڑی نے نکلنے سے سچھک خانے میں آگیا۔ اور میں نے جلدی سے دروازے بند کر کے کھڑکیوں کے پردے گرا دئے۔ صوفے پر بیٹھ کر وہ مجھے اس طرح دیکھتا رہا گویا بہت محظوظ ہو رہا ہو۔“ اتنا قصہ سنا کر دیپا کی پھر کھلکھلا کر ہنسی پڑی۔

”اس قدر سننی کیوں ہو؟“ اُمانے ناگواری سے کہا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ اس عمر میں بات بے بات ہنسی کے قرار سے چھوٹے ہیں۔

”سٹوری اُمانی۔“

”تم نے اتنے ذہک اٹھائے ہیں پھر بھی اتنی مسرور اور لبنتا شا ہو۔“ اُمانے کے لہجے میں رشک کی تلخی کے علاوہ بڑی عجیب سی آرزوئی تھی جو دیپا نے محسوس نہیں کی۔ وہ اپنی بانشاشت پر نادم نظر آنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔

”پھر کیا ہوا۔۔۔ اومانے سمجھی سے پوچھا۔

”بس پھر میں نے بابا کا دیا ہوا بڑا فائل اس کے حوالے کر دیا۔ اور وہ کہنے لگا کہ مجھے جو کچھ کا کا کے بارے میں یاد ہو اسے بتاؤں۔ میں نے کا کا کا ذکر کیا تو ایک دم رونے لگی۔ وہ بہت گھبرا گیا۔ خیر پھر اس نے جلدی جلدی نوٹ لئے۔ اور اپنے رسالے میں میری دل چسپی دیکھ کر اس نے کہا کہ اگلے مہینے سے پرانا پلٹن کے فلاں مکان میں ایک اسٹڈی سرکل قائم ہو رہا ہے میں اس میں ضرور جایا کروں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھے ایک باؤل گیت سکھائے۔ کیونکہ میں نے عباس داسے بہت سے باؤل گیت سیکھے ہیں۔ مگر یہ والا باؤل جو وہ گا رہا تھا میں نے کبھی نہیں سنا تھا اس نے کہا آج تو دیر ہو جائے گی۔ اگر میں اجازت دوں تو وہ کل شام کو اسی وقت آ سکتا ہے۔ میں بے حد خوش ہوئی۔“

”چنانچہ وہ تیسرے روز بھی آیا۔“ اقا دینی نے آنکھیں بند کر کے سپاٹ آواز میں کہا۔

”جی ہاں امدادی۔ اور میں نے حسب معمول جلدی جلدی دروازے بند کئے اور پردے گرا دیئے۔ مجھے بڑی ہنسی آ رہی تھی اس نے مجھ سے باؤل گیت سکھایا اور مجھ سے بھی دو تین گانے سنے۔ اور کہنے لگا کہ وہ ریڈیو پر ہمیشہ جب موقع ملتا ہے تو میرے گانے ضرور سنتا ہے۔ بہت ہی سٹوڈنٹ فقیر تھا امدادی۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ فقیر نہیں۔۔۔ نور الرحمن میاں۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“

”بابا اتفاق سے اس روز بھی باہر گئے ہوئے تھے۔ کیونکہ ان کے مریض کی حالت خطرناک ہو چکی تھی خیر جب وہ واپس آئے تو میں نے ان کو بتایا۔ وہ اچانک ایک دم اداس ہو گئے اور کہنے لگے۔ دیمپالی۔۔۔ اپنے عزیز ارجان بھائی کا بلیران دے چکا ہوں۔ اب تم تو اس خطرناک راستے پر نہیں چلو گی؟ میں نے دل میں کہا۔ ماں مجھے معاف کر دینا۔ میں بابا سے جھوٹ بول رہی ہوں۔ اور میں نے بڑی صفائی سے جواب دیا کہ میں اس راستے پر سہمگن نہیں چلوں گی۔ وہ مطمئن ہو گئے۔

”اس کے بعد نور الرحمن میاں ایک مرتبہ اور آئے تھے۔ رات کے وقت۔ یہ بتانے کے لئے وہ کہیں اور جا رہے ہیں۔ انہوں نے جاتے جاتے مجھے ایک مرشدی گان لور ایک دریا پتی کا گیت بھی سکھا دیا۔ جو مستحلی میں ہے۔“

”دیدنی میں اگلے مہینے بابا کے ساتھ کلکتے جاؤں گی اپنے گانے ریکارڈ کرنے۔ وہاں وہ مرشدی

گان اور دیا پتی کائیت بھی ریکارڈ کرواؤں گی۔ آپ کو سناتی مگر اب بہت دیر ہو جائے گی۔
 او۔ ماں۔ دس بج گئے۔“

”بہت خوب۔“ اوماہی نے کچھ اور سوچتے ہوئے بے دھیانی سے جواب دیا۔
 ”مگر وہ رسالہ تو شائع ہوا نہیں اور نور الرحمن میاں بھی غائب ہو گئے۔ اس کے بعد میں پرانا
 پلٹن اسٹڈی سرکل میں جانے لگی۔ وہاں نور الرحمن میاں کبھی نظر نہیں آئے۔ مگر دوسرے ساتھیوں سے
 ملاقات ہوئی۔ میں بابا سے کہہ کر جاتی تھی کہ روزنی کے گھر جا رہی ہوں اور میں اور روزنی میدھے پہنچتے
 تھے پارتی آفس۔ جب سے میں ہمدرد کی حیثیت سے تحریک میں ہوں اور تھوڑا بہت کام ہو مجھ سے بن پڑنا
 ہے۔ کرتی رہتی ہوں۔“

”پچھلے مہینے عمرینہ دانی تشویشناک خبر دی کہ اس غیر فانی رسالے اور اس کے پریس پرچھاپہ مارکر
 پولس نے سارے اشاک پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور ریحان دا اور ان کے ساتھی راتوں رات اپنے خفیہ مستقر
 سے فرار ہونا ہاجتے ہیں اور اس کے لئے انھیں فوری دو ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ مدھیہ فوراً فرام کیا
 گیا۔ اس میں پانچ سو کی کمی پڑی تھی۔ تو میں نے۔۔۔ میں نے اپنی ماں کی چھوڑی ہوئی بالوچر پونے لاکھ
 ساڑیاں بکوا دیں۔ اب ریحان دانی جانے کون سے گاؤں میں جا کر نیا ہینڈ پریس لگا لیا ہے اور کسانوں
 کی تنظیم کے لئے پرچے اور پمفلٹ چھاپ رہے ہیں۔ اب جا کر وہ کا کا والا نمبر بھی شائع ہو جائے گا۔
 مکلفیدی۔۔۔ مجھے تعجب تو یہی ہے کہ ریحان دا مجھ سے آج تک نہیں ملے۔ انھوں نے آپ کو یہ کیسے کھا
 ہے کہ مجھ سے ابھی طرح واقف ہیں۔ اور اتنا ذمہ داری کا کام آج میرے اوپر ڈال دیا۔ کمال ہے۔“

اومانی نے بیدارکتاہٹ کے ساتھ ونڈوسیدٹ پر نیم دراز ہو کر کر وٹ بلی اور چند لمحوں تک
 خاموش رہنے کے بعد سیزاری سے کہا۔

”دیپالی سرکار۔ تم ایک برس سے انڈر گراؤنڈ کے لئے کام کر رہی ہو اور تم کو یہ تک پتہ نہیں کہ
 انڈر گراؤنڈ کے بیڈر طرح طرح کے بھیس بدلنے رہتے ہیں۔۔۔ وہ مسلمان بزرگ جنہوں نے تم سے
 خلوص بڑھایا۔“ اوماکی آواز پر اب مدھیہ تکان غالب تھی۔۔۔ ”ریحان الدین احمد تھے۔“

”او۔ ماں۔۔۔“ دیپالی گم سم رہ گئی۔ چند لمحوں تک بالکل حواس باختہ رہنے کے بعد
 اس نے آہستہ سے کہا ”لیکن انہوں نے تو اپنا نام نور الرحمن بتلایا تھا۔“

”اکثر کلہاڑے، موقع پڑنے پر باری باری ایک فرضی نور الرحمن میاں بننے لگتے ہیں۔“
 ”اوہاں —“ دیپالی مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اسے لگا، جیسے اس کی زبان گنگ ہو گئی ہو۔ آقا
 نے کرٹ بدلی۔ بڑے دھیان سے اس کی صورت دیکھی اور خشکی سے انگریزی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
 اور دفعتاً کاروباری اور کرخت آواز میں پوچھا، ”تم نے اپنی اس ہیراز سہیلی کا کیا نام بتایا جو تمہارے ساتھ
 تحریک میں شامل ہو گئی ہے۔؟“

”روزی بیزجی۔“

”قابل اعتماد ہے؟“

”بہتر قابل اعتماد۔ ریجان دا — اس کے متعلق جانتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے
 یہ اسکیم بنا کر آپ کو بھیجی ہے۔“

”ہوں — اچھا آئیے کے سامنے جاؤ۔“

دیپالی نے تعمیل حکم کی۔

آوارائے نے سر تیبوڑا کر اس کے سرایا کا جائزہ لیا۔

”اب اپنے مین سنگھ کے دیہاتی لیجے میں بولو تو — میں شام کو تمہیں سب سمجھا چکی ہوں
 ریجان نے لکھا ہے تم بہت بڑھیا ایکٹریس ہو۔ یہ ہم کامیابی سے سر کر لو گی۔“
 وہ چپ رہی۔ کوئی تعجب نہیں کہ باؤل فقیر نے کسی اور بھیس میں جا کر اس کے کالج کے ڈرائے بھی
 دیکھ لئے ہوں۔ آئیے میں اس نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوا ہے۔

”کیا نام ہے —؟“ آوارائے نے اسٹیج ڈائرکٹر کی طرح ڈپٹ کر دریافت کیا۔

”جی — جی — ہم — ہم کلثوم بی بی۔“

”کہاں سے آئی ہو۔؟“

”جی — مین سنگھ ضلع سے۔“

”سر سفیٹ ہیں؟“

”جی نہیں۔ ہمارے خالو نواب صاحب بوگرہ کے خانساہاں ہیں۔ انہوں نے بھیجا ہے۔“
 ”شاباش۔! مگر نواب صاحب بوگرہ نہ کہہ دینا۔ آفت آجائے گی۔“ آوارائے نے

دفعاً ہنس کر کہا۔

”سوری — کچھ اور سوچ لوں گی۔ آگے پوچھئے۔“

”بس تھیک ہے۔ ریجان — نے غلط نہیں کہا۔ ہاں۔ اور برقعہ —؟“

”کل حاصل کروں گی۔۔۔ عبدالقادر کی بی بی سے۔“

”عبدالقادر کون ہے؟“

”گاڑی والا —۔ ہمارا کوچوان نہیں۔ ہماری گاڑی تو کب کی ٹوٹ پھوٹ کے برابر ہوئی۔

بابا نے اسے ہاراشاگرد پیشہ دے رکھا ہے۔ مجھے کہیں جانا ہو تو بڑے خیال سے لاتا لے جاتا ہے۔“

”جولی گڈ۔ فائن۔ اچھو۔ بہت رات ہوگئی۔ بابا سے کیا کہہ کر آئی تھیں؟“

”بابا دعویٰ اور جہاں آئے گھر سے میرے دیر سے لوٹنے پر کچھ نہیں کہتے۔ اور ہمیشہ وہاں کا کام

مجھے گھر پہنچاتا ہے۔ ڈھاکے میں میری ہی دوعزیر مسہیلیاں ہیں۔ اُوادکی۔ میں ان کے علاوہ اور

کسی کے گھر نہیں جاتی۔“

”رائیٹ —۔“ اُودا نے برقی گھنٹی کا سوچ دیا یا۔ ”یہ سچی اچھا ہوا کہ یہاں سب لوگ اس

بقت کلب گئے ہوتے ہیں۔“ میز نے بند دروازے پر دستک دی۔ اُودا بی نے آگے بڑھ کر جھنجھی

کھولی اور جھک کر میز سے باتیں کرنے لگیں۔ ”بیرہ آیا۔“ ڈرائیور سے کہو۔ ٹہرو۔ کون سی موٹر ہے؟“

”میم صاحب کی۔“

”اچھا۔ گویاں سے کہو برساتی میں لگا دے جلدی۔ ایک دم۔“ سٹوے کی تصویر پر پتھر لادی

لود سے ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈال کر دیپالی، اُودا کے ساتھ مارننگ روم سے باہر نکلی۔ دل کے دروازے

پر پہنچ کر امدارائے نے کہا۔ ”موٹر اپنے گھر سے کچھ فاصلے پر رکوانا۔“ پھر انہوں نے دیپالی کی پیٹھ تھپک

رکھائی کی امید ظاہر کی اور سر تھکانے کی سیرمی میں جلی گئیں۔

دیپالی برآمدے میں نکلی۔ اور برساتی میں اتر کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ موٹر ایک جھونک کے ساتھ طویل

رائٹو کا چکر کلاٹ کر پھاٹک پر پہنچی۔ اب اس لمحے سے میں اپنی ہی ذمے داری کی محبت میں بالکل تنہا

ہوں۔ اس نے سوچا۔ موٹر تیزی سے رستائی چوڑی ہرسانا سڑک پر آئی۔ روشن دو ڈیلینڈز اچانک

ندھیرے میں ڈوب گیا۔

دیپالی نے آگے جھک کر ڈرائیور سے کہا: "ڈرامشن کیا ڈنڈ کی طرف سے ہوتے ہیں"

۶

ریورنڈ پال متھیو بنرجی

مشن کیا ڈنڈ کے ویسی گرجا گھر کے اندر کرسمس کی تیاریوں کے سلسلے میں تیز رفتاری ہو رہی تھی۔ بڑے دن میں صوف چارو وزرہ گئے تھے۔ یکپا ڈنڈ میں سخت گہا لگی اور رونق تھی کرسمس ویک کے دوران میں ویسی مشنوں کی سالانہ کانفرنس منعقد ہونے والی تھی جس میں شرکت کے لئے آلا آبادہ سینٹر پور، ماگرہ، شاہجہاں پور، لدھیانہ، امانار، لاہور اور دوسرے بڑے بڑے مشنری مراکز سے نمائندہ مبلغین ڈھاکے آن پہنچے تھے اور یکپا ڈنڈ میں لگے خیوں میں پھہرے ہوئے تھے۔ اس وقت گرجا گھر میں نمائندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے کرسمس گیر رتی مشن میں جٹی تھیں۔ ڈھاکہ مشن کیا ڈنڈ کے انچارج ریورنڈ پال متھیو زمنو موہن بنرجی گرجا کے اندر اپنے دفتر میں بیٹھے دو ات میں نوب ڈو ڈو کرسمس کا وعظ لکھنے میں مصروف تھے۔ گرجا کے عقب میں ان کا مکان جو "بلی کالج" کہلاتا تھا۔ عبادوں کا آخری روتوں اور مصنوعی ستاروں سے سجایا جا رہا تھا۔ مسز بنرجی کچن میں فرش پر بیٹھی کرسمس کیک اور کرسمس پڈنگ کے لئے خشک میوہ صاف کرنے میں مہمک تھیں۔ باہر باغ میں باشا کے سائباں کے نیچے یکپا ڈنڈ کی عورتیں اور لڑکے بالے سب بل کرتا سا اصطلح تیار کرنے میں لگے تھے۔ ولاد سوس کے ٹیبو کے لئے حضرت مریم، سینٹ جوزف، جرداہوں اور سبل کا ڈیو کی کئی کئی صورتیاں منواری جاری تھیں۔ ریڈ کا بوا یعنی یسوع مسیح بڑی احتیاط سے بھوسے کے نچھے سے ڈھیر پر رکھ دیا گیا تھا۔ اچانک گرجا کے دل میں بلدیاد مشن کی ٹولی نے اونچی باویک آوازیں ایک پنجابی حمد شروع کر دی۔

ربہر خدو بادشاہ ہے۔۔۔ اوجلال دایادشاہ ہے۔۔۔ لے خداوند۔۔۔ اپنی راہ اپنے بندے نوئی

وگھا۔ آ۔ آ

پادری بنرجی نے اپنے دفتر میں وعظ لکھتے لکھتے قلم ایک طرف رکھ دیا اور عینک ہاتھ پر

چڑھا کر چھت کو دیکھنے لگے۔ لمارپوں میں مشن کے جسٹا اور موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی سیاہ صلیب آویزاں تھی۔ میز پر بھولوں سے بھرا لگڈان رکھا تھا۔ باہر سے کانوں اور ہارمونیم اوزن بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ بڑا پرسکون اور سہانا وقت تھا۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ڈرنے والے، نیک دل پادری بنرجی نے آنکھیں بند کیں اور زندگی کی نعمتوں کے لئے خدا باپ کا شکر ادا کیا۔ پھر انھوں نے اللہ کر الماری میں سے ایک رجسٹر نکالا اور دماغ کے کاغذات ایک طرف رکھ کر مشنری کانفرنس میں پیش کرنے کے لئے رپورٹ مکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ پچھلے چند برسوں میں ہتھمہ لینے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی تھی بہت عرصے سے قحط نہیں پڑا تھا۔ اور ہندو تجدیدیت اور مسلم تجدیدیت نے الگ الگ ادھم مچا رکھی تھی۔ مسلمان توحیر لویوں بھی شاذ و نادر ہی عیسائی ہوتے تھے۔ یہ بھی بڑی ہتیلی اور غول پسند قوم تھی۔

پچھلی صدی میں سیرام پور مشن نے کلکتہ میں بڑا عہد آفریں کام کیا تھا۔ وہ جغادری، دھن کے پکے عظیم مشنریوں کا دور تھا۔ لیشپ ریجنالڈ، ٹھہر۔ ولیم شیس۔ کیری اور مارش یمن۔ ان لوگوں نے اس دس کی کتنی خدمت کی۔ برس کھولے۔ کتابیں چھاپیں۔ تعلیم پھیلائی۔

جواں مرگ لیشپ میسر پادری بنرجی کا محبوب کردار تھا۔ وہ انگلستان سے آیا ہوا روحوں کا جیالا رکھو والا، جو اسی سنہرے جنگل کی دھرتی پر گھوما تھا۔ رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے پادری بنرجی کو دفعتاً خیال آیا کہ وہ کرسس کے دماغ میں لیشپ میسر کی مختصر لیکن درخشندہ زندگی کی مثال پیش کریں۔ انھوں نے جنگل میں تحریر شدہ اپنے دماغ کے کاغذات اپنی طرف سرکا کر دوبارہ لکھنا شروع کیا۔ ”وہ مبارک زمانہ جب آج سے سو اسی سال قبل، مادر کلیسا کا لاڈلا سپوت پرنس نفیس ڈھا کے آیا تھا۔ وہ جواں سال، خوبصورت، پادری شاعر پدما کے کنارے کنارے ٹہل کر، میرے کچھ، ہماری روحانی نجات کی دعائیں مانگتا تھا۔ اور ہمارے غم میں گھلتا تھا۔“

پادری بنرجی نے اٹھ کر ایک اونچی الماری میں سے ”میر ذرات اور انڈین ایمپائر“ نکالی۔ لیشپ میسر کا باب کھولا۔ اور اس شاعر پادری کی تحریر کا ایک اقیاس پڑھنے لگے۔ ”دریا کے کنارے سے بندھا میری نا۔۔۔ رات میں مہکنے والے بھول۔۔۔ تازہ کے تپوں کی مدھم مہر سہرا ہٹ۔ کوئل کی پکار بانس کے تاریک جنگلوں میں بگمگانے جگنو۔۔۔ عظیم دریا کی سطح پر منعکس استوائی چاند۔۔۔“

اور میں نے محسوس کیا کہ اس دہلی میں موجود ہونا بہت خوب ہے۔

پادری بنرجی نے ورق اٹھا۔ اور ان کی نظر لٹپ لٹپ مہیر کی ایک نظم پر پڑی۔ "اپنی بیوی سے۔"

اگر تم میرے ساتھ ہو

تو سر سبز بنگال کے آندکان میں

شام کا اندھیرا جڑی تیزی سے چھا جائے

پادری بنرجی نے کتاب ایک طرف سرکادی اور بھودوں پر انگلیاں رکھ کر انھیں بند کر لیں۔

لٹپ لٹپ مہیر کو بھول کر وہ یکایک دور شمال کے رنگ پور ضلع میں اپنے دور افتادہ گاؤں پہنچ گئے تھے۔ جہاں بانس کے جھنڈ میں چھپے کالی کے مندر کے پیچھے کوئٹلیں چلا رہی تھیں۔ امدان کی پڑوسن اور محبوبہ شونا ان کی ماں کے ساتھ پوجا کے لئے مندر آتی تھی اور وہ سامنے دریا پر اپنے نوکے میں چھپے اس کے منتظر رہتے تھے۔

وہ وقت اور یہ آج کی رات۔۔۔ یہ مطمئن برصغیر ہوا۔ یہ محفوظ خانہ خدا۔ سکون قلب۔

انہوں نے پرانے خواب بھٹک کر اپنی ماں کو یاد کیا۔ نجات جس کی قسمت میں نہ تھی۔ ماں۔ تو توبت پرستی کی لگڑی میں مبتلا ہی دوسری دنیا کو چلی گئی۔ اب تیری روح اس اندھیرے میں۔ اس اندھیرے میں

جانے کہاں ہو گی۔ سب کیا ہے؟

اسرار الہی۔

پادری بنرجی پھر کام کی طرف متوجہ ہوئے۔ مگر سرمن کے الفاظ اور سالانہ رپورٹ کے اعداد و

شمار میں ان کا دل نہ لگا۔ روحوں کے اعداد و شمار۔ نجات یافتہ روحیں۔ گمشدہ روحیں۔ انہوں نے رجب فرزند

سے بند کیا اور قریب کی الماری میں سے ایک اور پرانی کتاب اپنی طرف کھینچی۔ "انگلستان میں راجہ برام سومن رائے

کے آخری ایام۔ از میری کارپنٹر" انہوں نے بے دھیانی سے ورق گردانی کرتے ہوئے غصے کے آخری صفحات کھولے

"چار قابل قدر نثر لکھے ہیں۔"

۱۔ سر جوکار چکر برتی۔ اونچی ذات کا برہمن۔ خود اپنی درخواست پر لندن میں پستہ حاصل کیا۔ لندن

یونیورسٹی سے ڈگری لینے کے بعد کلکتہ میڈیکل کالج سے وابستہ ہوا۔ ۱۸۵۵ء میں لندن واپس گیا۔ وہ پہلا نیشنل

تھا جو کہنہ کی نئی کوڈینڈ میڈیکل نروس میں شامل کیا گیا۔ ۲۔ بھولونا تھا داس۔ مورکھ ستیج کے مروجہ پرکھنے کی افواج

کا اسٹنٹ سرجن تھا۔ بعد میں ڈھاکہ کا سول سرجن بنا۔ ۳۔ دارا گنا تھا بوس۔ کنگنہ با۔ کسٹریٹھا

۱۔ گوپال چندر سیل۔

آخری نام پر بیچ کو یاد دہی ہنری مٹھک گئے۔ اور گذشتہ صدی میں مس کارینٹری لکھی ہوئی کتاب میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ رام موہن بابو دراصل عیسائی ہو گئے تھے، آہستہ سے بندکوبی یہ محض اتفاق تھا یا اسی کو ہندو کریم اور سنسکار کہتے ہیں! اور مسلمان لوشتہ تقدیر بر مسکن ہر مسم بسائی اُس حسن اتفاق کو گریس آف گاڈ کہیں گے۔

لیکن — زندگی کا دھارا اچانک، ایک دم کس طرح اپنا رخ بدل لیتا ہے۔ ایک انسان کے یہ ایک مخصوص سمت قدم اٹھانے سے اُس کی ساری آنے والی نسلوں کا مستقبل مختلف ہو جاتا ہے۔ مستقبل کیا ہے؟

اس غیر اہم، بھولے ہوئے نام ”گوپال چندر سیل“ کو دیکھو۔ یہ آج سے سو برس قبل میرے گاؤں پیدا ہوا تھا۔ وہ عیسائی ہو کر ڈاکٹری پڑھنے ولایت گیا۔ اور وطن واپس آ کر بے چارہ نوجوان رہا، ڈوب کر مر گیا۔

اور ایک روز میں، منموہن ہنرجی۔ ایک مفلس سولہ سالہ طالب علم لال منیر ماٹ سے اپنے گاؤں اہل تھا۔ جب اسٹیمبر ایک بورڈ انگریز مشنری مجھے ملا۔ اور اس نے مجھ سے میرے گاؤں کا نام پوچھا اور بڑی سرت سے بتایا کہ اسی گاؤں کے ایک قابل فخر نوجوان گوپال چندر سیل کو اس کے باپ نے بپتسمہ دیا تھا۔ فی میں نے اس نوجوان کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ (یاد دہی ہنرجی عادتاً دل میں اس انداز میں سوچنے لگے، جس رخ وہ منبر پر وعظ کہتے تھے) ہر سمیتر کے طویل سفر کے دوران اس بہریان مشنری نے پہلے صفحہ پر اپنا پتہ لکھ کر بل مقدس مجھے دی اور جب میں گاؤں پہنچا، میری ماں بستر مرگ پر پڑی تھی۔ اور دیکھو اس کے بت لے نہ اسکے۔ اور میں، جو انجیل مقدس سے بیدار شاعر ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے باپ کو بنگلہ انجیل پڑھنے کو دی۔ اور سال بعد میں، میرا باپ، چچا، بہن بھائی، سارا کنبہ رنگ بورا اس انگریز مشنری کے ہاں بیچ کر اس کے ہاتھ پر امان لے۔ چنانچہ (یاد دہی ہنرجی نے کرسی پر پہلو تپا!) اور اپنے غیر مرئی سامعین سے مخاطب رہے) ایک سچا بیٹو میں، جو آج سے مدتوں قبل موالیے اُن دیکھے اور بالواسطہ طریقہ سے میرے خاندان کے سیوغ تک پہنچنے وسیلہ بنا۔

اگر میں اس روز اس اسٹیمبر پر اس مشنری سے نہ ملتا۔ یہ کرم تھا۔؛ یا محض اندھا اتفاق —

یورڈنبرجی نے سر ملہا اودھ متیر سے بیٹھے دروازے سے باہر مشن کیا وڈ کا نظارہ کرنے لگے۔

ہندوستان کے ہر ضلع میں ایک مشن کیا وڈ موجود ہے۔ بلکہ مختلف کلیساؤں کے مختلف مشن کیا وڈ موجود ہیں۔ جس میں ڈیڑھ دو سو سال سے سفید نام مشنری خواتین سفید سائے اور سفید سولہا بیٹ سپنے پان میں بائبل لے نیشو لوگوں کی مدد عمل کو بچانے کے لئے دن رات کوشاں رہتی ہیں۔ اور کلا پادری ہندوستانی معاً کے ایک کنارے پر اپنی بائبل لے کھڑا ہے۔

شروع شروع میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مشنریوں کو ایک نیو سنس سمجھتی تھی۔ سیرام پور میں پیٹنٹ مشن کی طرف سے شائع ہونے والا انتہائی دلا ڈار لٹریچر سچے فوٹ ویم میں سنس کیا جاتا تھا۔ کہ ابھی ہندوستان میں سیمی مشن کو یونین جیک کی سرپرستی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لارڈ منٹون نے سیرام پور کے لٹریچر کے متعلق کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کے لئے بیدار اشتعال انگیز ثابت ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں سیرام پور کے مشہور مشنری ڈاکٹر ایش میں نے لکھا تھا کہ ہندوستانی انتہائی کمزور اور احمق کردار کا مالک ہے۔ اور اس کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ کسی نہ کسی غیر قوم کا محکوم رہے گا۔ اور اس کے اس بودے پن کو عیسائیت بھی دور نہیں کر سکتی۔ لیکن برطانیہ کے زیر سایہ زندگی گزارنا اس کے لئے برکت الہی کا موجب ہے۔ اس وجہ سے جو ہندو یا محمد بن عیسائی ہو جائے وہ اپنے تحفظ کی خاطر برطانیہ کا انتہائی وفادار ثابت ہوگا۔ کیونکہ محض اس ایمپائر کی سلامتی اور توسیع پر اس کے وجود کا انحصار ہے۔

سیرام پور والوں کو راجہ رام موہن رائے کی طرف سے بڑی امیدیں تھیں۔ مگر انھوں نے عیسائی ہونے کے بجائے الٹے ان سے مناظرے شروع کر دیئے کہ آخر گوڈ کو برہما ہی کیوں نہ کہا جائے؟ مشنری مارن کی روح کو بالآخر نہ بچا سکے۔

یہ انگریز مشنری۔ واقعی بہت بھولے تھے۔ بشپ ہمبرسٹ ۱۸۲۵ء میں ہندوستان کے دورے کے بعد لٹکا گئے اور کنیڈی کے شاہی محل کے دربار میں ڈیو اٹن سردس منعقد کی۔ اور ان کے ساتھی مسٹر روہنس نے اس موقع کے متعلق بعد میں لکھا۔ ”سردس کے بعد میں اور بشپ ہمبرگھر ٹوٹے اور میں نے بشپ سے کہا۔ عبادت کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ صرف چند سال قبل اسی ہال میں ایک جابر الیشیائی بادشاہ اپنی مظلوم رعایا کو درشن دتا تھا۔ اور آج اس میں ایک عیسائی بشپ بیٹھے دین کا پیغام سن رہا تھا۔“

ب میں نے یہ کہا تو بنگلہ پمیر نے سر جھکا لیا اور دوپٹے سے ۔
 ان مشنریوں نے کالے بلیغ اور پارڈی سٹار کے ۱۸۵۷ء کے بعد عیسائیت کو حکومت کا مکمل تعاون
 ہو چکا تھا۔ (انگریزوں کا عبادت خانہ ۔ گر ۔ جا ۔ بے چارے مسلمان جل کر کہتے تھے) کالا پارڈی
 راہوں اور سڑکوں پر تبلیغ کرتا پھرتا تھا۔ اور مولویوں سے مناظرے کر رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان، دیسی عیسائیوں
 کا لٹین، چریشین اور پمپلی صاحب کہہ کر خوش ہولیتے تھے۔ لیکن تبدیلی مذہب کے بعد مظلوم اچھوتوں
 رافلاس زندہ تعلیم یافتہ افراد کی زندگی بدل جاتی تھی۔ سری رام کرشن کے چیلے اور سوانح نگار ہندو راتھ
 نانے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے اسٹیکل مدھو سودن دت سے دریافت کیا کہ وہ عیسائی
 دل ہو گئے۔ تو انہوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا ۔ اس کی خاطر ۔

جھوک کے علاوہ ذہنی پختی بھی بنگال میں عیسائیت کے فروغ کی ایک وجہ تھی۔ اٹھارویں صدی میں
 نال کا اور سائے ہندوستان کا ہندو سماج تنزل کی آخری حدود تک پہنچ چکا تھا۔ رام موہن رائے نے ۱۸۲۰ء
 ، ہندو کالج قائم کیا۔ اس کے طلباء اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔ متعدد انگریزی تعلیم
 نہ برہمن خاندان عیسائی ہو گئے۔ عیسائیت ایک نافع، عقلیت پرست، حیرت انگیز، شاندار قوم کا بڑا
 قول مذہب تھا۔ نئے بنگالی مصلحین، ہندو، برہمو، عیسائی سبھی انگریز کے حامی تھے، جو اس اندھیرے
 میں تھی روشنی پھیلا رہا تھا۔ صرف بنگالی مسلمان جن کو انگریز نے کچل دیا تھا، اور جو اس کے باوجود
 اہلین کی صفوں میں شامل ہو کر اُس سے لڑے جا رہے تھے۔ انگریزی دور اور انگریزی تعلیم کے
 من تھے اور بنگال کا پسماندہ طبقہ بن چکے تھے۔

گنڈتہ یو، جمدرا لوگ، کرانی اور بالو لوگ کی ایک نئی دنیا آباد ہو چکی تھی۔ اور انگریز بنگالی بالو کالیے
 ح مذاق اڑاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ایک انگریز طنز نگار نے انڈین ایمپائر کے متعلق اپنی ایک
 باب ”سر علی بابا کا سفر نامہ“ میں لکھا تھا، ”ہم بالو ازم کو ایمپائر میں گناہی فردغ دیں۔ بالو کے وجود
 ہیں۔ آنسو بہانا چاہئیں کہ بالو ایک سخت قابلِ رحم شے ہے۔ یہ بالو نئے مذہب، نئی موسیقی، آرٹ
 رسائٹنس سے خوب پیٹ بھر کر جڑے گا تو ایسی دولتیں بھڑے گا کہ ہم اس کا مذاق اڑانا سبوں
 ایں گے۔ اس کے پیٹ لیدر جوتے، اس کی ریشمی چھتری۔ اس کے دس ہزار ہارس پاور کے انگریزی الفاظ
 بر جملے۔ اس کی مغربی خیالات کی جگالی۔ یہ سب ایک روز بے حد خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں

سائنس، مغربی فلسفے اور مشنریوں نے اس کے دماغ کو اتنا چکا چوند کر دیا ہے کہ اب اس کا اپنی پرانی حیثیت پر واپس جانا مشکل ہے۔“

”سر علی بابا کے سفر نامے“ کا یہ مضمون پادری بنرجی کو ایک مرتبہ ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری نے اپنے کتب خانے کی ایک الماری میں سے نکال کر دکھلایا تھا۔

”یہ دیکھئے بنرجی بابو۔ ہمارا صاحب بیاد رہیم ہندو ستانیوں کا کس بے پناہ حقارت سے ذکر کرتا ہے۔“ نواب صاحب نے کہا تھا۔

ارجمند منزل —

پادری بنرجی ارجمند منزل میں سیاسی بحث مباحثے سے ہمیشہ احتراز کرتے تھے لیکن جب کبھی وہاں جاتے ڈرائنگ روم میں مسلم لیگ اور صوبائی سیاست کا تذکرہ چھڑا لیتا، اور دیورنڈ بنرجی چپکے بیٹھے سنا کرتے۔ ارجمند منزل ڈھاکے کی پرانی مسلم تہذیب، لادو شاعری، تفسیر، راگ رنگ کے جلسوں، قدامت پرستی اور مسلم سیاست کا مرکز تھی۔ اور پادری بنرجی کو مسلم سیاست یا ہندو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صدق دل سے انگریزی حکومت کے وفادار تھے۔

ارجمند منزل — یہ بھی کیا اتفاق تھا کہ ان کی قابل قدر لائق احترام اور نیک بخت بیوی ایشور ان کو ارجمند منزل کے وسیلے سے ملی۔ خداوند خدا کے وسیلوں کے اسرار کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

نواب قمر الزماں چودھری ضلع فریدپور کے زمیندار تھے۔ اور گری باالاجٹھو یادھیائے ان کے علاقے کے ایک غریب برہمن کی لڑکی بچی لہذا پانچ برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر تک اس نے سسرال میں ہر طرح کے ظلم سہہ! اور ایک رات چپکے سے نڈوں میں بیٹھ کر ڈھاکے بھاگ آئی اور ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمر الزماں کی والدہ بیگم نور الزماں سے فریاد ہوئی۔ بڑی بیگم صاحبہ نے اسے فوراً اپنی پناہ میں لیا اور کچھ عرصے تک اسے ارجمند منزل کے نانا خانے میں رکھا۔ جب نوجوان نواب زادوں نے اس میں دلچسپی لینا شروع کی تو بیگم صاحبہ نے سوچا کہ کلمہ پڑھا کر زمینداری کے کسی اہلکار کے ساتھ اس کا نکاح کروادیں۔ مگر تقسیم بنگالہ کے بعد ہندو مسلم تعلقات بیکار شدہ ہو چکے تھے! اور گری بالاکے تبدیلی مذہب سے فوراً فرقہ وارانہ فساد کا خدشہ تھا۔ اگو یہ بات بیگم صاحبہ نے سمجھی کہ عیسائی ہو جانے پر ہندو عیسائی فساد نہیں ہوتے تھے! اس موقع پر ڈھاکے کے انگریز بڑے پادری رائٹ ریورنڈ البرٹ براؤن کی میم آؤٹ

اُبیں۔ مہم صاحب بیعت میں دو مرتبہ نواب زادلوں کو انگریزی چڑھانے ارجمند منزل آیا کرتی تھیں۔ جڑی بیگم نے گرمی بہا
 تو مہم صاحب کے ذریعہ اُن کے مشن اسکول میں داخل کروادیا۔ بڑے پادری وافر ڈبرائن صاحب نے اُسے
 پتہ سمجھ دے کر اپنی بیوی کے نام پر اس کا نام ایسٹھ میرین رکھا اور جب اس نے میٹرک کر لیا تو اس کی شادی پل
 یسٹیو جن موہن بنرجی سے کر دی۔ پال بنرجی ایسٹھ سے عمر میں بیس برس بڑے تھے۔ مگر ایسٹھ بے حد خوش تھی کیونکہ
 اسے عمر میں پہلی بار عزت اور آرام ملا تھا لہذا ایسا شریف شوہر۔

رنگ پور میں پتہ سمجھ لینے کے بعد من موہن بنرجی ایک ہونہار مبلغ ثابت ہوئے تھے اور انھیں
 مشن کی طرف سے برٹش اینڈ فنان بائیل سوسائٹی میں ٹریننگ کے لئے لندن بھیجا گیا تھا۔ اور واپس آکر
 وہ صوبے کے مختلف دیسی پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں کیوریٹ رہے تھے اور اب ڈھاکہ میں اس دیسی گرجا
 کے پادری تھے۔

ریورنڈ بنرجی نے کھڑکی کے شیشے میں اپنا عکس دیکھا۔ شمالی بنگال کے ایک گاؤں کا وہ سورسالہ
 برہمن لڑکا۔ گھسا ہوا سیاہ کوٹ چٹلون پہنے، بغیر فریم کی عینک لگائے، سنجیدہ، نوجوان مبلغ۔ جو کبھی اپنی
 سائیکل پر مسلمان بستیوں کی طرف نکل جاتا تو لوٹنے سے اس کے پیچھے دوڑ کر تائیاں بجاتے اور وہ یسوع
 کا خاطر یہ سب ذلتیں سہتا۔ اور آج، ۲۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کی رات، ڈھاکہ چرچ کا یہ بزرگ پادری
 ۔ خداوند خدا کی برکتوں کا مشکور پال میسٹیو بنرجی۔ راستہ طے کرتے کرتے ایک وقت
 ایسا آتا ہے، جب انسان پیچھے مڑ کر اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہے! اور اپنے ماضی کو سکھ اور دکھ کے ترازو
 تو لتا ہے اور کتنے لوگ ہیں، جن کے ہاں سکھ کا پلاٹا بھاری ہو؟

ریورنڈ بنرجی نے عینک اتار کر پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ خداوند خدا نے مجھے کیا کچھ نعمتیں
 نہیں دیں۔ ایک سعادت مند گلہ۔ ایک محبت شعار بیوی۔ ایک پیاری اور فرماں بردار بیٹی۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر دوبارہ قلم اٹھایا اور نوب دوات میں ڈبو کر کرسمس کا وعظ
 لکھنا شروع کر دیا۔

پادری بنرجی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی روزی ملی کاٹج کے سٹنگ روم میں بیٹھی مریم کی سورتی کیسے
 تھی سی نیلی ساندی پر سچا لپو کا ٹانگ رہی تھی۔ جو وہ کالج سے لوٹتے میں جہاں آرا کے گھسے لہجی آئی تھی کہ

ارجنڈ منزل کے زنا خانے کی الماریوں میں سچے گوٹے لچکے کی افراط تھی۔ یوں وہ ارجنڈ منزل بہت کم جاتی تھی۔ وہ جہاں آرا کی بڑی پکی سہیلی تھی۔ مگر جب سے وہ بڑی ہوئی تھی اور اس کی ایک پھوپھی نے اُسے اس کی ماں کی زندگی کی داستان سنائی تھی اُسے ارجنڈ منزل جاتے ہوئے تھینپ سی آتی تھی۔ جہاں آرا نے کبھی اس سے اس داستان کا ذکر نہیں کیا تھا اور وضعداری کی وجہ سے کالج میں بھی اس نے مذہبی کی ماں کا وہ المناک پس منظر کس کو نہیں بتایا۔ اس کے باوجود روزی کولا شمنوری طور پر لڑکھوں اور زمینداروں کے مسلمان معاشرے اور قدیم وحشیانہ رسوم سے جکڑے تنگ نظر ہندو سماج سے نفرت تھی۔ ساتھ ہی اسے اپنے دیسی عیسائی طبقے کی مضحکہ خیز حیثیت کا بھی خاصا احساس تھا۔ ہندو سماج نے اُس کی بھولی ماں کو تین سال کی عمر میں سیاہ کر اور پانچ سال کی عمر میں بل و دھوا بنا کر اس پر ظلم توڑے تھے۔ مسلمان زمینداروں کے لوہڑوں نے بھی خود جہاں آرا کے باپ اور چچاؤں نے اس کی بے سہارا ماں کو اپنا کھلونا بنا چاہا تھا۔ لیکن اس کے برعکس عیسائی سوسائٹی نے اُس کی ماں کو عزت، تعلیم و تربیت اور گھر عطا کیا تھا۔ ان سارے آپس میں اُلجھے ہوئے حقائق کے باوجود بیس سلاحتاس اور ذہین معذی بنجری خدباتی اور ذہنی طور پر خود کو ایک دورا ہے پر موجود پارہی تھی۔ وہ خود کو خالص ہندوستانی کلچر اور قومی سیاسی علم سے مماثل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کا عیسائی سماج انگریز کا تخلیق کردہ تھا اور انگریز کا نمک حلال تھا۔ اور یہ بات وہ اپنے شیفتی اور نیک طینت باپ سے کسی طرح نہ کہہ سکتی تھی۔ کسی سے نہ کہہ سکتی تھی اور اس کی ماں ایستھری بلا بنجری عیسائی ہونے کے باوجود ایک خالص بنگالی تھی جتنا گھریلو عورت تھی۔ جسے ان مسائل سے کوئی پوچھی نہ تھی۔

تبدیلی مذہب کے باوجود جنوبی ہند کے عیسائیوں کی مانند بنگالی عیسائیوں پر بھی اپنے صوبے کی کلچر کا گہرا اثر باقی تھا۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں سسرانی عورتیں بنگال کی بیشتر زمین اور زرعی زمینوں کی عیسائی خواتین کی طرح مانگ میں سینڈور لگاتی تھیں اور مذہبی رسوم کے علاوہ ساری پرانی ریت و رسوم کی پابند تھیں۔ مذہبی اسکول کی اٹھویں کلاس سے دیپالی سرکار کی ہم جماعت تھی۔ بڑی ہوئے پڑھنے کے گھنٹوں میں درختوں کے نیچے بیٹھ کر وہ سینئر لڑکیوں سے سیاسی گفتگو سنتی۔ تحریک آزادی کا ہر طرف چرچا تھا۔ بہت سی باتیں ابھی پڑنے نہیں پڑتی تھیں لیکن بنگال انقلابی تحریک کا پرانا گروہ تھا۔ اور ان نوعمر لڑکیوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ انگریز کو مارا کر بھوسہ بھر کے دیس سے نکال دو۔

برائی دہشت پسند پارٹی انوشیلین کے میڈ کوارٹرز بردوان ضلع سے آئی ہوئی ابانی اپنے ماں باپ سے
 سنے ہوئے اور بند و گھوش اور سوامی ودیکانند کے انقلابی بھائی بھو بند رت کے قہقہے چھیڑتی۔ اس صدمہ
 کے شروع میں ہندوستانی انقلابی آرگنائزنگ کے SIN FEIN روس کے سوشل ڈیموکریٹس اور رینزی
 کے ٹینگ اٹلی سے متاثر ہوئے تھے۔ جنہوں نے اسی زمانے میں تہسکہ مچا رکھا تھا۔ وہ ڈبلیو بی ایس کا آرگنائزنگ
 — ایس جو اپنے ملک کی آزادی کا نقیب تھا اور ساتھ ہی عارفانہ نظمیں لکھتا تھا۔ اور جو ہندوستانی
 روحانیت کا مداح تھا۔ ویرکانند۔ میگور۔ ایس۔ وہ بھی کیا نہ تھے۔ رو میننگ اور ولولہ
 خیز اور دلکش۔ روزی ان سب باتوں کو سن کر سوچا کرتی۔ اور ۱۹۰۹ء کے ان انقلابیوں نے
 لیفٹسٹ گورنر کو مارنے کے ارادے سے ریلوے لائن پر ایک چھوڑتین تین بار بار دھچکائی تھی۔ اور علی پور
 سازش شروع ہوئی تھی۔ اور سی۔ کہ واس نے اور بند و گھوش کا مقدمہ چلا دیا تھا۔ اور اسی وقت برین گھوش
 نے کہا تھا۔ ہم انگریزوں کو مار کر آزادی حاصل کرنے کے خواب نہیں دیکھ رہے۔ ہم صرف یثابت کرنا چاہتے
 ہیں کہ ہم میں مارنے اور مرنے کی ہمت ہے۔ یورپ میں ہندوستانی طلباء نے انقلابی گروہ بنائے
 تھے۔ سکھ کسانوں نے امریکہ اور کینیڈا میں ہند پارٹی قائم کی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سرکرزن ولی کو جو ہندوستان
 کے خلاف قانون بنا رہا تھا۔ لندن میں ایک ہندوستانی طالب علم مدن لال نے گولی کا نشانہ بن لایا تھا
 اور پھانسی پر چڑھا تھا۔ دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا گیا تھا اور چار نوجوان دار بھائی تھے۔
 آج سے پچیس سال پہلے مغربی سامراجیوں نے آپس میں اسی طرح کی ایک بھیا تک جنگ مڑی تھی۔ اور
 اس زمانے میں ہندوستانی انقلابیوں نے برین کیٹی بنائی تھی۔ جس میں سر ڈی دیوی کے بھائی ویریندر
 چٹوپادھیائے، اور راجہ ہندر پرتاپ اور بھو بند رتا تھ دت اور سن سنگھ اور برکت اللہ اور چپکے من
 پلے اور ایم۔ ایچ۔ شامل تھے۔ بنگالی۔ پنجابی۔ مدراسی۔ ہندو۔ مسلمان۔ سکھ۔ کون کتا ہے کہ ہندوستانی
 قوم متحد نہیں ہو سکتی۔ اور غنڈ پارٹی کے اراکین لہر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ اور ۲۲ فروری ۱۹۱۵ء
 غنڈ کی تاریخ مقرر ہوئی تھی اور فوجی پچاسی یو۔ پی اور پنجاب میں غنڈ شروع کرنے والے تھے جب کسی
 میر جعفر نے پھر حکومت سے غبری کر دی۔ پھر سینکڑوں کو پھانسی لگی۔ سینکڑوں کالے پانی گئے۔
 عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد ۱۹۲۲ء میں تشدد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی۔
 اور پچاسی کی کوٹھڑیاں آباد ہوئیں۔ یو۔ پی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اور اشفاق اللہ

اور اس کے ساتھی پھانسی پر چڑھے۔ آندھڑ میں الوری سیتا رام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے تھے پھر اور مارے گئے۔ مردار گھٹ سگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی حکومت قائم کرنا ہے اور پھانسی پر چڑھے۔ ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر آلہ آباد میں پولیس سے لڑے اور مارے گئے۔ چالنگام میں ۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء کو آئرلینڈ کے ایئر سٹنڈے کی طرح کی معرکہ آرائی ہوئی اور انقلابیوں کی نئی "نوجوان ترک پارٹی" جگانتنتر نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور جگانتنتر کے لیڈر سعید سین اور ان کے ساتھی جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مشین گنوں سے شہید ہو گئے۔ نوجوان کلینڈات کو قید کر لیا گیا اور کالج گریجویٹ برقی تار چالنگام کے یورپین کلب پر مسلح حملے کی قیادت کرتی ہوئی بڑھی گئی اور پولیس نے قبضہ میں آنے سے پہلے اس نے خودکشی کر لی۔ نوجوان شاشتی دی اور ممتی دی کو کومیل کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پستول کاٹھ نہ ماننے کی سزا میں کالے پانی بھجوا دیا گیا۔ کماری مینا داس نے بنگال کے گورنر پر گولی چلا دی۔

چند سال قبل ہی کی بات ہے کہ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس، انسپکٹر جنرل آن پرز نزا اور سیشن جج علی پور سب کو موٹ کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ ضلع مدنا پور کے تین انگریز جج ایک کے بعد ایک مارے جا چکے تھے۔ یورپین ایسوسی ایشن کے پریذیڈنٹ، اسٹیشن کے ایڈیٹر اور سرچائرس ہنگارٹ پر قاتلانہ حملے ان سوس کا نام رہے تھے۔

جگانتنتر کا ہیڈ کوارٹرز چالنگام کے نزدیک دھول گھاٹ میں آج بھی موجود تھا۔ سویریہ سین، یعنی ماسٹروا آج بھی بنگال کے ہیرو تھے۔ خودی رام باسوسے لے کر دیپالی کے چچا دیش چندر سرکار کے زمانے تک ملک میں پھانسیوں کے سیاہ درختوں کا کتنا بھیانک جنگل کھڑا تھا، جس کے ایک طرف کالا پانی تھا اور دوسری طرف اونچے قید خانے۔ اور یہ سارے انقلابی نوجوان بنگال کے ہیرو تھے۔ بھدرالوگ۔! متوسط ہنڈ بنگالی طبقے نے ایسے ایسے بہادر نوجوان پیدا کئے تھے! بھدرالوگ۔!! اور روزی سوچا کرتی کیا میں کلپنا دت۔ پرتی تار شاشتی۔ سمیتی اور مینا داس جیسی ہیروئن نہیں بن سکتی؟ کچھلے چند برسوں میں سارے دہشت پسند انقلابی کمیونسٹ ہو گئے تھے۔ اور اب کالج میں لڑکیاں ان نئے انقلابیوں کا تذکرہ کرتیں۔ رحمان الدین احمد اور اکٹھے مکر جی اور اوداماراع۔ لڑکیوں کے دل دماغ میں ماسٹروا کی جگہ اب رحمان الدین احمد لے چکے تھے۔

سال بھر قبل دیپالی نے بڑے مضطرب لہجے میں روزی سے کہا تھا۔ روزی۔ سنو تو۔

کہاں ایک خفیہ اسٹڈی سرکل میں گئی تھی۔ اب کے سے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ وہاں بہت اچھی اچھی باتیں

معلوم ہوتی ہیں۔ " روزی چپ رہی تو دیپالی نے کہا تھا۔ سلپے پاپا سے کہہ دینا میرے گھر جا رہی ہو۔ کالج کی پڑھائی کرنے۔ "

آئندہ اتوار کو روزی دیپالی کے ہمراہ پرانا پٹن کے اس پرائمری اسکول میں گئی۔ اور چند ہفتوں بعد یہی الا تو ای اشتراکی تحریک کی جڑی سخت حامی ہو گئی تھی۔ خود اپنے وجود کے متعلق بہت سے پریشان کن سوالوں کا جواب اُسے مل گیا تھا۔ یہی بات یہ تھی کہ برطانیہ کی اقتصادی بالادستی کی وجہ سے جب ملک میں قحط پڑتا تھا اور کساد بازاری چھاتی تھی اور بے روزگاری پھیلتی تھی تو مشنری لوگ بھوکے منہ کے بندوستانوں کو عیسائی بنالیتے تھے۔ پھر اس ستمبر میں جنگ چھڑی تو اسٹڈی سرکل میں اکتے دانے روزی کو سمجھایا کہ مغربی سامراجیوں کی اس جنگ کو ہندوستان میں خاندان جگلی میں تبدیل کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ سُرخ انقلاب فی الغور آسکے۔ اب ہم اس تھنک کے حصول کے لئے کام کریں گے اور اس جنگ کے خلاف اور خاندان جگلی کے پرچار کی خاطر خفیہ طور پر لہجہ چھاپ کر دستاویز تقسیم کریں گے۔ روزی اس مجوزی خاندان جگلی کے لئے بھی بخوشی تیار ہو گئی تھی۔

ہادی منجھی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ روزی اتوار کے بعد کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ کہہ دو بھائی روزی تم نے شہر کے ایک محلے میں سنڈے اسکول کھولا ہے۔ پچھلی مرتبہ اکتے نے ہنس کر اس سے کہا تھا۔

لیکن اب چند روز قبل وہ خفیہ اسٹڈی سرکل ٹوٹ گیا۔ ساتھیوں کے ہل میں انڈر گراؤ ڈب بھونکے۔ دیپالی بید خانوش رہنے لگی۔ اب وہ روزی کو کچھ بتاتی تھی۔ شاید یہ لوگ بھڑ پر پوری طرح بھروسہ نہیں کرتے۔ کیونکہ میرا سارا خاندان انگریزوں کا پروردہ ہے۔ ڈھاکا موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ولیم کینٹ ویل پاپا کو بید مانتا ہے۔ مینر کینٹ ویل بھی کبھی کبھی لٹی کالج آتی رہتی ہیں۔ میں ساتھیوں پر کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ میں برسوں راج کی دفا دار نہیں ہوں۔ شاید وہ یہی سمجھتے ہوں کہ میں ان کی مخبری کر دوں گی۔ روزی کو پچھلے روز سے اندازہ تھا کہ دیپالی کے پاس انڈر گراؤ ڈب سے اہم پیغام آ رہے ہیں۔ مگر دیپالی نے اس سلسلے میں بالکل چپ سا دھر رکھی تھی۔

حضرت مریم کی ساری پرلچکاٹاٹانک کردار سلنی ستائے کا منسا سماج بنا کر روزی ایک لمبا سانس لے کر کوچ پر سے اٹھی۔ اور مثال لیٹ کر باہر مہن میں آگئی۔ ساتباں کے، اندھیلو تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ روزی در میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کہاؤنڈکی غریب بنگالی عیسائی عورتیں کتنی شردھلے مورتیاں سجائے ہیں مہنک ہتھیں اندر جا کر اس نے مریم کی مودنی کو کپڑے پہنائے اور تاج سر پر رکھا۔ اور نکلیت اس نے سوچا۔ اس ساتباں اور ڈرگا پوجا کے پنڈال میں کیا فرق ہے ہاں غریب عورتوں کے لئے کیا مریم بھی لاشعوری طور پر ڈرگا کی ماتا ایک ادیبی

نہیں؛ اور کیا ہم عیسائی لوگ بت پرستی نہیں کرتے؟ پھر ہندو کافر اور گمراہ کیوں ہیں؛ اگر خدا فاختہ کا روپ
دھار کر دنیا میں آسکتا ہے تو کچھوے اور مچھلی میں اوتار کیوں نہیں لے سکتا، میسے بے چارے پاپا۔ ہائے
یرے پیارے بیچارے بوڑھے پاپا۔ تم نے ساری زندگی ان بے معنی بحثوں میں کیوں لٹائے کی؟ فاختہ اور
روح القدس۔!

وہ لیکنا ایک سید دل گرفتہ ہو کر آہستہ آہستہ قدم رکھتی گرجا گھر کی طرف بڑھی اور ہاں میں جھانکنے لگی۔
ہاں کے ایک کونے میں پنجابی ٹوٹا زرد نود سے گا رہی تھی۔

رب خداوند بادشاہ اے۔ اور جلال دابادشاہ اے
اُچے کرو سر جان جلال دابادشاہ آوے۔

وہ دبے پاؤں اندر پہنچی۔ لادھیانڈ مشن کے پادری ریونڈ ہنری بسواس کا نوجوان بیٹا مسٹر لوتھر بسواس
بڈل دالے ہارمونیم پر بیٹھا تندی سے حمد کی سنگت کر رہا تھا۔

”اے خداوند اپنی راہ اپنے بندے کو چلے دکھا۔ آ۔ آ۔ روزی کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر مسٹر لوتھر بسواس
برالراٹھ کھڑے ہوئے۔ کبھی منڈلی بھی چپ ہو گئی۔ چند لڑکیاں سفید شلواریں، سرخ سوئیڈ اور سفید
بپٹوں میں ملبوس شرمناک رہی کبھی ہنس پڑیں۔

مسٹر لوتھر بسواس ذرا عجب نیپ کر مسکراتے ہوئے روزی کو دیکھنے لگے۔

یہ لوگ سب کسی دوسری دنیا کے باشندے تھے۔ روزی، اخلاق مسکرائی۔ سوری۔ میں نے آپ کو
کی پریکٹس کو ڈسٹرب کر دیا۔ پلیز کیری آؤن۔“

”آپ۔ آپ۔ آپ بیٹھیں ناروزی۔ مسٹر۔“ ایک پنجابی لڑکی نے کہا۔
”نہیں بھئی۔ مجھے ابھی بہت کام کرنا ہے۔ گڈ نائٹ۔“

مسٹر لوتھر بسواس کے سامنے مسکرا کر سر زرا سے خم کرتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ اور دوازے پر
پرچ کر اس نے محسوس کیا کہ گو بھین منڈلی نے دوبارہ کانٹا شروع کر دیا تھا۔ لیکن مسٹر لوتھر بسواس کی زردیدہ
نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور وہ بے طرح شرم رہے ہیں۔

ادامانی گاڈ۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور عمارت کا چکر لگا کر پادری ہنری کے دفتر کی کھڑکی
کے نیچے پہنچی اور اندر جھانک کر دیکھا۔ پاپا عینک ناک کی لوک پر رکھے میز پر جھکے ٹیپ کی روشنی میں تندی سے

دعا لکھے میں معدت تھے۔ لے اپنے بوڑھے باپ پر بے اختیار پیارا گیا۔ خدایا ان کو زندہ رکھ۔ خدایا ان کو میرے سر پر زندہ سلامت رکھ۔ اس نے دعا مانگی! در دروازے کی طرف جا کر چپکے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

قلم سرعت سے چل رہا تھا۔ سر۔ سر۔ سر۔

روزی کرسی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ اور جھانک کر پڑھنا چاہا۔ اور دل میں مسکرائی۔ گڈ اولڈ پاپا۔

پاپا اور ان کے سالانہ کرسمس سرمن۔

”کفارے کی نسبت جو ہمارے خداوند یسوع نے اے لوگوں تمہارے لئے کیا۔ اُس نے جان

کھوئی کہ تم اس کو دوبارہ حاصل کرو۔ گیہوں کا دانا جو مرنے کے بعد۔“ قلم کی رفتار تیز ہو گئی۔ ”وہ ہے جو

یسوع پر ایمان لائے۔ خداوند تیری برکت تیرے بندوں پر ہے۔ دے روح القدس میں غوطہ دلائے جاؤں گے

کہ وہ جو ہمارے لئے مٹوا اور بدخون ہوا۔ اور جی انسا اور وہ خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا، جو ہماری تمہاری ہی خاطر

صلیب پر لٹک گیا۔ اس کا مبارک یوم ولادت منانے ہم آج جمع ہوتے ہیں اور اس خداوند خدا کا لاکھ لاکھ

شکر ہے کہ ہم اس ملک میں امن و امان کی حکومت کے زیر سایہ۔“

”دیدنی۔“ کھڑکی کے نیچے سے کپاؤنڈ کے ایک بچے نے اُسے آہستہ سے پکارا۔ وہ سرعت سے

باہر نکلی۔ بچے نے اس سے کہا۔ ”بھانگ پر یہ بڑی کالی موٹر کھڑی ہے۔ اس میں دیپالی دیدنی بیٹھی ہیں۔

آپ کو جبار ہی ہیں۔ ایک دم جلدی۔“

”دیپالی موٹر میں بیٹھی ہے؟“ روزنی نے حیرت سے دُہرایا اور چاروں طرف نظر ڈال کر تیزی

سے بھاگی۔

اومارنے کی موٹر اندھیرے رنگ کے نیچے کھڑی تھی۔

”روزنی۔ تمہارے ہاں تو بڑا بنگامہ ہے۔“ دیپالی سرکار نے کار کی کھڑکی میں سے جھانک کر گھبراتے

ہوئے کہا۔

”ہاں۔ فکر مت کرو۔ کیا بات ہے؟“

”بے حد میریس۔ تم کئی سے میرے گھر پہنچ جاؤ۔ وقت بالکل نہیں ہے اور بالکل خاموش

رہو۔ ٹوپ سیکرٹ۔ گڈ نائٹ۔“ دیپالی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ کارزن سے آگے چلی گئی۔

روزنی چپ چاپ اور متفکر بھانگ کے اندر دیکھیں آئی اور کنکر لیں کو پیروں سے ٹکراتے ٹکراتے

ہی کاٹج کی سمحت روانہ ہو گئی۔ سانسے گر جا گھر میں سے پنجابی ٹولی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

اسے خداوند میرا دل اک پاسے کر۔ تاں میں رکھاں تیرا ڈر۔

ادب اب تو تھر بسواس کی بھاری آواز حمد میں شامل ہوئی۔ ہارمونیم زور زور سے بجنے لگا۔

تھی گاڈ تشنا۔ گاڈ۔ تشنا تھی رب دی۔ سچیاں دی ٹولی وچ دل نال گاواں۔ تشنا سناواں

رب دی۔ رب خداوند بادشاہ لے۔ او جلالی دابا دشاہ لے۔ اے خداوند اپنی راہ اپنے بندوں نول

دکھا۔ آ۔ آ۔ آ۔

۷

نیا عہد نامہ

چند رکج کے کوٹھے والے سائبان میں کھڑی دیپالی سسکار صبح کے ناشتہ کے بعد سے روزی کا انتظار کر

رہی تھی۔ دھڑسٹک کے موڑ پر روزی کی سائیکل آتے دیکھ کر وہ تیزی سے نیچے اتری اور میٹک خانے کا دروازہ

کھولا۔ جوں ہی روزی اندر آئی دیپالی نے اسے اپنے کمرے میں لے جا کر جھٹ پٹ دروازہ بند کیا اور چٹخنی لگادی۔

اور بڑے ڈنڈا لائی انداز سے الماری پر سے بائبل مٹا کر (جو ایک مرتبہ پارٹی میز چینی نے اسے دی تھی) روزی کے ہاتھ

میں ٹھونس دی۔

”آنکھیں بند کرو روزی۔“

حیران و پریشان روزی نے آنکھیں بند کیں۔

”کہو۔ ملک و قوم کی خاطر حلف اٹھاتی ہوں۔ گوڈی فارو۔ گوڈی سن اور گوڈی

ہولی گوسٹ کے نام پر۔“

روزی نے ایک آنکھ کھولی۔ ”مس پیڈلے نے پرسوں ہی بتلایا ہے کہ صحیح تلفظ گوسٹ

نیں گوسٹ ہے۔“

”اچھا۔ اچھا۔ ہولی گوسٹ کے نام پر۔ چلو۔ بو تو۔“

روزی نے دونوں آنکھیں کھولی لیں اور ششک کر کہا۔ ”دیپالی۔ میرے پاپا پر تو کوئی آفت نہیں

آئے گی؟ وہ بہت بوڑھے ہیں۔“

دیپالی چپ ہو گئی۔ اسے بھی کچھ معلوم نہ تھا۔ ”میں۔ میں مستقبل کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ روزی۔ مگر۔ مگر تم سبھی ہندوستانی ہو کہ نہیں۔“ اس نے لمحہ بھر کے بعد کہا

”ہاں۔“ (میں کالمین نیٹو کر سچین سچی ہندوستانی ہوں۔ اس نے دل میں تلخی سے کہا۔ پھر اس نے فوراً اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اس خود رجمی کی کیا ضرورت ہے۔ تحریک آزادی میں ان گنت عیسائی شامل ہیں۔ ایک سے ایک بڑے محبت وطن۔ حب وطن کیا کسی ایک ہی فرقے کی میراث ہے؟ اس واقعے میں دیپالی سانس روکے توقع نظروں سے روزی کو دیکھے جا رہی تھی۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو۔؟ تو کیا ہوگا۔؟ دیپالی کو محسوس ہوا جیسے ہندوستان کا سارا مستقبل اس وقت محض روزی بنرجی کے ہاں یا نہ کرنے پر منحصر ہے۔ دیپالی کو کچھ سی محسوس ہوئی۔ اتنے میں روزی نے فرش پر دوڑنا تو بیٹھ کر زیر ب حلف دہرایا اور بائبل سر اور آنکھوں سے لاکر کہا۔ ”سو ہیپ می گوڈ۔“

دیپالی اطمینان کا گہرا سانس لے کر اپنے بنگ پر جا بیٹھی۔

”روزی۔ ادھر آؤ۔“ اب گویا وہ گرو یا لیڈر تھی۔ روزی اس کی جیسی تھی۔ ”غور سے سنو روزی۔ دیپالی کی آواز میں حکم آ گیا تھا۔ اومارائے کی طرح اقتدار اور احساس ذمہ داری انسان کو پل کی پل میں بدل جاتی ہے۔

”روزی۔ ڈی ایم کے بنگلے پر تمہارے کپاؤنڈ کا کوئی آدمی ملازم ہے۔ تم نے ایک تہہ ذکر کیا تھا؟“

”سنرکنٹ ویل کی آیا ہمارے ہاں کی عورت ہے۔ ایسا۔۔ مئی نے ہی اسے وہاں رکھوایا تھا۔“

”کہاں کی رہنے والی ہے؟“

”پالا تو مئی نے اسے کپاؤنڈ میں ہے۔ مگر اس کی نانی نرسنگھ دی میں رہتی ہے۔“

دیپالی چند لمحوں تک سوچا کی۔ پھر پوسٹ کارڈ اور قلم نکال کر روزی سے کہا۔

”میں اس کی نانی کی طرف سے تمہاری مٹی کو خط لکھ رہی ہوں۔ نانی بہت سخت بیمار ہے۔ لہذا

دیپالی ہفتے کے لئے فوراً نرسنگھ دی پہنچے۔ ان کو کچھ نہ سگھڑا۔ بس گادویہ کارڈ وہاں ڈاک میں

لادے گا۔ اچھا ٹھہرو۔ جونت جید قابل اخبار ہے۔“

”تم دیپالی جونت کو برسوں سے دیکھ رہے ہو۔“

”اچھا۔ جوزف ایک لغائفہ لے کر لیتا کے نام ڈی۔ ایمرادوس جائے گا اور اس سے کہے گا کہ گاؤں سے آدمی یہ چھٹی لایا ہے۔ دہی نانی کی بیماری دالی۔ اور کہے گا کہ ہفتے بھر کی عیوضی کا انتظام بھی کرتا آیا ہے۔ یہ لیلو جو ہے تمہاری۔ یہ میم صاحب سے چھٹی مانگے گی۔ میم صاحب کسی آدمی ہیں؟“

”اچھی خاصی ہیں۔ مشرفین عورت ہیں۔“ روزی نے جواب دیا۔ مگر انھیں سی محسوس ہوتی۔ میں مسٹر کنیٹ میں سے واقع ہوں۔ ان سے ملتی رہتی ہوں۔ اور اب ان کو دھوکا دینے جا رہی ہوں۔“ اچھی خاصی ہیں۔“

س نے دہرایا۔

”اُس کے بعد شام کو ایک برقعہ والی ملازمہ کلثوم بی بی ڈی ایمرادوس پہنچ جائے گی۔ لیلو کی عیوضی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ خط لے کر تم جاؤ اور لیلو کو چھٹی دلادو اور بعد میں کلثوم بی بی کو سنا دو۔ تو منٹوں میں کام بن جائے گا۔ مگر پھر خیال آیا کہ تم کو مصیبت میں نہ ڈالوں۔“

”کیوں۔؟ روزی نے غصے سے پوچھا۔“ پھر حلف کس لئے اٹھوایا ہے؟“

”تم خود چلی جاؤ گی؟“

”اے کدس۔“

”اوہ۔ ڈنڈر فل۔ روزی۔“ دیپالی خوشی سے اچھل پڑی۔

”مگر دیپالی۔ یہ سب کس لئے۔؟ تم مسٹر کنیٹ دین پریم تو نہیں پھینکو گی؟“

”روزی۔ تم کو پتہ ہے، ہم لوگ ہم نہیں پھینکتے۔“

”ہم لوگ۔“ دیپالی نے بڑی لے نیازی سے کہا۔ اور روزی مرعوب ہوئی۔ مگر اچانک اس نے کہا

”ایک بڑا سخت ٹوپہ ہول ہے تمہاری اسکیم میں۔ پوچھو کیا۔؟ لیلو ایک ہفتے کے لئے کہاں جائے گی؟ خط تو فرم ہی ہے۔“

”اس کا انتظام بھی کریا گیا ہے۔ فکر مت کرو۔ یہ بہت معمولی بات ہے۔ اچھا۔ روزی۔ آج ہے

۲۷ مارچ۔ ۷۷ء دسمبر سے پہلے کلثوم بی بی کا ڈی۔ ایمرادوس میں پہنچ جانا لازمی ہے۔“

”مگر کیوں آخر۔؟“

”یہ تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔“

”کیوں؟“

” روزی بھر جی۔ تم نے اندر گراؤنڈ میں کام کرنے کے لئے حلف اٹھایا ہے نا۔ اب زبان بند رکھنے اور
وال نہ کرنے کی عادت ڈالو۔“

” تم تو واقعی ڈکٹیٹر بن گیس۔ روزی نے منہ لٹکا کر کہا۔

دیپالی بچوں کی سی کھاتی میں ییلاقی آیا کی نانی کی طرف سے مسز ایسٹھرن جی کو پوسٹ کارڈ لکھنے میں
مروف ہو گئی۔

۲۳ دسمبر کی صبح روزی لہلی کالج کے برآمدے میں بیٹھی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور لاٹ پادری کے ہاں سے
نئے ہوئے کھلوٹوں اور گرم کپڑوں کے پارسل بنانے میں مصروف تھی۔ جو کمپاؤنڈ کے یتیم بچوں میں تقسیم کئے جانے
کے لئے اسی وقت ڈاکٹرنے ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا۔ پڑھ کر روزی نے اپنی والدہ کو آواز دی، جو کانفرنس کے
شہدوں کی صبح کی چائے کے انتظام میں سرگراں پھر رہی تھیں۔

” مٹی — بے چاری ییلاقی کی نانی کا خط آیا ہے۔ بڑی سخت بیمار ہے۔“

” ارے کیا ہوا؟“ مسز ایسٹھرن جی نے پوچھا۔

” یہ نہیں لکھا۔ یہ دیکھتی لوگ تو صرف ایک ہی بات جانتے ہیں۔ پران لکھنے والے میں فوراً پہنچو۔“
” خذ باب رحم کمرے۔“ ایسٹھرن جی نے کہا۔ ” روزی تم خود جا کر مسز کینٹ ویل کو خط دکھاؤ۔ روزی
شاید جھپٹی زدیں۔ ییلا جھ سے کئی بار کہہ چکی ہے کہ گاؤں جانا چاہتی ہے۔ مگر میم صاحب ابھی جھپٹی نہیں دے
ہی ہیں۔“

” کیوں؟ ان کے ہاں آیا کام ہی کیلئے ہے؟“

” نہیں، مگر ان کے ہاں جہان آنے والے ہیں۔ پرسوں چیرٹی بازرگ کے لئے آئی نہیں تھیں تو مجھے
رہی تھیں۔“

” کون جہان آنے والے ہیں۔ مانا؟“

” مجھے کیا معلوم۔ مسز کینٹ ویل سے میری اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ مجھے تفصیلات بتائیں۔ ہوں

لے کوئی۔“

روزی نے پارسل کٹے کر کے اندر سنگ روم میں کرسمس بڑی کے پاس رکھ دیے۔ چند لمحوں کے لئے چپ کھڑی رہی۔ پھر غیر ارادی طور سے عیسیٰؑ کی تصویر پر نظر ڈالی، جو آئینہ کے اوپر لگی تھی، مگر اس کی ایک دیوار پر شب بھیر کی تصویر بھی آویزاں تھی، باہر آکر اس نے سائیکل بھالی اور رمانا کی سمت روانہ ہو گئی۔

۸ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا بنگلہ

ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے پُر فضا بنگلے کا وسیع باغ موسم سرما کے روشن پھولوں سے جگمگا رہا تھا۔ بنگلے کے اندر چھوٹا حاضری کے بعد ملازمین بڑے دن کی تیاریوں میں سرگرمی سے مصروف ہو چکے تھے۔ روزی بنجی نے سائیکل ایک گلی آہر کے نیچے کھڑی کی اور برآمدے میں جا کر ڈرائنگ روم کے درپے سے اندر بھاگا۔ بیرو گول میز کی جھاڑ پونچھ کرنا نظر آیا۔ روزی نے ذرا ڈرتے ڈرتے درپے پر دستک دی۔ غفورا بیرو روزی سے صاحب کو پہچانتا تھا۔ اُس نے باہر آ کر کھینچیں نکال دیں۔ مگر جھک کر سلام نہیں کیا کہ بڑے صاحب کا بیرو تھا۔

”میم صاحب ہیں؟“ روزی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا۔

”اندر ہیں۔“

”اور صاحب۔؟“

”صاحب کچھ ہی جانے والا ہے۔“

اندر سے بوٹوں کی چاپ اور ہلکی سی سیٹی کی آواز آئی۔ اور کسی نے پکارا۔ ”ڈرائنگ۔“

”یس ڈیر۔“ یہ مسز کینٹ ویل کی آواز تھی۔

بجلی کے کوندے کی طرح روزی کو خیال آیا کہ واپس چلی جائے۔ وہ کس زبردست حماقت میں پھنس گئی ہے۔ قوم پرستی وغیرہ بالکل ٹھیک ہے۔ مگر یہ خطرناک سازشیں۔۔۔ وہ ایک دم بچھے ہٹی۔

کراتے میں فریڈ اکیٹ ویل کتے کو آواز دیتی خود ہی باہر نکل آئیں۔

”گڈ مارننگ مسز کینٹ ویل۔“

”گڈ مارننگ۔ گڈ مارننگ۔ ہاؤ آر یو روزی۔؟“
 ”فائن۔ تھینک یو۔ مسز کینٹ ویل۔ ہاؤ آر ڈسکی۔؟“
 ڈسکی کتا تھا۔ جو بھگت ہوا برآمدے میں آیا۔

”یس روزی۔؟“ مسز کینٹ ویل نے سوالیہ انداز سے اسے دیکھا۔ انہوں نے اسے بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ اُسے ڈرائنگ روم میں نہیں لے گئیں۔ وہ اس سے اس طرح مخاطب تھیں۔ جس طرح ڈاکٹر پھری والے یا اخبار فروش سے کھڑے کھڑے بات کی جاتی ہے۔
 ”ہاؤ از دی اولڈ پارڈے۔؟“ فریڈ اکیٹ ویل نے جھک کر ڈسکی کو گود میں اٹھاتے ہوئے دیکھا
 کیا۔ ”تم کسی خاص کام سے آئی ہو۔؟“

میں۔ روزی شریلا نجر۔ ریورنڈ پال تھو۔ بنرجی کی بیٹی۔ انسان۔ محض ایک حقیر ہندوستانی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ حقیر چند دوستانی جہاں آ رہی ہے۔ مگر خواب قمر الزماں چودہری اور پیرسٹری پری تو شہ رانے اعلیٰ طبقہ کے افراد ہیں اور ڈی۔ ایم سے برابری سے ملتے ہیں۔ جہاں آ رہی ہیں اور امارائے کو فریڈ اکیٹ ویل اپنے ہاں ڈر پر بلاتی ہیں اور ان کے گھر جا کر ڈنر کھاتی ہیں۔ اور میں محض ان کے پروردہ بیٹے پادری کی لڑکی ہوں۔

چند سیکنڈ قبل روزی نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ یہ کہہ کر کہ انھیں ”میری کرسس“ دیش کرنے آئی تھی۔ واپس بھاگ جائے گی۔ جہنم میں جائے اندر گر اؤنڈ۔ مگر اب اس نے بکھنت سہراٹھا کر بڑے دھڑلے سے آہل خواب دیا۔ ”جی ہاں ایک ضروری کام ہے۔ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اس نے پوسٹ کارڈ سوئیٹری کی حویلی سے نکالا اور بولی۔ ”لیلا بی کی نانی کا کارڈ مالکے پاس آیا ہے۔ وہ بوڑھی عورت بہت سخت بیمار ہے۔“
 ”اوہ۔ ڈیم۔ عبدالغفور۔ آیا کو بلاؤ۔“ فریڈ اکیٹ ویل نے کہا اور شہلٹی شہلٹی جا کر گلوں کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

آیا باہر آئی۔ روزی نے اُسے بنگالی میں نانی کی خبر سنائی۔ اور پوسٹ کارڈ اس کے ہاتھ میں لے کر چاری عورت کانگ فقی ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”گھبرانے کا باٹ نہیں آیا۔“ فریڈ اکیٹ ویل نے مڑکر کہا۔ ”جیاستی بیار ہوتا تو شہلٹی گرام باراگریٹ مدر۔ ڈونٹ یو تھنک سوروزی؟“

”ہم کو چھٹی دے گا میں صاحب۔“ لیلانے کہا۔

”جاؤ۔ مگر عیوضی کا انتظام پہلے کرنا مانگتا۔“ مگر پر ہاتھ باندھے پیچھے کھڑے عبدالغفور نے سردیا۔ ظاہر تھا کہ عبدالغفور میں صاحب کے منہ چڑھے ملازم ہیں۔

”عیوضی۔“ اوماں۔ مس صاحب۔ ادھر کیا ڈنڈیں ڈیریں یا موٹیلو ابھی ہیں گی؟

لیلانے گھبرا کر پوچھا۔

”ادھر بیٹے پر رینڈ آیا مانگتا مس صاحب۔ عیوضی میں۔“ عبدالغفور نے رفتک سے کہا۔ منر اینٹ ویل معاصر عبدالغفور پر چھوڑ کر مانی کو ہدایات دینے کے لئے برآمدے کے دوسرے سرے پر چلی گئی۔ آدیلاں گلے کے نیچے کھرنی لئے کھڑا کچھ سڑھڑ کر رہا تھا۔

رضی ان کے پیچھے پیچھے گئی۔ ”مسز کینٹ ویل۔ ماما نے لیلانے کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ اس لئے ان کو اس کی بڑی نکر ہے۔ ابھی یہ کارڈ آیا تو ماما کو بھی عیوضی کا خیال آیا تھا۔ ہمارے دروازے کی بھانجی آیا کا کام جاتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو بھیج دوں۔“

فریڈ کینٹ ویل روزی کی طرف تڑپیں۔ یہ نازک ترین لمحہ تھا۔

”درزی کی بھانجی۔“ کون سا درزی۔ ہمارا حسن علی؟“ انہوں نے پوچھا۔ ظاہر تھا کہ فریڈ کینٹ ویل ایک خالص گھریلو بی بی یعنی ہاؤس وائف تھیں اور درزیوں اور نوکروں کے سلسلے سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

اب روزی بڑھرائی۔ ”جی نہیں۔“ مشن کا ایک پرانا درزی تھا۔ کریم اللہ۔ وہ اب چلا گیا ہے۔ اس کی بھانجی کلثوم کچھ روز جوئے ماما کے پاس کام کی تلاش میں آئی تھی۔ انگریزی نہیں جانتی، مگر بڑی ایماندار لڑکی ہے۔ بیوہ ہے۔“ لاشعوری طور پر روزی نے اپنی ماں کی کہانی دہرائی۔ ”اگر تم اُس کی ذمہ داری لیتی ہو تو بیچ دو۔ میرے کمروں میں سارا سامان کھلا پڑا رہتا ہے۔ یہاں کے بکس تک کھلے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنے نوکروں پر اتنا بھروسہ ہے۔“

”اچھا۔ لیلانے میں جوزف کے ساتھ کلثوم کو بھیج دوں گی۔ تم اسے سارا کام سمجھا دینا۔“ روزی نے آیا کو مخاطب کیا۔

”اچھا۔ روزی بابا۔ گاڈ بلیس یو روزی بابا۔“ لیلانے سہلانے کہا۔

فریڈا کینٹ ویل اب بیڑھیاں اتر کر کرستھم کی ایک کیاری کا معائنہ کر رہی تھیں۔ روزی
 ان کو "بانی" کہا اور سائیکل پر بیٹھ کر فرارے سے باہر نکلی۔
 جب وہ سڑک پر پہنچی تو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی
 اُس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے۔

چندر کینج جا کر دیپالی کو تفصیل بتانے کے بعد روزی کپاؤنڈ واپس آگئی اور اس کے جانے کے
 ایک گھنٹے بعد اومارائے کی کار چندر کینج کے پھانگ پر آ کر رکی۔ اومارائے شمال پیٹے نیچے اتریں۔ وہ
 سب معمول بہت مضحل نظر آرہی تھیں۔

ڈاکٹر سرکار برآمدے میں کھڑے اجبار پڑھ رہے تھے۔ اجنبی ہمان خاتون کو دیکھ کر ذرا
 ہراسے گئے اور نمسکار کیا۔ اومارائے نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔ اور اپنا تعارف کرایا۔
 ڈاکٹر سرکار ان کو بیٹھک خانے میں لے آئے۔ دیپالی کو اڑکے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔
 مانے آواز دی۔

"دیپالی۔"

"جی اومادی۔"

"وہ جو مضمون میں نے تم کو لکھنے کو دیا تھا۔ کچھ کامیابی ہوئی۔؟"

"جی اومادی۔ پوری کامیابی۔"

"گڈ۔" اومارائے نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ ڈاکٹر سرکار سے مخاطب ہو گئیں اور کچھ
 بیک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔ "نوعے بابو۔ میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر
 آئی تھی۔ دراصل۔"

"کہئے۔"

"میں ہفتہ بھر کے لئے کو میلا میں اپنے گاؤں جا رہی ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو دیپالی کو اپنے
 تھلے جاؤں۔ اس کا کالج بند ہوا ہے۔ ذرا یہ بھی سیر تفریح کر لے بے چاری۔"
 ڈاکٹر سرکار چپ ہو گئے۔ مگر اپنی قدامت پسندی کے باوجود وہ ایسی اعلیٰ خاندان اور بلند سیرت

خاتون سے انکار نہ کر سکتے تھے۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ تنگدستی کی وجہ سے وہ دیپالی کو کسی قسم کی سیر تفریح نہیں کرا پاتے۔

اب تینوں لڑکے اندر آچکے تھے۔ اور کان لگا کر مکالمہ سن رہے تھے۔

”ہم بھی چلیں گے۔“ چھوٹے دونوں نے شور مچایا۔

”تمہارا مچ ہے۔ کیسے جاؤ گے؟“ دیپالی نے اندر سے نکل کر ڈانٹا۔

”تو گویا پروگرام پہلے سے بن چکا ہے۔“ ڈاکٹر سرکار نے کہا۔

”پرسوں پرسوں اُردا دی نے ذکر کیا تھا۔“ دیپالی نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔ ”میں چلی جاؤں بابا؟“

”جاؤ۔ ہو آؤ۔ کیا آج ہی جا رہی ہو؟“

”جی ہاں۔ رات کے اسٹیمر سے داؤد کندی پہنچنے کا ارادہ ہے۔ اچھا۔ دیپالی تم تھوڑا سا سامان

باندھ لو۔ میں تیسرے پہر کو کارن بیچ دوں گی۔“ اُردا نے کہا اور ڈاکٹر سرکار سے باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

دیپالی نے اچانک اپنے باپ پر نظر ڈالی۔ بابا باندھ لیں بعد، خلاف معمول نہیں نہیں کر باتیں کر رہے

تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ اتنی آسانی سے اجازت دیدی!۔ بابا۔! تم پر اُردا دی کا جادو چل گیا!

کو مہیلا کی رہنے والی ہیں۔ ضرور کوئی منتر جاتی ہوں ہوگی۔ سارے کام بیڈ ان کی غیر حاضری میں

بھی ان کا وظیفہ پڑھتے تھے۔ اب دیکھو کس طرح بابا کو منٹوں کے اندر شیشے میں اتار لیا۔ بے چارے

بابا۔ اس نے تاسف سے پوچھا۔ اُردا دی کی زندگی میں سیاست کے علاوہ اور کسی بات کی گنجائش بھی

ہوگی؟ اُس نے سر اٹھا کر اپنی ماں کی تصویر کو دیکھا، جس کے نیچے اُردا دی نے کرسی پر بیٹھی ڈاکٹر سرکار سے

مخاطب تھیں اور بار بار حسب عادت عینک اتار کر آنکھیں جھپک کر ڈاکٹر سرکار کو دیکھتی تھیں اور پھر

عینک پتوں سے صاف کر کے لگا لیتی تھیں۔ اُردا دی کی آنکھیں بڑی بڑی اور سر مگیں تھیں۔ کاش بابا اُردا

دی۔ لیکن کوئی ٹنگ نہیں ہے۔ اُردا دی بڑی سخت دل معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ اتنی نرم دل بھی ہیں۔

اُردا دی کے جانے کے بعد اپنے کمرے میں لڑکی کیس پیک کرتے ہوئے وہ دیر تک یہی سب سوچنے

میں ایسی کھوئی رہی کہ آنے والے دنوں کے خطرے اور نزاکت کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آیا۔

ٹھیک ساڑھے تین بجے اُردا دی کی کار آگئی۔ دیپالی درری کا چھوٹا سا بستر اور لڑکی کیس اٹھائے

چند رنگ سے نکلے اور کار میں جا بیٹھی۔

کلتوم آیا

سارے چار بچے شام مشن کمپاؤنڈ کا بورڈ صا اور معتبر جو کیدار جو ذرف لپنے ہراہ کلتوم آیا کولے
بڑی ایمر ڈاؤس پہنچا۔ میم صاحب ابھی سو رہی تھیں۔ صاحب کچھری سے نہیں آیا تھا۔ لیلا بتی سامان
رہے زلمن گنج جانے کے لئے تیار بیٹھی تھی۔ اُس نے کلتوم بی بی کو اندر بلایا۔ اور کام سمجھانے میں مصروف
ہی۔ کوٹھی کے سائے کمرے دکھائے اور اس کے فرائض سے روشناس کیا۔

”شام کے ٹیم۔ لیلا بتی اپنا انگوٹھا اٹا کر منہ تک لے گئی۔“ صاحب، میم صاحب دھت ہو
تا ہے۔ اس کے بعد چھٹی۔ میم صاحب رات کو کپڑا خود بدلی کرتا ہے۔ بچہ کوئی ہے نہیں۔ صاحب،
م صاحب دونوں بہت شریف آدمی ہے۔ تم خوش رہے گا۔ ہفتہ دس روز کا تو بات ہے۔ لیلا اُسے
بلے برآمدے کے سرے پر اپنی کوٹھری میں لے گئی۔ کلتوم نے اپنا اچھی کیس چار پائی کے نیچے سرکا دیا۔ کوٹھری
، سر کے تیل کی عجیب سی بو لسی تھی۔ اُسے اُٹکانی سی آئی۔ وہ کھڑک کے پاس بیٹھ گئی۔

شام کی چائے کے وقت میم صاحب نے طلبی کی۔ لیلا اسے اپنے ساتھ لے کر گئی۔ صاحب
م صاحب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کلتوم نے جھک کر سلام کیا۔

”پہلے کہیں کام کیا ہے؟“ میم صاحب نے انٹرویو شروع کیا۔

”کلکتے میں میم صاحب۔“

”کہدھکار بننے والا ہے؟“

”میں سگھ۔ ادھر لال باغ میں ہمارا ماموں ہے۔ اس کے پاس رہتا ہے۔“

”ہیل۔ پادرے کی لڑکی نے یہ آیا بھی ہے۔ آئی تھنک شی دل ڈو۔“ منر کینٹ دیل نے

بہر کو مخاطب کیا۔

ولیم کینٹ دیل نے بے پرواہی سے سرعٹ کیا اور اسٹیشن میں پڑھنے میں مصروف رہے۔

مقوم بی بی نے اپنی مستعدی اور خدمت گزاروں سے فریڈا کینٹ ویل کو میٹوں میں رام کر لیا اور فریڈا کینٹ ویل کو خاصی سیدھی تھیں۔ فوراً اس کے آگے لیلابتی کی شکایتیں کرنے لگیں۔ کاہل اور کام چور ہے۔ دن بھر سوتی ہے۔ یاد سے کی بوی کی سفارش پر اتنے دنوں سے رکھا ہوا ہے۔ اگر وہ گاؤں سے واپس نہ آئے تو تم ہمیں رہنا کھل آتم۔

کلتوم نے اقرار میں سر ہلایا۔ اور میم صاحب کے پاؤں دباتی رہی۔

وہ پردے کی وجہ سے شاگرد پیشے کی طرف بالکل نہیں گئی۔ بوڑھے عبدالغفور میاں ہم مندرجہ کے ناطے اس کے متعلق خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ اُن کا بڑا بڑا کا نواب پوسے میں سائیکلوں کی دوکان پر نوک تھا۔ مگر آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالغفور چاہتے تھے کوئی نیک بے زبان لڑکی ملے تو دو بول پڑھادیں۔ چنانچہ کلتوم کے گھر کے حالات اور اس کی بیوگی کی المناک داستان سن کر انھیں اس سے اور زیادہ ہمدردی ہو گئی اور وہ اس کی خاطر مدارات میں لگے رہے۔

”کرسمس ایو“ کی وجہ سے وہ شام ہی مصروف اور منہنگام خرید گزری۔ کلتوم رات گئے تک کام میں لگی رہی۔ دوسری صبح بڑا دن تھا سویرے ہی سے سامنے کا برآمدہ ڈالوں سے بھر گیا۔ اور سلام کے لئے آنے والے ہندوستانیوں کا تانتا بندھ گیا۔ شام کو صاحب لوگ آئے۔ وہ دن بھی مصروف گزارا۔ تیسرے روز گلکتے سے مہمان آنے والے تھے۔ عبدالغفور بڑے دن اور مہانوں کی آمد کی وجہ سے کام کی زیادتی کا شکوہ کرتے ہوئے بڑبڑا رہے تھے تو کلتوم نے ان سے کہا۔ ”چچا لاؤ جھاڑ پونچھ میں کئے دیتی ہوں۔ اتنے میں تم کٹلری صاف کروالو۔“ بنگلے پر ان گنت ملازم تھے۔ مگر گول کمرے صاحب اور میم صاحب کے کمرے اور کھانے کے کمرے کی صفائی عبدالغفور خود کرتے تھے جھاڑن کندھے پر ڈال کر عبدالغفور لپیٹھ پر ہاتھ رکھے جھکے جھکے سینٹری کی طرف چلے گئے۔ پھہ واپس آکر انہوں نے کلتوم سے کہا۔ ”سب چیز نسبت اچھی طرح جھاڑنا۔ میم صاحب گرد کا ایک ذرہ بھی دیکھ لیں تو مار ڈالیں گی۔“

میم صاحب صبح کے ٹیم ملنے لانے باہر جا چکی تھیں۔ کلتوم ڈرائنگ روم کی صفائی کرنے کے بعد سب سے پہلے صاحب کے دفتر کے کمرے میں گئی۔ جس کے سب دروازے اندر سے بند تھے۔ اس نے صاحب کی میز کے کاغذات سنوارے، فائیل سلیقے سے رکھے۔ ایک آدھ دراز جو آدھ کھلی پڑی تھی اُسے

بھی ٹھیک کر دیا۔ اور آدھ پون گھنٹے تک کمرے کی جھاڑ پونچھ میں مصروف رہی۔
میم صاحب کی واپسی سے ذرا قبل وہ ان کے ڈرائیوگ روم میں آکر ان کے کپڑوں پر استری کرنے
میں مشغول ہو گئی۔

ہمان کلکتے سے رات کو پہنچے۔ اس وقت کلثوم اپنی کوٹھری میں جا کر سو چکی تھی۔
بریک فاسٹ کی میز پر اس نے سٹر گلبرٹ پلومر انسپیکٹر جنرل پولس اور ان کی میم کی جھلک دیکھی۔ مگر
ڈرائیوگ روم میں اس کا کوئی کام نہ تھا۔ ناشتے کے بعد میم صاحب نے اس سے کہا کہ مسز پلومر کے پاس
بٹائے۔

چنانچہ وہ گیسٹ روم میں پہنچی اور جھک کر سلام کیا۔ مسز پلومر ادھیڑ عمر کی خوش مزاج خاتون
تھیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے نکال کر کرسی پر رکھے۔ مسز پلومر کا اردنی ابھی کمرے میں نہ آیا تھا۔ کلثوم نے
دھوبی کو بلایا۔ سفر کے کپڑے دھوبی کو دینے کے لئے مسز پلومر نے گنگنائے گنگنائے سارا سامان تلپٹ
رہا۔ بہت سے سرکاری کاغذات تتر بتر ہو گئے۔ کلثوم نے سلیقے سے ان سب کو سمیٹ کر ایک طرف
بکھ دیا۔

”گڈ ڈائل۔“ مسز پلومر نے کہا۔ ”ہمارے ساتھ کیل کٹا چلے گا؟“ (مسز کینیٹ ویل نے
ان کو بتا دیا تھا کہ یہ آیا عارضی ہے)

کلثوم نے شہرا کر منہ میں پلوٹھو لیس لیا۔ ”میم صاحب ہمارا سادی ہونے والا ہے۔“
”سادی! دیر ہی گڈ۔“ لو کھل تم۔ یہ صاحب کا بسا ادھر رکھو۔ اس میں بڑا جردری کا گج
بکھا ہے۔ صاحب اس کی چابی مانگے گا تو ہم کو آکر لوٹنا۔ چابی ہمارے اس نیلے بیگ میں ہے۔ بھیک پائے؟“
”ٹھیک ہے میم صاحب۔“ کلثوم نے جواب دیا۔

رات کو کھانے کے بعد مسٹر کینیٹ ویل اور مسز پلومر شراب کے گلاس ہاتھ میں لے کر ڈرائیوگ
روم کے دروازے اندر سے بند کیے آہستہ آہستہ گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے کلثوم برابر والے
نڈھیرے کمرے میں ہی موجود تھی جس کا دروازہ پہلے سے کھلا رہ گیا تھا۔

کچھ دیر بعد صاحب نے پکارا۔ ”کوئی ہائے۔“

کلثوم دیے پاؤں پیڑھی میں گئی۔ جیسا عبد الغفور عشار کی نماز میں مصروف تھے (میم صاحب

اور مسز پٹو مر اپنے اپنے کمروں میں جا کر سو چکی تھیں) صاحب نے دوبارہ آواز دی تو کلثوم بھاگی بھاگی ڈرائنگ روم کے گیسٹری والے دروازے پر پہنچی اور دستک دی۔ صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اور اس پر اس طرح نظر ڈالی جیسے اُسے پہلی بار دیکھ رہے ہوں۔ وہ ذرا جھینپ گئی۔ مگر اس نے فوراً کہا۔ ”صاحب عبدل نماز پڑھ رہے ہیں۔ کیا کام ہے؟“

”تم اب تک کیوں جاگ رہی ہو کھل سُم۔“ مسز کلینٹ ویل نے پوچھا۔ ان کا چہرہ تھمارا تھا۔
”میں میم صاحب کے پاؤں دبا رہی تھی۔ صاحب۔“

”اوہ اچھا۔“

کلثوم نے ایش ٹرے خالی کی۔ سیکرٹ کا نیا ٹین کھول کر ہان کے قریب تپائی پر رکھا۔ اس دوران میں دونوں صاحب لوگ پھر گفتگو میں محو ہو چکے تھے۔ لیکن جب وہ کمرے سے باہر نکل رہی تھی تو دفعتاً مسز پٹو مر نے سراٹھا کر اسے دیکھا اور شگفتگی سے کہا۔ ”آئی سے آئی۔ دس اے پڑی گئی۔“ کلثوم ہڑٹا کر گیسٹری میں پہنچی اور سر پٹ دوڑتے ہوئے اپنی کونکھری میں جا کر کھٹ پڑی۔

مسز پٹو مر صوبے کے اعلیٰ پولیس اور سول حکام کی ہنگامی کانفرنس کے لئے ڈھاکے آئے تھے۔ ایک روز ایک اہم میٹنگ ڈی۔ ایم کے بنگلے پر بھی ہوئی۔ جس میں بیرون مسز رائے کے سالے دھرنیدر موہن سین ڈی آئی جی بھی شامل تھے۔ بنگلے پر پولیس والوں اور سی آئی ڈی والوں کی ریل سیل تھی۔ کلثوم مستعدی سے اس دوران میں مسز پٹو مر کی حاضری میں رہی اور بڑی تندی سے مہانوں کی خدمت میں مصروف رہی۔ کلکتے واپس جاتے وقت مسز پٹو مر نے اس کو دس روپے بخشیشن دیئے۔

دسویں دن ییلابتی اپنے گاؤں سے واپس آگئی۔ آتے ہی اس نے کلثوم کے کان میں کہا۔ ”مافی یار نہیں تھی۔ مجھے بیانے سے بلوایا تھا۔ ورنہ میم صاحب جتنی بددیتیں۔“
جس دن ییلابتی ڈی۔ ایم کے بنگلے پر اپنی ڈیوٹی بجانے واپس پہنچی۔ اسی روز شام کو امارائے کی موٹر دیا آئی سرکار کو پکارتے ہوئے۔ دیا پالی نے ڈاکٹر سرکار کو بتایا کہ اس نے کو میلا میں امارائے کے گھر ہی ہاؤس میں بیدر خوشگوار وقت گزارا۔

۹ جنوری ۱۹۳۲ء کو پولیس نے دریائی راستوں کی ناکر بندی کر کے ریحان الدین احمد اور اس کے اہلیوں کے خفیہ مستقر اور خفیہ پولیس پر چھاپہ مارا۔ مگر ریحان الدین احمد اور اس کے ساتھی وہاں سے غائب چکے تھے۔ اور اب کی مرتبہ وہ ایسے ناسب ہوئے تھے کہ پانچ اضلاع کی پولیس اُن کو تلاش کرنے کرتے تھے۔ مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔ یورپ میں جیسے جیسے جنگ نے زور پکڑا اور برطانیہ کمزور پڑنا گیا۔ ہندوستان پولیس کی سرگرمیوں میں تیزی آگئی۔ جنگال میں ریحان الدین احمد اور ان کے ساتھیوں کی تلاش بھی تیزی سے جاری رہی۔ مگر وہ سب شاید فضا میں تحلیل ہو چکے تھے۔

لیکن جنگ کے خلاف اور خانہ جنگی کے پرچار میں ان کا طریقہ اسی طرح خفیہ ٹھکانوں سے چھپتا رہتا ہے۔

۱۰

ویشنویراگی

کلب ترودو لیا لاکا وہ درخت ہے جو سمندر منتقن سے نکلا تھا! اور اس کے پھولوں میں اپنی مٹی کے مطابق کوئی سی بھی خوشبو سونگھی جاسکتی تھی اور جو ہر خواہش پوری کر دیتا تھا۔ شامی نکیتن میں برہمندر کے پاس ایک پرانا برگد کھڑا ہے۔ دیپالی سرکار سے اپنا کلب ترودو سمجھی ہے۔ کیونکہ ایک روز اس درخت نے بڑے انوکھے اور غیر متوقع انداز میں اس کی ایک خواہش پوری کر دی۔

ایسٹرن ریلوے کی صاحب گنج لوپ لائن پر کلکتے سے شومیل کے فاصلے پر سنتھال پرگنہ کے نزدیک بولسور ایک جگہ کا نام ہے۔ بولسور آج سے سو برس پہلے اپنے ڈاکوؤں کے لئے مشہور تھا۔ کیونکہ اس علاقے کی کنکریلی زمین میں کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اور یہاں کے باشندے ڈاکے ڈال کر اپنا بیٹا لیتے تھے۔ وہ چھری، جس سے یہ ڈاکو مسافروں کا گلا کاٹتے تھے بول کہلاتی تھی۔ اور اسی وجہ سے اس دیوانہ نام بولسور پر گیا تھا۔

ہمالیہ پر شامی کی تلاش سے ناکام لوٹنے کے بعد ایک مرتبہ ہارشی دیو میرونا تھ میگورزینڈا رہنما سے

ٹپنے پانگی میں بیٹھے رائے پور جا رہے تھے۔ جب بولپور کا یہ مسلمان سپہرڑا تے میں پڑا۔ اس میدان میں ہمارا شہر
کو ایک بڑا سا بیہ دار درخت نظر آیا۔ انہوں نے پانگی وہیں رکوالی اور درخت کی چھاؤں میں تالین بچھا کر رات
میں مہر دے ہو گئے۔ وہاں انہوں نے ”یو دیو دگر دیو پستو و شوم بھون ماد یو لیشہ یہ اوشدھی شو یو پستو
شو تسمی دیو ابہ نونماہ۔ والی ویدک حمد ہرائی اور ہمارا شہر کو اس درخت کے نیچے وہ شانتی مل گئی، جس کے
کھوج میں وہ سارے ہندوستان میں گھومتے تھے۔

انہوں نے رائے پور جا کر زمیندار سناہ سے یہ علاقہ خرید لیا۔ درخت اور باغ لگوائے۔ ڈاکوؤں
نے ڈاکہ ڈالنے سے تو یہ کمی۔ اور ۱۸۶۳ء میں ہمارا شہر نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی تیاگ کر یہاں شانتی نکیتن
آشرم قائم کیا۔ شانتی نکیتن و لا تعمیر کر والی اور یہاں رہنے لگے۔ برگد کے اس درخت کے نیچے انہوں نے ایک
مرمرین معبد بنوا کر اس کے پھاٹک پر لکھوایا۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آئند

آمار شانتی

اس درخت کے نیچے ہمارا شہر کو خدا مل گیا تھا۔

آج یہ شانتی نکیتن ہندو قدیم کی جھلک کی در سگا ہوں کی طرز پر بنے ہوئے دارالعلوم و شوا بھارتی
انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے گاندھی اور وار دھا
آشرم، نہرو اور آئند بھون اور شیگورا و شانتی نکیتن والے ہندوستانی کو قومی جدوجہد کے ایک انتہائی
نازک موڑ پر لاکھڑا کیا ہے اور گو شانتی نکیتن کی فضا میں ہمیشہ کی طرح پُر سکون اور نغمہ بار ہیں۔ اور گرو
دیو ابھی زندہ ہیں۔ اور ڈاکٹر نند لال بوس اور ایندرا ناتھ شیگورا اور ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے دوسرے
عظیم مصور کلا بھون میں موجود ہیں۔ مگر بیرونی دنیا کے معاملات تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آئند

آمار شانتی

ستمبر ۱۹۲۲ء کی ایک شام شانتی عکسین کی ایک نئی طالب علم تھرڈ ایئر کی دیپالی سرکار برگہ
بچے بیٹھی مرمریں پھاٹک پر منقش ان سمر انگیز الفاظ پر نظر ڈال کر سوچ رہی تھی۔ کمال ہے ہمارے
آسانی سے یہ سب کچھ حاصل ہو گیا تھا۔ مگر مبارشی کبھی بیس برس کے بھی تو رہے ہوں گے۔
اپنی نوٹ بک بند کر کے وہ برگہ کے پتوں کی ناؤ بناتے بناتے سوچنے لگی۔ کلب تروا زندگی
تھے گرتے جا رہے ہیں۔

”اکھ زخمین۔“ دور سے آواز آتی۔ اس نے چونک کر جھکل کی طوطا دیکھا۔ دور ایک
ادی پر چند دیشو بیراگی لغو لگاتے تیز تیز چلے جا رہے تھے۔
اور دیپالی کو یاد آیا کہ یہ بیرتھوم ہے۔ چنڈی داس کی سرزمین۔ اس نے جبک کر مرنجھی پر بیٹھ
دیا۔ چنڈی داس کی سرزمین۔

وہ کتابیں سمیٹ کر ہوٹل واپس جانے کے ارادہ سے اٹھنے لگی۔ مگر اچانک سامنے پگڈنڈی بہ
کھر کھڑے۔ اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ ایک لمبی سیاہ دارمھی اور سیاہ زلفوں والا دیشو سنیا کی
اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور سنیا سی کو پر نام کیا۔ تب اس نوجوان بیراگی نے جڑی
تگی سے کہا۔ ”دیپالی۔ ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جائیں؟ میں گلٹا ہے تمہیں روحانیات کے
کی اشد ضرورت ہے۔“

دیپالی کے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ چوتھے پر بیٹھ گیا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ پھر اس نے
لے میں سے بیگھٹ نکال کر جھلایا مگر فوراً ہی بھجھار دیا۔

”بچے۔ ہم تجھ سے بہت زیادہ خوش ہیں۔ تو نے ہماری بہت سیوا کی ہے۔ اور ہم تیری بہادری کے
ت قائل ہو گئے ہیں۔ تو واقعی کمال کی لڑکی ہے۔“

دیپالی نے بھویں جوڑ کر کہا۔ ”آپ۔؟“

”ہاں بھیا۔“

دیپالی سر ابرہ ہو گئی۔ ”آپ کو اس قدر ریک میس نہ ہونا چاہئے۔ اب میں کسی کی ایام طاب نہ بنی
گی۔“

”ریک میس۔؟ یہ شانتی نکلتی تو اپنا پرانا اٹھ ہے بچے۔“

ہرگد کے نزدیک مرزوں عبادت گاہ میں کسی نے چراغ جلا دیا۔ پھر قدموں کی چاپ دور ہو گئی۔
 ”تو پوچھا پارٹ نہیں کرتی بیٹیا۔“

دیپالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سنیاسی نے پھانگ پر لکھے ہوئے الفاظ پر نظر ڈالی اور انہیں
 آہستہ سے دہرایا۔ پھر وہ بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔
 ”آپ۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اس وقت یہاں مل جاؤں گی؟“ چند لمحوں بعد دیپالی
 سزاٹھا کر اس سے پوچھا۔

وہ اپنے خیالوں سے چونکا اور دفعتاً ہنس پڑا۔ ”اپنے علم کے زور سے۔“ پھر کچھ توقف کے
 بعد اس نے کہا۔ ”میں تیرے متعلق سب معلوم رہتا ہے۔ بچہ ہم جانتے ہیں کہ تو روز شام کو یہاں بیٹھ کر
 ہوم درک کرتی ہے۔“

”تو بتلائیے اب میرے لئے کیا کام ہے۔“ دیپالی نے ذرا درشتی سے کہا۔
 ”کیا ہم کسی کام کے بغیر تجھ سے نہیں مل سکتے۔“

سنیاسی نے اطمینان سے جواب دیا اور چوہترے پر آئی پاتھی ما سے بیٹھا رہا۔ اندھیرے میں اُس
 کی شکل صاف نظر آرہی تھی۔

ہوا کے ایک جھونکے نے شران میں لگے ایک درخت کے سرخ پھول چوہترے پر کھیر دیئے۔ بہت
 دور پر سال کے درختوں کے ابونویں گرد دیو کسی سے باتیں کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔
 ”گرد دیو جا رہے ہیں۔“ سنیاسی نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ دیپالی بھی چوہترے پر
 سے اٹھی۔ گرد دیو اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

دفعتاً دیپالی کو محسوس ہوا کہ شام سفرد ہے۔ پھر کبھی واپس آئے گی۔
 سنیاسی نے جھولے میں سے نکالی کر گھڑی دیکھی اور پہلی دفعہ بخندگی سے کہا۔ ”شوکتی، تو تمہیں
 ایک کام بتا ہی دیں۔“

دیپالی نے تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔ ”میرا نام دیپالی ہے۔“
 ”ہاں، لیکن تم میری شوکتی ہو۔ دیپالی، میں تمہیں شکستہ ہی پکاروں گا۔ چلو جلدی سے ایک اور کا“

رد و تھوڑا سا۔

دیپالی گم شم کھڑی رہ گئی۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ ”کہئے۔“ اُس نے پھاٹک کی طرف دیکھتے دئے کہا۔

”ہمیں کہیں سے میگریٹ لادو۔ ہمارے پاس ہی ایک میگریٹ بچہ ہے اور بہت دور جانا ہے۔“

”بہت اچھا۔ لیکن آپ محض میگریٹ لینے۔“

”ہم نے کہا تو ہم تمہیں درشن دینے آئے تھے بچہ۔“

”میگریٹ کے علاوہ اور کچھ تو نہیں چاہئے۔“ دیپالی نے فکر مندی سے دریافت کیا۔ اور سنیاسی

کے سنجیدہ لہجے سے بید گھرائی۔

”نی الحال نہیں۔“ وہ پھر چوتھے کے کنارے پر ٹپک گیا اور بڑی گنجبھراؤ میں کہنے لگا۔

”دیپالی۔ میں اس لئے آیا تھا کہ میں تمہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تک تم میرے لئے محض ایک اور ”رابطہ“

محض ایک اور نام رہی ہو۔ یاد دہند کے میں سُنی ہوئی ایک اور آواز۔ تمہارے گھر پر تھی۔“

”میں آپ کا میگریٹ لے آؤں۔“ دیپالی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹی۔

”ہم سے ڈرو مت بچہ۔ ہم ایک بہت شریف سادھو ہیں۔“

دیپالی ہنس پڑی اور ایک لمحت اسے اُمارائے کی ڈانٹ یاد آئی۔ اسکول گرل گلگنز۔ اور

اُمارائے کے خیال نے اسے اچانک بید دل گرفتہ اور پریشان کر دیا۔

”تمہارے صاحب اور میم صاحب کیسے ہیں؟“

”اُن کا تبادلہ ہو گیا۔ ان کی جگہ چارلس بارلو آئے ہیں۔ ریلوے ٹرینوں کے ان سے بھی بہت اچھے

تعلقات ہیں۔ کیونکہ مسٹر بارلو کی بڑی مہین بارسیال میں مشنری ہیں۔ چانگام سے تبدیل ہو کر آئے ہیں۔“

”روزنی خیریت سے ہے؟“

”جی۔“

”کسی کو اس کے متعلق کوئی شبہ تو نہیں ہوا ہے؟“

”جی نہیں۔“

”اسے خط لکھ کر پوچھو کہ چارلس بارلو کھلنا کس روز پہنچ رہا ہے۔ چارلس بارلو کے نام کا کوڈ یاد

ہے۔؟ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی ہاں۔“

”بتاؤ تو۔“

دیپالی نے بتلایا۔

”وونڈر فل۔“ سنیاسی نے خوش ہو کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر گھر اگر چل دی سے

پٹالیا۔

”اوما سے کب سے نہیں ملیں؟“ سنیاسی نے دیپالی کا رنگ بدلتے نہیں دیکھا۔ اس نے اوما

کا نام جس انداز سے لیا تھا۔

”آپ لوگوں کے غائب ہونے کے دوسرے ہفتے ہی تو وہ کلکتہ چلی گئی تھیں۔ ابھی تک وہیں ہیں

میں گرمیوں کی چھٹیوں میں بابا کے ساتھ کلکتہ گئی تھی۔ گانے ریکارڈ کر دانے۔ مگر اوما دی سے ملاقات نہ ہو

سکی۔ ان کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ اور انہوں نے مجھے کوئی خط پتہ کبھی بھیجا نہیں۔ وہ کلکتہ میں کسی کالج

میں پڑھا رہی ہیں۔ اپنے بھائی کے ساتھ بالی گنج میں رہتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ چونکہ پارٹی کی باقاعدہ ممبر

اس لئے۔ انڈر گراؤڈ میں گئیں نہ حیل۔ بھیک ہے نا؟ اور سنا ہے کہ ان کے ڈکا آئی جی ماموں نے گورنمنٹ

کونسلٹنٹ دی ہے کہ وہ گڑ بڑ نہیں کریں گی۔ آپ کو تو یہ سب معلوم ہی ہوگا۔“

”ہاں۔ معلوم ہے۔“ پھر اس نے ذرا توقف سے کہا۔ اچھا جاؤ۔ بھاگو۔ سگریٹ لے کر آؤ۔ جو

بھی ملیں۔“

”آپ اس راستے پر جائے۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

”اچھا۔“ سنیاسی چلنے لگا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ ”ایک بات اور۔ کینیٹ ویل تازہ وارد اور

تاجر بہ کار نوجوان تھا۔ بار لو پرانا گھاگ ہے۔ اس کے باپ دادا تک جنگال سولین تھے۔ اس چیز کا تم لوگ

خیال رکھنا۔ بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ٹریٹ تحریک کے زمانے میں کئی نوجوانوں کو پھانسی کے تختے پر بھجوا

چکا ہے۔“

دیپالی کو کپکپی سی آئی۔ سنیاسی کہتا رہا۔ ”روزی سے کہنا سید احتیاط سے کام لے کر میں اطلاعات

پہنچوائے اور اپنے باپ کو کسی طرح ناراض یا ناخوش نہ کرے۔ یہ سید مزدوری ہے۔“

”بہت اچھا۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ سنیا سی پگڈنڈی پر آگے بڑھ گیا۔ دیپالی بھاگتی ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئی اور برگد کے سسنان چبوترے پر ایک نظر ڈال کر سال کے اینور بنا شروع کر دیا۔ سنیا سی سر جھکاتے آہستہ آہستہ کلاہون کے سامنے والی سڑک پر چلا جا رہا تھا۔

نانے پھولی ہوئی سانس سے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”بیچھے۔“
سنیا سی نے پلٹ کر دیکھا۔ ”ادہ تعینکس۔“ اس نے بڑی خوشی سے سیکرٹوں کے سپیکٹ جھولے میں گواہی دینے اور مسکرایا۔

اب چاند طلوع ہو رہا تھا۔
بہت دور سے ”الکھ نرنجن“ کی آواز آئی۔ سڑک کے کنارے سمند کے سریلے شور کی مانند بہاؤ ولایتی جھاؤ کی نازک ڈالیاں ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شیشم کے جھنڈے کے پرے طلباء کے جھینڈوں شنیاں جھلملائیں

دیپالی سر جھکا کر سڑک کو دیکھنے لگی۔ مٹی میں کانچ کی سرخ چوڑیوں کے چند ٹکڑے چمک رہے۔ اس نے انگوٹھے کی نوک سے ایک ٹکڑے کو چھوا اور ایک قدم پیچھے ہٹی۔ باڑ پر پھیلے سیل پر سے ایک اچھل کر پتوں کے اندر چلا گیا۔ دور سری سدن میں چند لڑکیوں نے گانا شروع کر دیا تھا۔ ستانی ڈانکے بی گورڈ ڈانکے آئی آئی۔

”یہاں اولی کمارد اس تمہ سے رابطہ رکھے گا۔“ سنیا سی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔
”بہت اچھا۔“

”سننتھال پر گنہ سنیا لینے کے لئے آئیڈیل جگہ ہے۔ مگر ہم یہاں سے بھی ویرا ڈنڈا اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اگر میں تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو تیار رہنا۔ شوکتی۔“
”بہت اچھا۔“

قریب سے چند سنتھالی عورتیں سر پر ٹوکے اٹھائے گزر گئیں۔ ان کے پیچھے طلباء کی ایک ٹولی تھابتی آ رہی تھی۔

”اچھا۔ جیتی رہو۔ خوش رہو۔ ہم جاتے ہیں۔“ سنیا سی نے منانت سے اسے آخیر وادی اور تیزی

سے آگے بڑھ گیا۔

دیپالی اُسے چاغنی کے خشک دھندلکے میں غائب ہوتے دیکھتی رہی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ واپس ہوئی۔
برگد کا چبوترہ اب بھی سفنان پڑا تھا۔ آج شام۔ آج شام میں سوچ رہی تھی کہ کاش۔۔ اُس نے
ایک پتہ اٹھا کر ناک سے چھوا۔ اور اپنے آپ سے کہا۔ کلب ترد!

پھر اس نے درختوں کے اس جھنڈ کا چکر لگایا۔ برہو معبد میں چراغ سکون سے جل رہا تھا۔

آمار پرانیر آرام

مونیہر آئند

آتار شاتی

اس نے چپکے سے دل میں دہرایا۔ اور دل ہی دل میں مسکراتی مسرور روزی بنرجی کو خط لکھنے
کے ارادے سے اپنے کمرے کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۱

لیلی کاٹج

لیلی کاٹج میں سہ پہر کی چائے کے انتظامات بڑے زور دل پر کئے جا رہے تھے۔ ایستھر بنرجی کیک
پر سفید اور گلابی آسینگ کر رہی تھیں۔ ڈیزی آیا سینڈوچ بنانے میں مشغول تھی۔ گلابیوں میں تازہ بھول لگے
تھے۔ سنگ روم میں کراس اسٹچ کی نفیس کڑھت کے دھلے ہوئے ٹیبل کلا تھ میزوں پر بڑے تھے۔ چائے کا نیر
سیٹ سلٹ کی سید کی کشتی میں سجا دستی میز پر رکھا تھا اور اس پر ہری کانچ کے مٹوں کی جھار والی بڑی
جالی ڈھانپ دی گئی تھی۔ مٹی کوزی اور کشتیوں کی کشیدہ کاری قابل دید تھی۔

پادری بنرجی سیاہ سوٹ پہنے ذرا متفکر سے برآمد ہوئے ہیں رہے تھے۔ مادر بار بار واسکت کی
جیب سے زنجیر والی گھڑی نکال کر دیکھ لیتے تھے۔

روزی اپنے کمرے میں دروازے بند کئے پتختیاں لگائے قلعہ بند بیٹھی تھی

ٹھیک چار بجے گھوڑا گاڑی سامنے آن کر دی اور پادری ہنری لبواس، مسز مری لبواس، اُن کا فریڈ

مسٹر لوتھر بسواس اور چھوٹی لڑکی ایڈتھ بسواس نیچے اترے۔ ایڈتھ بسواس نے ایک اٹیچی کیس اٹھا دکھا تھا۔

ایسٹھرن بنرجی لپسکی ہوئی باہر آئیں۔ اور دونوں میاں بیوی نے مہانوں کا خیر مقدم کیا اور سنگ دروم میں لے کر آئے۔ بسواس خاندان ذرا سیلف کانشس سا ہو کر کرسیوں پر لگا۔ پادری اور مسٹر بسواس اور مسٹر لوتھر بسواس صوفے پر ایک قطار میں اس طرح سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ جیسے پہلے زمانے میں لوگ تصویر کھینچوانے کے لئے فوٹو گرافر کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ایڈتھ البتہ اطمینان سے گراموفون کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ مسٹر بسواس نے ناقادہ نظروں سے کمرے پر نظر ڈالی جو گھر کی عزت، مگر سلیہ کا آئینہ دار تھا۔ دونوں کالے پادریوں نے آپس میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کیں۔

”یکشن میری روزی نے کاٹھے ہیں۔“ ایسٹھرن بنرجی نے مسٹر بسواس کو صوفے کے کشوں کا ذریعہ نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے دیکھ کر فوراً کہا

مسٹر بسواس اخلاقاً سکرائیں۔ انہوں نے یہ بھی نوٹس لیا کہ ایسٹھرن بنرجی گلے میں ایک سید تپلی سنہری زنجیر کے علاوہ سونے کا ایک بھی زیور نہیں پہنتے ہیں۔ اور سرخ کنارے والی سفید رنگالی ساڑھی میں ایک جگہ پر باریک کھونپ بھی بھری گئی ہے۔ خود مسٹر بسواس کر دیشیا کی چوڑی لیس والے سفید پٹی کوٹ کے اوپر تیز گلابی جازٹ کی ساری باندھ کر اور سیاہ ساٹن کا بلاؤن پہن کر آئی تھیں اور سونے کی چوڑیاں ان کے ہاتھوں میں چھاپی تھیں صبح سا روال ایک آستین میں گھس رکھا تھا۔ کانوں میں ایک ایک بوقی والے بوندے پہنے تھیں پنڈو سالہ ایڈتھ اودے ریشمی فرائک میں ملبوس تھی۔ سفید موزے، کالے جوتے بن بیا ہی دیسی عیسائی شریف زاد یوں کی مانند فرائک پر زور پہن بھی اڈتھ رکھا تھا۔ پادری بسواس سیدھے سادے آدمی معلوم ہونے لگے اور ظاہر تھا کہ بیوی ان پر حاوی ہیں۔ لوتھر بسواس ایک منحنی مسکین صورت اور شرمیلے نوجوان تھا۔ دونوں باپ بیٹے پورے سوٹ میں ملبوس تھے۔ کچھلے کرسمس دیک میں آل انڈیا مشنری کانفرنس ختم ہونے کے بعد جب لوتھر بسواس پنجاب واپس گئے تو روزی بنرجی پر عاشق ہو کر واپس گئے تھے۔ وہ لدھیانہ میں مشن سکول میں سائینس ماسٹر بن گئے ہوئے تھے۔

ایک دو سال بعد سینٹ جانز کالج آگرہ میں لیکچرر ہو کر جانے کا ”چانس“ بھی تھا۔ انہوں نے لدھیانہ واپس جا کر کچھ عرصے بعد اپنے پاپا یورنڈ بنرجی بسواس کے ذریعے پادری بنرجی کو شادی کا پیغام بھیجوا یا تھا۔

ایسی عیسائی فرقہ میں اچھے لڑکوں کی ہمیشہ سے کمی رہی ہے۔ عیسائی لڑکیاں عموماً اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اساتذہ ہو جاتی ہیں۔ بیشتر عیسائی لڑکے ایٹینوگرافریا سیملز میں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ اس وجہ سے عیسائی لڑکیاں عام طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں سے شادی کرتی ہیں۔

چنانچہ جب لوٹھر بسواس کا پیغام آیا تو پادری بنرجی خوش ہوئے۔ جب سے روزی بڑی ہوئی تھی انہیں اس کے بیاہ کی فکر نے اُکھیرا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی میں ان کی چھٹی بیٹی لپنے گھر ملی جائے۔ انھوں نے روزی سے تذکرہ کئے بغیر اپنے بیوی سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد خاص ہندوستانی ناں باب کی طرح پیغام منظور کر لیا۔ وہ یہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ان کی فرماں بردار اور سعادت مند بیٹی کو ان کے انتخاب پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔ پادری بنرجی کی خواہش تھی روزی کا رشتہ کسی ہم پلہ برہمن کرسمین خاندان میں ہوتا۔ روزی ماں اور باپ دونوں ہی طرف سے نجیب الطرفین کٹین برہمن زادی تھی۔ مگر آج کل خاندانی لڑکے طے کہاں ہیں۔ اور پادری بسواس بھی اچھی ذات کے آدمی تھے (حالانکہ بسواس عموماً خٹو لڈ کا سٹ والوں کا نام بھی ہوتا تھا) ان کے مشنری باپ دادا بنگال سے جا کر لہیانے میں سیٹل ہو گئے تھے۔ پادری بسواس کو نکالی زبان بھی نہیں آتی تھی کیونکہ ان کی ماں پنجابی تھیں۔ خود تیری بسواس بھی پنجابی تھیں اور واقعی اپنے انداز اور وضع قطع سے کچھ جڑشین معلوم ہوتی تھیں۔ مگر بہر حال بہت معقول خاندان تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ مشنری کانفرنس کے نانے میں پادری بنرجی، لڑکے کی عادات و خصائل سے خود واقف ہو چکے تھے۔ لڑکا انہیں پسند آیا تھا۔ شریف، حلیم الطبع اور سید مذہبی نوجوان تھا۔ روزی کو بڑے آرام سے رکھے گا۔ پچھلے ہفتے پادری بسواس کا خط آیا تھا کہ وہ اور ان کی بیوی لڑکی کو دیکھنے اور بات چتی کرنے کے لئے ڈھاکہ آ رہے ہیں۔ اور روزی کو جب البتھر بنرجی نے یہ اطلاع دی تھی تو ایسا لگا تھا، جیسے اس کے اوپر ہم کا گولہ آن گرا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اس لمحے سے بالکل چپ سا دھلی تھی۔ (دیپالی اتنی دد رشتہ اتنی نکیتن بھی تھی۔ جس سے وہ اپنا دکھ درد کہہ سکتی۔ جہاں آرا کے پاس وہ اپنا دکھڑائے کر جانا نہ چاہتی تھی) اس کی اس خالہ موشی کو اس کے والدین نے بچوں کی شرم و حیا پر معمول کیا تھا کس لڑکی کو میکے سے اتنی دہکالے کو سوں بیلہ جانے کا غم نہ ہوگا۔

لیکن آج جبکہ بسواس میلی واقعی آن پہنچی تھی۔ روزی نے بڑا ہی عجیب اور غیر متوقع رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک تو وہ ساری رات رونی رہی تھی۔ اور پھر صبح سے اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے بیٹھ گئی تھی۔ پادری بسواس چاہنے

خاندانِ ننہر میں اپنے کسی دور کے رشتے دار کے یہاں اترے تھے۔ اور ٹھیک چار بجے لگی کاٹج پہنچ گئے تھے۔ اور سب پادری اور مسز بنرجی کو روزی کے متعلق پہلی بار گھبراہٹ شروع ہوئی۔

ڈینزی چائے دانی لے کر کمرے میں آئی اور الیٹھ بنرجی نے رس گلے اور جم جم ملائی جو انہوں نے دوبا۔ تمہے مہانوں کو پیش کئے۔ وہ بے چاری ہونے والے دادا کی بے انتہا خاطر کر رہی تھیں اور ابھی سے اُن واس کے بھونے پن اور شرافت پر ماتا بھرا پیارا آنے لگا تھا۔ مگر مسز بسواس بڑی خوفناک ساس ثابت دل گی۔ اس کی انھیں پریشانی تھی۔

روزی کا کمرہ ڈائینگ روم کے دوسری طرف تھا اور سنگ روم میں سے اس کا بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔ روزی بنرجی مہانوں سے باتیں کرنے کرتے بچھینی سے اس دروازے پر نظر ڈال لیتے۔ دروازے پر پڑا نیلا پردہ ہوا میں رائے جا رہا تھا۔

”روزی سسر کیا ہیں؟“ ایڈتھ بسواس نے نزاکت سے سینڈوچ اٹھا کر تھینک یو آئی کہنے کے سسر بنرجی سے دریافت کیا۔

”ابھی آتی ہے۔ ذرا اس کی طبیعت۔۔۔“ الیٹھ بنرجی نے یک بخت ذرا ہکا کر بے بسی سے اپنے ہر کو دیکھا۔

”کیا ہوا ہے۔؟“ مسز بسواس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

”کچھ نہیں ہیں۔ دن رات پڑھائی میں لگی رہتی ہے۔ آج صبح سے سر میں درد ہے۔“

پادری بنرجی نے فوراً پادری بسواس کو مخاطب کیا۔

”لدھیانے میں چند گائی کا کیا حال ہے؟ یہاں تو وار کی وجہ سے۔۔۔“

لوٹھر بسواس نے مائی ٹھیک کرتے ہوئے سرگھما کر دزدیدہ نظروں سے نیلے پردے والے دروازے

دیکھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ روزی کا کمرہ ہے۔ اور مشنری کا نفرنس کے دونوں میں روزی نے اسی سنگ میں بیٹھ کر ان کے ساتھ کیرم بھی کھیلا تھا۔ اور کیرم کے پاؤڈر کا ڈبہ لانے کے لئے وہ اس کمرے میں بھی ہو تھے۔

”او۔ آنٹی۔۔۔ میں یہ ریکارڈ دیکھ سکتی ہوں؟“ ایڈتھ نے چائے کی پیالی ختم کر کے گراموفون کی طرف مڑتے

تھے کہا۔

” ضرور ضرور۔ “ مسز بنجی نے کہا۔ وہ بے ساختہ یہ بھی اضافہ کرنا چاہتی تھیں کہ روزی کو میوزک کا بہت شوق ہے۔ مگر وہ چپ ہو گئیں۔ ایڈیٹر فرس ہراکڑوں بیچ کر میز کے نچلے خانے میں رکھے ہوئے ریکارڈ لٹائے پلٹے لگی۔ زیادہ تر وہ گھبے پٹے پرانے ریکارڈ تھے۔ جو ایک مرتبہ ڈھاکہ کے ایک انگریز افسر نے ولایت جاتے وقت مشن کپاؤنڈ بھجوا دیے تھے۔

ڈیزی نے جا کر روزی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب نہیں ملا۔

اب چھ بیٹے والے تھے۔ مسز بنجی اٹھیں۔ ڈانگنگ روم اور سٹنگ روم کا دروازہ دروازہ بھیڑا اور جا کر روزی کے دروازے پر نود سے دستک دی۔ ” روزی۔ روزی بیٹے۔ بات تو سنو۔ وہ اب روم لائی ہو رہی تھیں۔

مسز بنجی چند منٹ تک دروازے پر کھڑی رہیں۔ پھر سر جھکائے سٹنگ روم میں واپس آئیں اور شوہر کا مٹیخاڑنگا ہوں سے دیکھا۔ پادری بنجی آہستہ سے اٹھے اور اپنے پیچھے سٹنگ روم کے کواؤ بند کرتے ہوئے رفا کے دروازے پر پہنچے اور دھیرے سے دستک دی۔

” روزی۔ روزی بیٹا۔ دروازہ کھولو۔ میں ہتھار پاپا ہوں۔ بات تو سنو۔ انہوں نے سید بجا جت سے کہا۔ روزی نے دروازہ کھولا۔ پادری بنجی اندر آ گئے۔

روزی کندھوں پر بال بکھرائے سفید ساری پہنے تصویر کی مانند سامنے چپ کھڑی تھی۔ اچانک اُ کی آنکھوں کے سامنے ایک اور تصویر آگئی۔ بالکل اسی طرح انہوں نے پہلی بار نوجوان ایسٹھری کی بالا کو دیکھا تھا۔ کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے سفید ساری پہنے رائٹ ریلوینڈ ولفرڈ براؤن کی کونٹھی کے برآمدے میں خاموش کھڑی تھی، جب وہ اس سے ملنے کے لئے بلائے گئے تھے۔ اُس ایسٹھرا اور اس روزی میں اتنا فرق کیوں؟ کیا زمانہ تبادلہ گیا تھا؟ اُس ایسٹھری کی آنکھوں میں محض لاج تھی اور سپردگی۔ اس روزی کی آنکھوں سے ہمد اور اس اور خود سری کی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ اس خود سری کو آج کل کے زمانے میں خود اعتمادی کہا جاتا ہے۔ مگر وہ تو اپنی ملائی بچی کی بھلائی ہی تو چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بوڑھے باپ سے اس قدر خفا کیوں ہو گئی؟

ایک سیک روزی آگے بڑھی اور ان کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہنے لگی۔ ” پاپا۔ پاپا۔ مجھے! کر دیا میں ڈبو دینے۔ مجھے مار ڈالنے جان سے۔ مگر میں اس چند سے۔ اس۔ اس کاٹھین سے ہرگز نہ نہیں کر دوں گی۔ مجھے وہ بالکل ہند نہیں ہے پاپا۔ “ اب وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

کالین۔ پادری بنرجی ہرکے بقارہ گئے۔ ” روزی بیٹا۔“ انھوں نے ہڑبڑا کر کہا۔ ” میری
کا تو خیال کرو۔ میری بیٹی۔ لوتھر بڑا اچھا لڑکا۔“

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔“ روزی نے بچوں کی طرح مچل کر دوتے ہوئے ان کی بات کاٹی۔
”پھر گیا کرے گی۔ احمق۔“ پادری بنرجی کو ایک دم غصہ آگیا۔ ”کسی ہندو سے شادی کرے
ہے ارادہ ہے تیرا۔ ہمسلمان سے بیاہ رچ جائے گی ہاپنی ماں کا حشر بھول گئی۔ بد بخت۔“ انہوں نے
بج کر کہا اور ان کو بالکل خیال نہ رہا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے اور سننگ روم تک آواز جا رہی ہے۔ انہیں
پر سکون زندگی میں ایسا قیامت خیز وقت بھی دیکھنا پڑا۔ اور اپنی اولاد کے ہاتھوں۔ خدادند۔ میں نے
ایک گناہ کیا تھا۔ خدادند۔“

پادری بنرجی کو پتہ بھی نہ چلا کہ مسز میری بسواس پچھے آن کھڑی ہو گئی ہیں اور باپ بیٹی کا سارا مکالمہ
سجھی ہیں۔ البتہ بنرجی سمجھی ہوئی ان کے عقب میں کھڑی تھیں۔ مسز بسواس کو دیکھ کر روزی فرخندہ سے اٹھی اور
کی طرح غصائی نے میں گھس کر دروازہ زود سے بند کر لیا۔ پادری بنرجی نے مڑ کر مسز بسواس کو دیکھا اور سکتے
عالم میں کھڑے رہ گئے۔

چند لمحوں تک مکمل سکوت طاری رہا۔ اس کے بعد مسز بسواس نے زہر میں بھیجی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا
ہم کالین ہیں۔ ہنری۔“ انہوں نے سننگ روم کی طرف مارچ کرتے ہوئے لٹکا رہا۔ ”ہم اپنی انسلٹ
دلنے لہیٹانے سے آئے تھے۔ چلو اٹھو۔“

البتہ بنرجی روتی ہوئی ان کے پچھے لپکیں۔ سننگ روم میں آکر انھوں نے کہا۔ ”میں خراباپ کے
ہیں معاف کر دیجئے۔ روزی بڑی ضدی لڑکی ہے۔ آج کل کی اولاد ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ
بے کیا کہوں۔“

اس دوران میں پادری ہنری بسواس اور مسز لوتھر بسواس ”مٹم“ ”بگم“ کھڑے باقی لوگوں کو تنگ رہے
۔ مسز بسواس بلاؤز کی آستین میں سے رمال نکال کر ناک سنکتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور شعلہ بار
ہوں سے میزبان خاتون کو گھورا۔ پادری بنرجی اس اتنا میں سننگ روم سے گزرتے ہوئے جا کر باہر
ایک دریں کھڑے ہو گئے تھے اور مڑھکا کر فرخندہ کو دیکھ رہے تھے۔

اب مسز بسواس نے رمال آنکھوں پر رکھ لیا اور آفسو بہانے پر آمادہ ہوئیں۔

”چلو ڈیر۔ واپس چلیں۔“ پادری بسواس نے آگے بڑھ کر نرمی سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مسز بسواس نے غصے سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور چلاتے ہوئے بولیں۔ ”ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ لدھیانے سے چل کر راجگاری کو دیکھنے آئے۔ آپ نے خود بنا یا تھا۔ چار آدمیوں کا انٹرکلاس کا کرایہ۔“

”اوہ شٹ آپ مائی ڈیر۔“ پادری بسواس نے کوفت کے ساتھ کہا۔ لوٹھر بسواس چھینا کو تک رہا تھا۔

”چار آدمیوں کا انٹرکلاس کا کرایہ۔ لدھیانے سے ڈھاکے۔ ہم امیر نہیں ہیں۔ آپ کی طرح چرچ فونڈ کارورپہ نہیں کھاتے“

”اوہ کیپ کو ات ماما۔“ لوٹھر بسواس نے انتہائی خفت اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ والا کو خاموش کرنا چاہا۔

”تم چپ رہو جی۔ میں ان سے مسز بنجی سے بات کر رہی ہوں۔ آپ نے میں خط لکھا۔ آر نے مسز برکت مسج کے ذریعے میں پہلوا یا کہ آکر لڑکی دیکھ جاؤ۔“

”او شٹ آپ۔ ماما۔ پلیز۔“ لوٹھر بسواس نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے دوبارہ استد کی۔

”یوشٹ آپ ایڈیٹ۔ ڈیم فول۔“ مسز بسواس اب ہٹھکل ہونے والی تھیں۔ ادا ایڈتھ نے۔ ”اٹ وا ز ان دی آئی ل آن کی پری ریٹ آئی فاؤنڈ ہیر۔“ کا دقیا نو می ریکارڈ ڈگر اے نو پر لگا رکھا تھا۔ جو ریں ریں کئے جا رہا تھا۔ لوٹھر بسواس نے اٹھ کر غصے کے ساتھ ریکارڈ پر سے سوئی ہٹشادی اور بہن کو گھور کر دیکھتا ہوا کرسی پر آن بیٹھا۔

”ہم نے انکو آڑی کی۔“ مسز بسواس کہے گئیں۔ ”میں ڈھاکے اپنی سسٹرن لاکو۔ ہنری کے کزن برادر کی دانت کو خط لکھا کہ لڑکی کے حالات معلوم کرو۔ انہوں نے ہم کو لیٹر لکھا۔ میں ہنری کو بولا۔ میں نے بولا۔ راجری سسٹرن نے لکھا ہے لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ لڑکی کے ہندو تہ زینڈ ہیں۔ لڑکی کانگریسی اور کمیونسٹ ہو گئی ہے۔“

”اوہ ماما۔ پلیز۔“

” مگر یہ گدھے کا بچہ۔ مس صاحب پر لٹو ہو چکا تھا۔ کیا اگر وہ کیا میا کوٹ۔ کیا لاہور۔
 بچہ سے اس کے لئے رشتے آ رہے ہیں۔ مسز ایڈورڈ منور خاں تو ڈپٹی کلکٹر ہیں میرٹھ میں۔ ان کی لڑکی آئی۔
 ٹی میں پڑھ رہی ہے۔ اس تک کی بات آئی تھی۔ ایسا میرا بیٹا ہے۔ آپ کی لڑکی میں ہے کیا۔ ذرا
 سنوں تو۔“

پادری بنجی کر کے پیچھے ہاتھ باندھے برآمدے میں کھڑے رہے۔ ایک دم ان کی کمر تھک سی
 لگی تھی۔

مسز بسواس کی تقریباً جاری رہی۔ ” ہم تو اس گدھے کے بچے کی ضد پوری کرنے اتنی دور چلے
 آئے۔ ہے کیا آپ کے پاس۔ یہ فقط گھر۔ میرا بیٹا تو سینٹ جانز کالج میں لیکچرر ہونے والا ہے۔ ای
 ایس۔ سی پاس ہے۔ کسی خیر پادری مشن اسکول میں نہیں پڑھاتا۔“ حالانکہ وہ خیر پادری مشن اسکول ہی میں
 پڑھا رہا تھا۔

” مائی ڈیر۔“ پادری بسواس نے کہنا چاہا۔

” اما۔“ ایڈتھ نے آواز نکالی۔

” دیکھوں تو کون سا آئی سی۔ ایس مل جائے گا آپ کی لڑکی کو، جو ان کے لپٹے ہیں ڈھاکے آکر
 سن لے۔“

” میری۔ کیوں اپنی جیب خراب کرتی ہو۔“ پادری بسواس نے پھر احتجاج کیا۔

” بڑا الٹی کاٹج کا شہرہ سنا تھا۔ دیکھنی آکر ملی کاٹج۔ میں تو اپنے گھر میں ایک دن بھی ایسا سزا

لاؤ فریجنڈز رکھوں اور بھی ہم کوئی ایسی پادری کی تنخواہ پر گزار تھوڑے ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری تو گھر کی زمینداری بھی

ہے۔ خدا باپ کا ہر طرف سے فضل ہے۔ مس صاحبہ اگر آتیں ہمارے ہاں۔ نصیب کھل جاتا۔ رانی بن کر رہتیں۔“

سن بسواس یہ بالکل بھول گئیں کہ صرف چند منٹ قبل انہوں نے اپنی عزت کا شکوہ کیا تھا۔ گلاب پھر انہیں

پینا مالی نقصان یاد آگیا۔ اور انھوں نے جلا کر کہا۔ ” پانچ سو روپیہ خیر ہو گیا ہمارا۔ اتنے میں تو تھوڑا سا

جلدی سے باہر جا کر گھوڑا گاڑی لے آیا تھا۔ اس نے اندر آ کر کھلی بار غصے سے بات کی۔

” اما۔ کم آن۔ ڈونٹ کری ایٹ لے سین۔ بی۔ میو یور سیلف پلیز۔ ایہ بس کرو۔“

اپنی اما کا ہاتھ پکڑ کر انھیں تقریباً کھینچتا ہوا وہ باہر لے گیا اور گاڑی میں اٹھال دیا۔ یاد سی ہنر کی بسواس

سر جھکائے ان کے سچے سچے باہر آئے۔ ایڈتھ بسواس نے میز پر سے اٹیچی کس اٹھایا، جس میں سنہری بیل لگی
ریشمی ساری اور سنگتی کی انگوٹھی مقفل تھی۔ باہر اکروہ اچک کے گاڑی میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پادری
بسواس واپس بیٹھے اور برآمدے کے درمیں کھڑے پادری بنزجی سے ہاتھ لایا۔ ”سوری ریونڈ۔ آئی ایم
دیری سوری۔ ناٹ یور فالٹ۔“ انہوں نے رساں سے کہا۔ پادری بنزجی ہاتھ پیچھے باندھے سر جھکاتا
خاموش کھڑے رہے۔ البتھر بنزجی سنگت روم کے دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے
آنسوؤں کا سیلاب باری تھا۔ لو تھر بھی چھ تلمے قدم رکھتا برآمدے کی سیڑھی پر آیا اور سر خم کر کے کہا۔
”آئی ایم سوری اٹل۔ پلینڈونٹ مائینڈ مائی مدر۔ گڈ بائی۔“

”گورڈ بلیس یو مائی سن۔“ پادری بنزجی نے آہستہ سے جواب دیا۔

لو تھر جلدی سے واپس لوٹا اور گاڑی میں ایڈتھ کے برابر بیٹھ گیا۔ سنن کپاڈنڈ کے سارے بچے
اور عورتیں گاڑی سے ذرا فاصلے پر جمع ہو گئے تھے۔ ڈریزی کے ذریعہ خبر سارے کپاڈنڈ میں پھیل چکی
تھی۔ یکل تک ڈھا کے کی ساری نیٹو کر سچین سوماسٹی میں نشر ہو جائے گی۔

گھوڑا گاڑی لٹی کاٹج کا چکر کاٹ کر پھانک کی طرف بڑھی۔ لو تھر بسواس کھڑکی میں سے سر
نکال کر تازہ ہوا نتھنوں میں داخل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب گاڑی کپاڈنڈ سے باہر جانے لگی تو
اس نے دیکھا کہ روزی بنزجی لٹی کاٹج کے پھوڑے اپنے غسٹوانے کی سیڑھیوں پر سنگی مورت کی
مانند ساکت بیٹھی ہے۔ لو تھر بسواس نے احمقوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر اُسے دیو کرنا چاہا۔ مگر ہاتھ
مفلوج سا ہو گیا تھا۔ گاڑی چرخ چوں کرتی کچی سڑک پر آگئی

لٹی کاٹج کے اندر پادری بنزجی اپنے کمرے میں جا کر ایک کونے میں بیٹھے پھوٹ پھوٹ کر
رور رہے تھے۔ انہیں روزی کے انکار سے زیادہ اس انکشاف سے دھکا لگا تھا کہ انہیں معلوم بھی
نہیں ہوا مگر دنیا بدل چکی ہے۔ ہمیشہ کی طرح صابر دشا کر گری بالا بنزجی آنسو خشک کر کے جا رہا
سامان سگوانے میں مصروف ہو گئیں۔

شانتی نکیتن

اپریل ۱۹۴۱ء۔ دیپالی سرکار دوسری سدن کے سامنے گھاس پر بیٹھی تھر ڈاؤن کے آخری پرچے کی تیاری میں مصروف تھی۔ جب ایک لڑکی نے قریب سے گزرتے ہوئے چند لفافے اس کے سامنے گرا دیئے۔ روزانہ جب ڈاک آتی تھی۔ اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ اس شام کے بعد سے وہ ایسا غائب ہوا۔ اس کی طرف سے نہ کوئی خط آیا۔ نہ کوئی مندیش۔ نہ کوئی بادل۔ نہ کوئی راج ہنس اور جب اہل کمار داس نے چار اس بار لو کے متعلق دریافت کیا تو وہ کچھ نہ بتا سکی۔ کیونکہ روزی بمرجی نے ڈھاکے سے کسی خط کا جواب نہ دیا تھا۔ اس کے لئے اتنا غم، اتنی فکر، اتنی پریشانی سب بیکار ہے نا۔ آج اتنے سینے گذر گئے۔ ستمبر میں اس شام کو چھہ سینے گذر گئے۔

دیپالی نے پہلا لفافہ کھولا جہاں آرا کا خط تھا۔ ڈرگا پوجا کی چھٹیوں میں جب وہ ڈھاکے گئی۔ جہاں آرا اپنے ملاتے پرفریم پور گئی ہوئی تھی۔ روزی کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ پارری صاحب نے اسے چھٹیاں گزارنے اپنی بہن کے پاس لال میرٹھ بھیج دیا ہے۔ اومادیہ کلکتے میں تھیں۔ دیپالی نے ساری چھٹیاں اپنے بھائیوں کے ساتھ لوڈو کھیلنے میں گزار دی تھیں۔ اب امتحان کے بعد گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوں گی۔ اور پھر وہ چند رکنج واپس جائے گی۔ جولائی میں کالج کھلے گا۔ پھر یہاں آجائے گی۔ اگلے سال بی اے کرے گی۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔؟

جہاں آرا نے دکھا تھا۔

”روزی کا قصہ تو اب خاصا پرانا ہو گیا۔ جب ملوگی تو پوری داستان سناؤں گی۔ ستمبر بمرجی اتنی کے پاس آکر رونارو رہی تھیں۔ روزی تو اس بات کا بالکل ذکر ہی نہیں کرتی۔ لال میرٹھ سے واپس آکر پڑھائی میں مصروف ہو چکی ہے۔ خیر تھر ڈاؤن کی ایسی پڑھائی بھی کیا۔ تم لوگ مجھ پر خواہ مخواہ رعب جھاڑتے ہو۔ بڑی آئیٹل بے چاریاں بی اے اسٹوڈنٹس۔ اور بھئی ہم نے جو کہا تھا انٹر کے بعد گھر بیٹھے مزے کر رہے ہیں۔ مزے کیا کر رہے ہیں دیپالی، یہ تو بالکل غلط ہے۔ آبا کا حکم کیسے مالا جا سکتا ہے۔ آبا اعلیٰ تعلیم کے

حامی نہیں تو پھر ایف اے تک ہی کیوں پڑھایا تھا۔ پچھلے سال مارچ میں جب ابا مسلم لیگ کے اجلاس کے لئے لاہور گئے تھے ناچب پاکستان ریزولوشن پاس ہوا تھا۔ تو لاہور سے واپسی پر علی گڑھ پہنچے آئے تھے۔ اور آکر کہنے لگے کہ میں تم کو بی۔ اے کے لئے علی گڑھ بھیج دوں گا۔ مگر اس کے بعد پھر ارادہ بدل دیا۔ جانے ابا کے دل میں آئے کیا پروگرام ہے۔ ان سے کون پوچھ سکتا ہے۔

”مگر روزی نے کمال کر دیا۔ سڑلو تھر بسواس بے چارے کو بہری جھنڈی دکھادی۔ میں نے روزی سے کہا کہ تم میں دونوں اپنے اپنے ماحول کے پروردہ ہو۔ تم بغاوت کر کے کہاں جاؤ گی۔ اور وہ اونچی ذات کے بنگالی ترمسین آقا قدامت پرست ہونے پر آمیں تو ان کا کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگی۔ سولیدرنی مجھے سہارا دے گی۔ میں نے اپنے آپ کو سولیدرنی کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اور روزی کس قسم کی باتیں کرتی ہو اور کیا کرنے والی ہو۔ اللہ تم لوگوں کی عقلیں ٹھکانے پر رکھے۔

”باقی ڈھاکے کے حالات بدستور ہیں۔ تمہاری اوارائے کلکتہ ہی میں ہیں۔ ایک خبر یہ ہے کہ نیر بھائی کی منگنی ہو گئی۔ وہ شمسہ خاں نہیں ہیں۔ امی کی پرانی سہیلی۔ جو سنگس لیگے میں رہتی ہیں ان کے جیٹھ کی روٹی سے۔

”ہاں اس پر یاد آیا کہ شمسہ خاں کے پڑوس میں جل پائے گوری سے ایک مولوی صاحب آکر رہے ہیں۔ مولوی عبدالمجید خاں۔ ان کی روٹی یا سمین میٹرک میں پڑھ رہی ہے تو بیگم عبدالمجید نے خاں سے کہا کہ یا سمین کی انگریزی کمزور ہے کوئی استانی اس کے لئے لگوادیں۔ شمسہ خاں نے مجھ سے ذکر کیا تو مجھے ایک دم روزی کا خیال آیا۔ اور میں نے روزی سے ان کی بات چیت کرادی۔ یا سمین میرے ہاں آئی تھی۔ خاصی دلچسپ روٹک ہے۔ مگر مجھے کچھ خبیطی سی معلوم ہوتی ہے۔ جب اس کی امی کمرے سے چلی گئیں تو مجھ سے چپکے سے بولی۔ آیا۔ یہ امی اور ابا بے کار نبھے آگے پڑھانے کی فکر میں ہیں۔ میں تو ڈانسرنوں کی۔ میں بسو چکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اور میں نے کہا۔

بی بی۔ اتنا قدامت پرست خاندان تو تمہارے باپ کا ہے تم کس طرح ڈانسرنو گی۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ اور ڈھاکے میں جہاں ایک ہزار مسجدیں اور بیس ہزار مولوی ہیں یا سمین بی بی تمہ نے ناچ سیکھ بھی لیا، تو ناچو گی کہاں جا کر۔ مگر وہ سربلا کر کہنے لگی۔ آیا۔ دیکھ لینا۔ ایک دن میں ڈانسرن کر ہی دکھا دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں اگر اس کے ابا یہ بات سن لیں تو اس کا گلا ہی گھونٹ دیں۔ واقعی۔ مگر یہ آج کل کی روکیاں ہیں بھائی۔ بہر حال تو اب روزی بھتیجے میں چار دن سگن لیگے جا کر یا سمین کو انگریزی پڑھا رہی ہے۔ اچھا ہے اس کا حیب خرچ نکل آیا۔

روزی کے لئے بڑا دل دکھتا ہے۔ چپ چپ سی رہتی ہے اور اکثر بہت پریشان نظر آتی ہے۔

اب تم امتحان دے کر آؤ۔ تو اطمینان سے گپ شپ رہے گی۔“

تمہاری - جہاں آرا

اس خط سے دیپالی کو کچھ اندازہ ہوا کہ اب تک روزی نے اس کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔
دوسرا خط بابا کا تھا۔

”میں خیریت سے ہوں۔ کھو کھو۔ شو نو۔ تو تو بھی اچھی طرح ہے۔ تمہاری گھر سے غیر حاضری کی وجہ سے
بگرائی رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس لئے وہ بے حد شیطان ہوتا جا رہا ہے۔

”تم کو پیسوں کی ضرورت ہو تو فوراً لکھ دیا کرو۔ کبھی نہ سوچو کہ میں تمہیں پیسے نہ بھجوا سکوں گا۔
”کل ایک بڑی افسوسناک بات معلوم ہوئی۔ تم کو بھی معلوم ہو کر رنج ہوگا۔ دیدی نے گو دام
کرو صوب میں سکھانے کے لئے پرانے کپڑے باہر نکلے۔ ڈیڑھ دو سال سے بڑا صندوق نہیں کھولا تھا۔
حالات تو تمہاری ماں کی تین باجوہ ساڑھیوں غائب تھیں۔ چور کہ صبر سے آئے، اب چوری ہوئی۔ کچھ کچھ
تا۔ مجھے بھی بے حوصلہ ہوا۔ کیونکہ یہ میری ماں کی ساریاں تھیں۔ جو انہوں نے تمہاری ماں کو دی تھیں
یاں تمہیں معلوم ہوگا۔ پرانے خاندانوں میں دلہنوں کو دی جاتی تھیں۔ اور تمہارا بے چاری ماں نے
دن بہوؤں کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ انھیں بننے والے مرشد آباد کے مسلمان کارمگر کب کے مہکے گئے۔
ن بھی ان کے ساتھ گیا۔ اب یہ ساریاں ملتی نہیں ہیں۔ دیدی تو چوری کے علم اور دہشت سے تقریباً پارت
۔ تم جانتی ہو وہ پہلے ہی سے اعصاب زدہ ہیں۔ ان کو فکر ہے کہ چوروں نے گھر دیکھ لیا تو باقی سامان
جائے گا۔ اور مجھے یہ اطمینان ہے کہ ہمارے گھر میں اور کوئی شے چوری کے لائق ہے ہی نہیں۔“
بابا کا خط لگانے میں واپس رکھ کر دیپالی گم سم سر جھکائے بیٹھی رہی اور گھاس کی پتیاں توڑاکی۔
نے گھڑی دیکھی اور لائبریری جانے کے ارادے سے یونیورسٹی کی طرف روانہ ہو گئی۔

شام تک دیپالی لائبریری میں اپنی مخصوص چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھی پڑھنے میں مہمک رہی کھڑکی کی
باہر اونچی اونچی گھاس اٹی ہوئی تھی۔ کتابوں کی اماریوں میں پرانے کاغذوں کی مہک رچی تھی۔ میٹر
ہال سے باہر جا چکے تھے۔ دیپالی کتاب بند کر کے سوچنے لگی۔ صبح ڈاک خانے جا کر ٹکٹ خریدے گی۔
لکھے گی۔ (جہاں آرا کا خط فوری طور پر جواب طلب نہیں تھا) ساریوں کے چوری کے متعلق اپنے
لہا کرے گی۔ مگر یہ دوہری زندگی جو وہ دوڑھائی برس سے گزار رہی ہے۔ اس کا انت کیا ہے؟

دقتی جو شش و خروش گذر جانے کے بعد جب ضمیر ملامت کرتا ہے کہ بابا کو اس طرح دھوکے میں ڈرا تو اس ضمیر کا کیا علاج کیا جائے؟ ضمیر کیا ہے؟ میں کون ہوں۔؟ دشوا بھارتی کی کھڑکی میں بیٹھ ہوئی یہ لڑکی کون ہے؟ ریمان داہا کون ہیں؟ امارائے اور روزی ہنرجی کون ہیں؟ گرو دیو اور اکتے اندر جہاں آزار۔ ڈاکٹر جوئے چند سرکار؟ آتامیں؟ پچھلے سنکاروں کے بنائے ہوئے ذہن؟ کیا ایک ایک قدم ایک ایک حرکت پہلے سے مقدر ہے یا محض حادثے کا نتیجہ ہے۔ "اقتصادی، سماجیاتی تازہ خواہ"۔؟

ایک مور نہایت غرور سے سر اٹھائے کھڑکی کے نیچے سے گزر گیا۔ عرفانیت اور رومان اور فطی کے اس گرو میں۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر اس سرخ آرنسٹک مکان کے اندر گرو دیو ابھی تازہ سوالات کا جواب دینے کے لئے موجود ہیں۔

لیکن راستہ کیسے معلوم ہے؟

سولیڈرٹی۔! سولیڈرٹی میں جواب۔ شاید۔ موجود ہے۔

اٹھو۔ دیپالی۔ وہ اکثر، چوبیس گھنٹے وقت کے اندر دنی سفر میں خود سے کہتی رہتی۔ اٹھو۔ اب یہ کام کرنا ہے۔ اب یہاں سے جانا ہے۔ اب یہ پڑھنا ہے۔ اب اس سے بات کرنی ہے۔ ٹھکومت۔

وہ کھڑکی میں سے اٹھی اور کتابیں سمیٹ کر باہر نکلی۔

۱۳

س روزی ہنرجی اور سولیڈرٹی

روزی ہنرجی بسوا اس فیملی کی کاڑھی کیا ڈنڈے سے باہر نکل جانے کے بعد غسل خانے کی سیڑھی پر ساکت و صامت بیٹھی رہ گئی تھی۔ جس وقت میز بسوا اس سبنگ روم میں دھاڑی تھیں وہ غسل خانے کے کواڑ سے کان لگائے کھڑی تھی۔ اور اس نے سنا تھا "ہم نے انکو انری کی۔ میری سسٹران لانے لکھا لڑکی کی شہرت اچھی نہیں ہے۔ اس کے ہندو بوائے فرینڈز ہیں۔ لڑکی کا ٹریسی کیونسٹ ہو گئی ہے"

وہ دھک سے رہ گئی۔ یہ خبر کس طرح پھیلی، اب پاپا اس کا کس طرح قیام اور بھرتہ بنائیں گے۔ اُسے بڑا تعجب ہوا جب اس نے رات کو اپنے کمرے سے باہر نکلی کر دیکھا کہ پاپا اور ماد دونوں نے اس ایک لفظ نہیں کہا۔ پاپا روتے رہے تھے (یہ دیکھ کر اس کا دل کٹ کر رہ گیا) اور ماما کی بھی آنکھیں دھجی ہوئی تھیں۔ مگر وہ دونوں خاموش تھے۔

پادری بزرگی کی یہ خاموشی وقتی نہیں تھی۔ اس روز کے بعد سے انہوں نے اپنی اکلوتی لڑکی سے لہجہ اچھا تقریباً بند کر دی۔

ریورنڈ بزرگی کی خفگی روزی سے محض اس بنا پر نہیں تھی کہ اس نے نوکھر بسواس اور اس کے ننان کے سامنے ان کو اس بُری طرح شرمندہ کیا۔ انہوں نے دوسرے ہی روز مختلف ذرائع سے روزی سرگرمیوں کے متعلق معلوم کر دیا تھا۔ اور ان کو پتہ چلا تھا کہ مسز بسواس کی ماہجر می سسٹر کی اطلاع تھی۔ روزی بزرگی اکثر بات برات شہر کے کولون کھردوں میں بند لٹھ، قند پر دان اور حکومت باغی اور غدار ہندو اور مسلمان نوجوانوں کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔ اس اطلاع نے ریورنڈ بزرگی کا جھکا دیا تھا۔

اسکا دوران میں چارلس بارلو کے متعلق دیپالی کا خط پہنچا۔ روزکانے وہ خط پڑے پڑے کر کے آتش کر دیا۔ اور لرز کر سوچا۔ مجھے جیل بھیجا جاسکتا ہے۔ مگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ میرے لیے دیپالی آیا کے بھیس میں کینٹ ویل کے جنگلے پر پہنچی تھی۔ تو مجھے جیل ہو سکتی ہے۔ میں اپنے سیدھے نیک دل باپ کو کس تصور میں مزادے رہی ہوں؟ کیا یہ ان کا تصور تھا کہ ماما کو بال و دھوا بنا پڑا۔ پانے سیٹ کی خاطر مذہب تبدیل کر لیا۔ میری سمجھ میں یہ چند باتیں آگئی ہیں، تو کیا دنیا کے حالات بدل جائیں گے؟

وہ اب خاموشی سے کالج جاتی اور واپس آکر اپنے کمرے میں پڑھتی۔ تعطیلات میں ایسٹرن بزرگی نے شوہر کو سمجھا بھجا کر اس کے لئے لال مینرٹ کا گٹ منگوادیا۔ شمالی بنگال سے واپس آکر وہ پھر اپنی اتنی میں لگ گئی۔ کبھی کبھار جہاں آرام کے اصرار پر ارجمند منزل چلی جاتی۔ مگر ارجمند منزل کی امارت اور کش اسے اور زیادہ مضطرب کرتے۔ یہ لوگ اتنے امیر اور باعزت ہیں۔ میں غریب اور کم حیثیت ہوں۔ میا چرنین لوگ میرے گھر آکر میرے ماں باپ کو ان کے افلاس کا طعنہ دے کر چلے جاتے ہیں اور میرا

باپ میری خاطر آنسو بہاتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں۔ میں اس کا حل کس طرح تلاش کروں۔ پھر جہاں آرا نے اس کے لئے مولانا صاحب کے ہاں سگن بگھیچے میں میوشن لگا دیا۔ (دوہ لڑکی یا سین بھی خاصی باؤلی سی تھی۔ جانے ہم لوگوں کا کیا حشر ہوگا) اور وہ شام کو وہاں جانے لگی۔

ایک روز وہ میوشن کا شکر یہ ادا کرنے کے لئے جہاں آرا کے یہاں ارجمند منزل گئی تو جہاں آرا نے بڑی حیرت سے اُسے دیکھا۔ شمالی بنگال کی برہمن عورتیں بی گوری گوری ہوتی ہیں! اور روزی بھی اپنے سفید اور حسین رنگ و روپ کے لئے مشہور تھی۔ جہاں آرا نے اس سے کہا۔ ”روزی۔ تم تو بالکل سپی پڑ گئیں تم نے ان کو چلتا کیا۔ بہت اچھا کیا۔ اب گیوں بکس رہی ہو؟ سوچو، تم میں اتنی ہمت ہے کہ انکار کر دو۔ مگر جب میری اس طرح شادی طے کی جانے گی تو میں سر ہچک کر ہاں کر دوں گی۔“

”تمہاری شادی۔ جہاں آرا۔؟“ روزی نے پوچھا۔

اچانک جہاں آرا کا ڈونگیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

”جیزس کرائسٹ۔ تم کو کیا ہو گیا جہاں آرا۔“ روزی نے گھبرا کر کہا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔“ جہاں آرا نے آنسو پوچھ کر کہا! اور سیدھی ہو بیٹھی۔

روزی نے پہلی بار جہاں آرا کو تعجب سے دیکھا۔ یہ خوش قسمت، باعزت، پردہ نشین رئیس رادی جو بیرونی دنیا کے خطروں اور مصیبتوں سے محفوظ و امون اپنی مجلس میں آرام سے بیٹھ رہے۔ اسے کیا شکر ہے، صرف یہی کہ جہاں آرا نے کیسے آدمی سے شادی ہوگی۔ ساری پردہ نشین لڑکیوں کا محض یہی ایک مسئلہ تھا۔ جہاں آرا۔ روزی اور دیپالی دونوں سے بڑی تھی۔ اور روزی کو یاد آیا۔ کچھلے سال ایک مرتبہ ماہاکہ رہی تھیں۔ بیگم قمر الزماں اس فکر میں گھلی جا رہی تھیں کہ جہاں آرا جو بیس سال کی ہو گئی۔ اپنے ہیر پتہ دوسلہ کے لڑکے جاہل اور نکمے ہیں۔ متوسط طبقے میں بیاہ دینے سے ناک کٹ جائے گی۔ اس کے علاوہ جہاں آرا کی شادی کے سلسلے میں اور کیا مسائل تھے۔ ان کا ذکر بیگم قمر الزماں نے مسز بزمجو سے نہیں کیا تھا خود جہاں آرا نے اپنے نجی معاملات کے بارے میں اپنی سہیلیوں سے آج تک کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا جہاں آرا کی اچھی خاصی شکل تھی گو وہ دیپالی کی طرح دلکش اور روزی کی طرح گوری نہ تھی۔ لیکن وہ سمجھ دار حساس اور خاموش طبیعت لڑکی تھی۔ اس کا ایک بڑا بھائی اور دو چھوٹی بہنیں تھیں۔ لیکن وہ ان میں مختلف اور علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔

روزی نے آج تک جہاں آرا کی ذاتی زندگی کے متعلق نہ سوچا تھا۔ اسے اور دیپالی کو کالج کے
 رازوں اور اب سیاسی مسائل ہی سے فرصت نہیں تھی۔ ہم سب اپنی اپنی دلچسپیوں اور اپنے آئیڈیلز کے سلسلے
 میں کتنے خود غرض ہیں۔ روزی کو اس وقت پہلی بار خیال آیا۔ اس نے دوبارہ جہاں آرا پر نظر ڈالی، جو اپنی شاندار
 نوابگاہ میں مسند پر نیم دراز پھر چپکے چپکے رو رہی تھی۔

”جہاں آرا —“ روزی نے الجھن سے کہا۔ وہ کچھلے چند مہینوں میں بڑی ہو گئی تھی اور خود کو بوجھ
 لورت سمجھنے لگی تھی۔ چند ماہ قبل اگر وہ جہاں آرا کو اس طرح روتے دیکھ لیتی تو فیوڈل روڈ ٹیک سپروٹن، کہہ کر
 اس کس طرح لے نہ چڑاتی۔

پھر روزی نے سوچا۔ میں اور دیپالی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے پاس سولید ٹری موجود ہے۔ جو ہمارے
 ذاتی اور جذباتی مسائل سلجھانے میں ہماری مدد کرے گی۔ مگر بے چاری جہاں آرا، واقعہ یہ ہے کہ اپنے جاگیر
 مذہبی رجعت پسند تمدنی حصار میں قید ہے۔ اور اسے سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ نہ یہ کچھ سمجھنا چاہتی ہے۔
 پھر جہاں آرا مسند سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اپنی جاہلانی کی ساری کے پلو کو ایک بازو
 پر لپیٹتے ہوئے اس نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ ”روزی — ذرا اپنی صورت دیکھ آئیے میں
 اتنے دنوں میں ایسی زرد پڑ گئیں تو ابھی سے سوچ لو کہ کس حد تک بغاوت کر دو گی۔“
 ”سولید ٹری —“ روزی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”وہ کس بلا کا نام ہے۔ جہاں آرا نے غصے سے کہا۔ پھر اس نے ملازمہ کو چائے لانے
 کے لئے آواز دی۔

”میں نے سولید ٹری کے لئے خود کو وقف کر دیا ہے۔ وہی مجھے سہارا دے گی۔“ روزی
 نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

جہاں آرا نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔

”تم کو کچھ معلوم نہیں جہاں آرا میگم کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے۔“ روزی نے اب ذرا با
 آواز میں کہا۔

”تمہیں معلوم ہے؟“

روزی خاموش ہو گئی۔

مآلانقرنی کشتی میں چائے لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرا کی چھوٹی بہنیں انجم آرا اور اختر آرا مشورہ مچاتی اندر آ گئیں۔ جہاں آرا فوراً ہنس ہنس کے اور مصنوعی بشاشت سے ان کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ روزی چپ چاپ کشتی کے گنگا جنی نقش و نگار کو دیکھتی رہی

”اور سناؤ روزی۔“ جہاں آرا نے چائے بنا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری شاگرد اور مستقبل کی مشہور رقاصہ یا سمن مجید کے کیا احوال ہیں۔“

۱۴

آمار پرانیر آرام مونیر آئند۔

بی اے پر یو ایس کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ مگر دیپالی موسیقی کے ایک اعلیٰ امتحان کی تیاری کے سلسلے میں مزید چند ہفتوں کے لئے شانتی نکلیتے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ساری درسگاہ تقریراً سناٹا ہو چکی تھی۔

آخری کی ایک گرم شام وہ کلابھون کے باغ میں گھاس میں ڈولے گوتم بدھ کے مجسمے کے نیچے بیٹھی قدیم راگوں کے ایک ”شجرے“ پر سر کھپا رہی تھی۔ جب درختوں میں سے نکل کر اس کو آرا اس آس کے سامنے نمودار ہوا۔ اہل ایک خوش مزاج لڑکا تھا۔ ہر وقت باچھیں کھلیں رہتی تھیں۔ سامنے آکر نمسکار کرنے کے بعد اس نے ایک کتاب دیپالی کو دی۔

دیپالی نے کتاب کھولی۔ اس میں سے حسب توقع ایک پرچہ نکلا۔ دیپالی کا دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا۔ پرچے میں لکھا تھا۔

”پیاری بچی۔“

معاف کرنا تم کو اتنے طویل عرصے تک کوئی خیر خبر نہ بھیج سکا۔ (انداز تحریر کیسے قوی و مستثنیٰ تھا۔ کمال کی تکنیک ہے۔ واقعی دیپالی نے سوچا) تم نے اس بار میں خاصی بری طرح لیٹ ڈلو نہ کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کوئی زبردست مجبوری رہی ہوگی۔ بہر حال۔ اب اہل تم سے جو کہتا ہے اس پرچہ۔

از جلد عمل کرو۔ اس میں تمہارا بہت فائدہ ہے۔ فقط۔“

”ریحان داد سمبر کے مہینے سے کھلنا اور اس کے بعد سے نوا کھالی میں تھے آج کل وہ خاص الخاص میں ایک جگہ چھپے ہوئے ہیں۔ میں اُن کے پاس سے کل ہی واپس آیا ہوں۔ ریڈیو کی نئی بیڑی ساتھ۔“ اعلیٰ اطمینان سے گھاس پر بیٹھ گیا۔

”مگر ریحان دانے مجھ سے کیا کرنے کو کہا ہے؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”بتاتا ہوں دیدی۔ بتاتا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ ڈھا کے واپس گئیں۔ مگر اتنے میں معلوم ہوا ابھی۔“

”اعلیٰ بات بتاؤ۔“ دیپالی نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔

”بات۔ بات کچھ بھی نہیں۔“ اعلیٰ نے کھیسیں نکال کر چاب دیا۔ ”ریحان دانے آپ کو بلایا ہے۔“

”کیا۔؟“

”ہیں۔ دیدی۔؟“

”مجھے سندرن کیوں بلایا ہے؟ وہاں پہنچنا آسان ہے؟ اور کس لئے؟“

”پہنچنا آسان بالکل نہیں ہے۔ بڑا خطرناک سفر ہے، دیدی اور کیوں بلایا ہے۔ یہ مجھے کیا معلوم۔“

”نہی کہا تھا۔“ بخا دیپالی دی کو فوراً یہ سندریہ دو کر ایک سیدہ ایم میٹنگ میں ان کی شرکت ضروری ہے۔“

”اور کون کون جا رہا ہے۔“

”دادا نے کہا تھا دیپالی دی کو بتا دینا کہ سریندر دا، محفوظ الرحمن میاں، اور ان کی بیوی عائشہ

گے۔ باریسال سے۔ یہاں سے آپ ہوں گی اور محمود الحق دا ڈھا کے سے پہنچیں گے۔ کانفرنس ہے۔

ن نے تھوڑی سی چیزیں بھی منگوائی ہیں، لیتی جائیے گا۔“ اعلیٰ نے کرتے کی جیب سے ایک فہرست نکال

ن۔ فہرست میں چند نئے اخباروں اور بھٹانوی رسالوں کے نام لکھے تھے۔

”دادا کو بس ان کتابوں کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہئے؟“ دیپالی نے تعجب سے پوچھا۔ اعلیٰ کا دل

کھانے کھانے کو بھی تو چاہتا ہوگا۔ میں۔۔۔“

”یہ کچھ نہیں بتایا۔ لے جائیے ایک آدھ اچار چٹنی۔“

”اور میں جاؤں گی یہاں سے کس طرح؟“

”آپ یہاں سے راناگھاٹ اسٹیشن تک ایسی جائے۔ ریجان دا کا ایک آدمی آپ کو راناگھاٹ اسٹیشن پر ملے گا۔ وہ آپ کو جیسور کے راستے سے کھلنا تک پہنچائے گا۔ وہاں سے ایک اور آدمی کو باگھیراٹ تک لے جائے گا۔ باگھیراٹ سے۔“ اگلے پندرہ منٹ اس نے دیپالی کو ریجان پہنچنے کا پتہ راستہ سمجھانے میں صرف کئے اور ایک تنکے سے مٹی پر دریاؤں اور ٹریوں کا نقشہ بنایا دیپالی آنکھیں پھیلنے نقشہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔

پھر اہل جلدی سے اٹھا اور مداری کی طرح جیب سے نکال کر دستوں کے نوٹ اسے تھما دیئے۔
”یہ کیا ہے؟“

”ریجان دانے بھجواتے ہیں کرائے کے لئے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ دیپالی سے کہنا آج کل ہم بہت سخت رئیس ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تم لوگ جلدی سے آکر جنگل میں تھوڑا سا جشن منا جاؤ۔ پھر پیٹنے ہو جائیں گے! اور اس کے بعد اور بھی نہ جانے کیا ہو جائے۔“

”یہ بیکار کی بات ہے۔“ دیپالی نے متانت سے کہا۔ ”تمہارے ریجان والے بعض مرتبہ ایسی ڈرینک باتیں کیوں کرنے لگتے ہیں۔“ اُس نے نوٹ اپنے بیگ میں رکھ لئے۔

”اچھا اب میں بھاگتا ہوں دیدی۔ آپ کو جس دن روانہ ہونا ہو، مجھے ایک پوسٹ کارڈ ڈا دیکھئے گا۔ میں آپ کو یہاں سے راناگھاٹ جانے والی ٹرین پر بھجال دوں گا۔“ اہل سر سے اوپر ہاتھ اٹھا کر اسے نمسکار کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا سر کی طرف چلا گیا۔ دیپالی کو تم بدھ کے کا اونچے مجسمے کے پیروں کو غور سے دیکھنے لگی۔ کلا بھون کے جس فنکار نے یہ مجسمہ بنایا تھا وہ واہ بڑا زبردست ماہر اناٹومی تھا۔ کیوں کہ پاؤں کی ایک ایک انگلی کا ایک ایک جوڑا اور ناخن بے حقیقی معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے دوسرے شیا ملی بھونیزوں کی رپواریوں پر بنے ہوئے سیاہ مجسمے بڑے جاندار سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میگھ دوت کے ایشیج پرور کھڑی ہے! درڈیکور کی مورتیاں اُسے گھور کر دیکھ رہی ہیں۔ اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ بادل خلیج اور سندربن کے اوپر سے بہتے بیربھوم کی سمت بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر زرد ڈال کر دھیان سے دیکھا تو سیاہ بادلوں میں ایک سفید لنگہ اوپر اڑتا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوب ہو سکرانی اور اس کا چہرہ بھی مبتسم تھا۔ پھر اس نے جلدی جلدی ہوسٹل کی سمت قدم بڑھانے شروع

رات کو اپنے کمرے میں لیمپ کے سامنے بیٹھ کر خود سے کہا۔ اب میں اپنے باپ کو ایک اور ست دھوکا دیتی ہوں۔ اُس نے لکھا۔ بابا۔ یہاں سے لوگ گیت جمع کرنے والوں کی ایک ٹولی ل پرگنہ کے گاؤں میں جا رہی ہے۔ انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہنا ہے۔ کیونکہ یہ فوراً ہی آٹ میوزک کے دوسرے پرچے کے لئے بہت کارآمد ثابت ہو گا۔ میں جلد ہی گھر پہنچنے کی کوشش کی۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ آپ کی بیٹی، دیپالی خط بند کر کے وہ باہر آئی۔ نیم تاریک روضوں اور سنسان باغ میں سے گزرتی سرک تک پہنچی تھیں بند کر کے خط لیکر جس میں گرا دیا۔

۱۵

سندربن

سندربن کا سلسلہ جنوبی بنگال میں جو میں پرگنہ سے لے کر باقرگنج اور کھلنا کے اضلاع تک پھیلا ہے۔ ان گھنے اور پرخطر جنگلوں میں مشہور عالم رائل بنگال ٹاؤننگ اور چیتے اور ہرن دوڑنے پھرتے ہیں۔ ان کے وقت رات کا سا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ لاتعداد ندیوں اور سبزیروں اور سمندری کھاڑیوں لہلوں اور سندری درختوں کی اس لڑخیز حسین و جمیل کائنات میں، اکاد کا پھیروں اور کھڑوں کی ان گھنے جھرمٹوں میں پوشیدہ ہیں۔ سندربن کا یہ وسیع و عریض علاقہ دنیا کے حسین ترین اور خطرناک ترین

میں سے ہے۔

دیپالی سرکار کی کشتی باگھیراٹ سے روانہ ہو کر ایک نامعلوم منزل کی طرف بہتی جا رہی تھی۔ چاروں طرف کے مہتاباگ حد خود بصورت مناظر کو دیکھ دیکھ کر سکتے ہیں جیسی تھی۔ اور اس کا دل دھوکا ما۔ وہ ریکان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

ریکان دا — جیپوں کی چپ شپ اور کائنات کی اس آبی اور سبز سمفنی میں یہی نام مرتعش — وہ ریکان دا سے ملنے جا رہی ہے۔

دن بھر چلتے رہنے کے بعد کشتی شام کو ایک گاؤں کے گھاٹ پر پہنچی۔ سنسان جیٹی پر ایک بوڑھا

مسلمان جس کی سفید دائرہ سی ہوا میں لہرا رہی تھی لائین ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ دیپالی اپنا اٹیچی کیس (یہ تازہ اٹیچی کیس!) اور تھیلا اٹھا کر بانس کی جھٹی پر اتاری۔ تاج نے کھلنا کی ساحلی بنگلہ میں بوڑھے مولوی سے کوئی کہی۔ مولوی نے لائین اٹھا کر دیپالی سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ بیٹی۔“

کشتی پانی پر واپس چلی گئی۔ دیپالی اب بھوکے عالم میں اس ازلی جنگل میں تہنا کھڑی تھی۔ میں کہاں سے کہاں آگئی۔ اس نے جبرت اور خوف کے ساتھ سوچا۔ لیکن دیکھان اس راستے کے سر پر موجود ہیں! محفوظ ہوں۔

بوڑھے نے اس کا بکس اور تھیلا اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ اس کے ساتھ جھٹی پر سے اتر کر پگڑی باندھی۔ آگئی۔ بوڑھا بلا کی پھرتی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ شاید اس بوڑھے نے اپنی ساری عمر اسی جگہ پر گزاری ہے اور اسی جگہ اسی حالت میں مر جائے گا۔ ہم نے اس کے لئے کیا کیا ہے اور کیا کر پائیں گے؟ یہ سوچ کر دیپالی حسب عادت نئے جوش کے ساتھ اپنی رفتار تیز کر دی۔

”باقی لوگ آگئے؟“ دیپالی نے بوڑھے سے پوچھا۔

وہ چُپ رہا۔ دیپالی کو تکلیف ڈر سالگا۔ پھر اس نے سوچا۔ شاید یہ میرا شہری لہجہ نہیں سمجھ سکا۔ اس نے اپنا سوال دہرایا۔ ”دوسرے لوگ جو آنے والے تھے۔“

بوڑھے نے نفی میں سر ہلادیا۔ دیپالی متفکر ہو گئی۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر میں اتنی دہشت زدہ کیوں ہو رہی ہوں۔ حد ہے۔ اگر میں نے کوئی حماقت کی ہے تو۔ تو اُسے بھگتنا پڑے گا۔ او ماں۔ او ماں۔ او ماں۔ دیپالی نے بے طرح ہڑبڑا کر دیوی سے دعا پڑھا۔ مانگنا شروع کر دیں۔

آدھ گھنٹے میں وہ لوگ درختوں کے ایک جھرمٹ میں پہنچ گئے۔ جس کے ایک طرف ندی رہی تھی۔ سائیکلوں کے تعبیروں سے شکستہ لیکن خوبصورت بانس کا جھونپرا سامنے کھڑا تھا۔ برآمدے پر بیچوں کی سیلیں چڑھی تھیں اور طاق میں دیا جل رہا تھا۔ مولوی نے بکس اور تھیلا برآمدے کے کچے فرش پر رکھ کر آواز دی۔ ”زینب!“

ایک بوڑھی عورت پیوندوں سے بھری اودی ساری پیٹے اندر سے نکلی۔ اس نے جھک کر دیپالی کو غور سے دیکھا اور مسکرائی۔ ”آؤ۔ آجاؤ۔“

دیپالی نے اسے نمسکار کیا اور اس کے پیچھے پیچھے تین کردوں کے صاف تھرے جھونپڑے میں داخل ہوئی۔
 ”تمہاری کھاٹ میں نے اپنی کوٹھڑی میں بچھا دی ہے۔ براہِ زوالے کمرے میں مولوی صاحب اور میرے
 فون بیٹے رہتے ہیں۔ وہ دونوں کام سے کھلنا گئے ہوئے ہیں۔“
 دیپالی کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

”تم کو بھوک لگی ہوگی۔ راستے میں کچھ کھا یا تھا۔؟ یہ لو۔“ بوڑھی عورت نے بیٹے
 دل کے بیٹھے لڈو ایک رکابی میں رکھ کر اُسے پیش کئے اور پانی کا گلاس اس کے سامنے رکھا۔ یہ غربت اور
 ہان لٹاری۔ دیپالی کے حلق میں کوئی چیز آگئی۔ اس کی جھپکپھٹ دیکھ کر بوڑھی عورت نے کہا۔
 ”جان میاں باہر عدی پر بیٹھے ہیں ادھر۔“

دیپالی نے غربت کا دور سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ سفید پوش طبقے کی ناداری سے واقف تھی جو اس
 اپنی ناداری تھی۔ اس نے شہر کے غریبوں کا فاس دیکھا تھا مگر ایسی غربت اسے آج تک نظر نہیں آئی تھی۔
 نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مولوی صاحب زینب بی بی کے شوہر برآمدے میں چٹائی بچھا کر مغرب کی نماز
 محو ہو چکے تھے۔ اس نے زینب بی بی سے چند باتیں کیں۔ ایک لڈو دانتوں سے کتر اور لالٹین ہاتھ میں لے
 کھیلے برآمدے میں نکلی جس کے عین نیچے ندی مرواں تھی۔

ندی کے کنارے جھونپڑے کی طرف پشت کئے وہ بیٹھا تھا۔
 وہ آہستہ سے نیچے اتری اور اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ کہتی پر سر رکھے اپنی سوچ میں ڈوبا ہوا
 ۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ ”شوکتی آگئیں۔“

”ہاں۔“

وہ آسے شگباشی دینے کے انداز میں مسکرایا۔ ”گوگرل۔ بریوٹل گرل۔“
 اُس کے چہرے سے داڑھی غائب تھی۔

”آپ نے۔“ دیپالی نے اپنے چہرے پر اٹکھٹھا اور انگلی پھیری۔

”ہاں بھائی۔ دوڑھائی برس سے کسی طرح اس کجنت داڑھی سے پیچھا ہی نہیں چھٹتا تھا۔ مسلمان
 صی۔ ہندو داڑھی۔ جیدھاڑ جھنکار ہوگئی تھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آزادی سے سارے

میں گھومتا ہوں آج صبح تہلے آنے کی تقریب میں مولوی صاحب کے بڑے لڑکے سے استریلے
 شیو کیا۔ دیکھو ٹھیک ہے نا۔ " اُس نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ایک بائیں رخسار
 پر استریلے کا خفیف سا زخم تھا اور خون کی بوند جم گئی تھی۔ خون کے اس قطرے کو دیکھ کر وہ اچانک
 بے حد مضطرب ہو گئی۔

ندی کارنگ سُرخ ہو گیا۔ ددر سے شیروں کے گرجنے کی آواز آرہی تھی۔ ریمان نے سر اٹھا
 کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔

"ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں سوچ رہا تھا: پھر اس نے ٹھٹھک کر پوچھا: تم نے علاو ل
 پڑھا ہے؟"

"تھوڑا سا۔"

"کوئی نظم یاد ہے؟"

"رات سُرخ اور تاریک تھی۔"

"ہاں۔ ادھر دیکھو۔" ریمان نے دھڑا فٹ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں سمندر اور دریا اور
 جنگل ایک ہو گئے تھے۔

"سُرخ اور تاریک رات میں ایک بہری ناؤ۔" اس نے پانی میں انگلیاں ڈبو کر آہستہ آہستہ
 اپنی خوبصورت آواز میں کہنا شروع کیا۔ "بہتی۔ ڈولتی، طوفان زدہ، ستیرا خالف، ارکان کے ساحل کی
 طرف بڑھ رہی تھی۔"

"لیکن طوفان آیا۔" دیپالی نے مسکرا کر کہا۔

"لیکن طوفان آیا۔" ریمان کہتا ہوا۔ "اور ناؤ ساحل کے بجائے ایک دور دراز جزیرے سے
 جا لگی اور ناؤ میں سے وہ نوجوان نکلا۔ بھوکا زخمی۔ نڈھال۔ وہ ریت پر پڑا تھا۔ جب وہ لڑکی وہاں
 پڑائی اور اس نے کہا۔"

"اُس نے کہا۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔ انسان کو بے آسرا اور مایوس نہ ہونا چاہیے۔" دیپالی
 نے کہا۔

"تم انسان ہونا۔ تاریک تنہا غضبناک سمندر کی روح تو نہیں؟"

ملہ سید علاو ل۔ سترہویں صدی بنگال کا عظیم شاعر جس کی کشتی پر لکائی قزاقوں اور طوفانوں کا مہلکہ بل کرتی اڑھائی سچھی

وہ ٹھٹھک گئی اور ریمان کو دیکھ کر علاؤل کے الفاظ میں سوال دہرایا۔

ریمان نے اقرار میں سر ہلایا۔

”کیونکہ۔۔۔“ دیپالی کہتی رہی۔ ”سمندر اپنے غمغیم میں مبتلا سارے کرہ ارض کے ساحلوں سے ٹکراتا ہے۔ مگر زمین تک نہیں پہنچ پاتا۔ زمین مضبوط ہے۔ اس نے انسانیت کے مظالم کا بوجھ اپنے اوپر اٹھا رکھا ہے۔ سمندر تو ایک چھوٹی سی نوکا کو بھی سمہارا نہیں دے سکتا۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑے بڑے میورینگی جہاز چاہئیں۔ ایسے جہزے، جن کو چودہ چودہ ماٹھی کھیتے ہیں۔“

”اور اس لڑکی نے علاؤل سے کہا تھا۔۔۔ دھرتی پر گھر بنے ہیں۔ آسمان خول بصدت ہے۔ چاند خوب صورت ہے۔ مگر چاند میں گھر نہیں ہے۔ گھر ناریل کے سائے میں بنتے ہیں۔ میں تمہارا گھر بنوں گی۔“
ہوا ساکت رہی۔ کائنات غم گئی۔ ندی نے بہنا بند کر دیا۔ ایک ازلی، ابلی لفظ کے لئے سارا وجود غلام میں تحلیل ہو گیا۔

پھر ہوا چلی۔ سمندری کے درخت سرسرائے۔ ندی پسینے لگی۔ دیپالی اپنی گودی میں ہاتھ رکھے اسی طرح ساحل پر بیٹھی رہی۔

”پھر کیا ہو سکتی، علاؤل نے اسے کیا جواب دیا؟“ ریمان کی آواز سناتے میں لہروں کے ساتھ گونجی۔
”مجھے پتہ نہیں آگے مجھے یاد نہیں آ رہا۔“ دیپالی نے جواب دیا۔ پھر اس نے سادگی سے پوچھا ”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔“

”ایک اہم کانفرنس کے لئے۔“ ریمان نے سنجیدگی سے کہا۔

”باتی لوگ ابھی نہیں پہنچے۔ سرنیدر دا وغیرہ ادھلا لٹا آیا۔“

”نہیں، بس اب آتے ہی ہوں گے۔“

”میں آپ کی ساری چیزیں جو منگوائی تھیں یعنی آئی ہوں۔“

”گڈ۔“

”دیپالی نے بیگ میں سے دو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔“ یہ آپ کے پاس کہا

سے آگئے تھے۔“

اس نے چونک کر نوٹوں پر نظر ڈالی: ”ہیں، اپنی کتاب کی رائٹنگی ملی تھی۔ مگر تم کیسے آئی

یہاں تک۔

”ہم بھی رئیس ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ریکارڈوں کی رائٹی ملنی تھی۔“

”افوہ۔ تو اس وقت گویا دوسرا ماہ دار سندھ بن میں آؤ بیٹنگ کر رہے ہیں۔ اس نے شٹنگلی سے ایک کنکر پانی میں پھینکا۔

دیپالی پھر بڑی متفکر نظر آئی۔ ”ریجان دا۔“

”کہو“ وہ کنکر اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینکنا۔

”باقی لوگ کہاں ٹھہریں گے؟“

”ارے بھئی۔“ اس نے چونک کر جواب دیا۔ ”کیا باقی لوگ باقی لوگ کر کے پور کر رکھے ہیں۔“

”کیوں؟“

وہ قبضہ لگا کر منہ ا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دیپالی نے بھونچکی ہو کر اسے دیکھا۔ ”تو آپ نے ادول سے جوٹ بولا تھا۔“

”بالکل۔“

”اور آپ کا خیال تھا۔ میں چلی آؤں گی۔“

”میرا خیال صحیح تھا۔!“

”دیپالی عینتے سے دوسری طرف مڑ گئی۔“

”شوکتی۔!“

اس نے جواب نہیں دیا! اور ندی کے کنارے کنارے چلنے لگی۔

”شوکتی۔!“

وہ اور آگے بڑھ گئی۔

”ایسے ہی چلتی چلی جاؤ تو سیدھی ڈھاکے پہنچ جاؤ گی۔ مگر ذرا خیال رکھنا۔ وہ تمہارے سامنے ایک عدد

آدم خور گھڑیاں بٹھائے۔“ ریمان نے بناشت سے آواز دی۔ سامنے ندی کی سطح پر ایک سیاہ لکیر

تظار رہی تھی، ایک گھڑیاں تیزی سے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیپالی چیخ مار کر واپس پٹی۔

ریمان کھلکھلا کر ہنستا ہوا میٹھی پر بٹھ گیا۔ دیپالی اس سے کچھ فاصلے پر دوسری میٹھی پر آئی۔

ندی کا پانی سیاہ ہو چکا تھا اور دوسرے کنارے پر بنداری کے جھنڈے سرسرا رہے تھے۔ ریحان نے سر اٹھا کر دیپالی کو دیکھا۔ پھر وہ بیکلخت سید سنجیدہ ہو گیا اور اس نے آہستہ سے کہا، "شاید مجھے کوئی حق حاصل نہیں تھا کہ میں تم کو اس طرح۔ اس طرح زحمت دوں۔"

وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ریحان نے گھبیرا آواز میں کہا۔

"دیپالی۔ میں تین برس سے مسلسل متواتر تین برس سے جرائم پیشہ لوگوں اور ڈاکوؤں کی طرح پھینتا پھرتا ہوں۔ بدلتوں سے مجھے چین کی نیند اور ذرا سی ذاتی مسرت نصیب نہیں ہوئی۔ تمہیں معلوم ہے چارلس بارلو نے قسم کھائی ہے کہ زندہ یا مردہ مجھے گرفتار کر کے رہے گا۔؟ تم۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ میں انسان ہوں آخر۔ فولاد کی مشین گن تو ہوں نہیں۔ یا ہوں۔ بتاؤ۔؟" اس نے دوبارہ شگفتگی ناکوشش کی۔ پھر اس نے کہا "نہیں۔ دیپالی میں تم سے ملنا چاہتا تھا۔ شاید مجھے اس طرح غلط ہٹا کر تم کو اتنی دور نہ بلانا چاہئے تھا۔ مگر میں بے حد خود غرض انسان ہوں اور بہر حال اب تو تم آ ہی ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے!" اس نے پھر ہنسنے کی سعی کی۔

دیپالی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ مختصر سے گھاٹ کی شکستہ سیر بھی پر بیٹھا وہ ایک جھوٹے سے نزلے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ اسکول کا چھوٹا ملازما جو استانی کے سامنے اپنی شرارت کی معافی اہم ہو مگر ساتھ ہی کسی دوسری شرارت پر بھی تلا تھا۔ دیپالی کو بیکلخت ہنسی آ گئی۔

اسکول گول گنگلوز۔ اس کے کان میں گونجا اور اس گونج کو شکست دیتے ہوئے ایک ایفٹھ کر پھر پور مسرت کے ساتھ دوردی میں پھینک دی۔

"کھامائے گا آکر گھڑیاں۔" ریحان نے کہا

وہ زور سے ہنسی۔ او اودیوی۔ میری اس ہنسی کو اسکول گول گنگلزی کہتی ہیں۔ اس نے کہا اور سر سے لمحے اس نے سوچا میں یہ نام کے قسمت کو tempt کر رہی ہوں اور میں وہی بھی ہنسی جا رہی ہوں۔

ریرے اس ذہنی زوال کا ذمے دار یہ شخص ہے۔ ہا ہا ہا۔ اس نے زور سے پانی اٹھا لیا

"اواویوی۔ ریحان نے سیکٹ جلاتے سونے بے پرواہی سے کہا۔ "بڑی اچھی آدمی ہیں۔ ان کی گفتگوت

ابو کی تو تمہارے اندر بھی عقل آ جائے گی۔

"ابھی نے عقل ہوں،"

”بے حد۔ ایک اجنبی آدمی کے بلانے پر تنہا اس کے پاس بنوں میں آگئیں۔“

”مجھے اس اجنبی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”قطعی نہیں!“

”اور ایسے ناقابل اعتبار آدمی کے ہاتھوں میں صوبے کی تحریک کی باگ ڈور ہے۔ جب ہی تو یہ گت

بن رہی ہے تحریک کی۔ ہا ہا ہا۔“

ہا ہا ہا۔ وہ بھی خوب ہنسا۔

اب چاند دلدی جنگلوں کے سیاہ افق پر آہستہ آہستہ اوپر آ رہا تھا۔

”چلو تم کو اپنے میزبانوں سے ملو اداں!“

وہ اس بوڑھے جوڑے کے مسکین اور باصبر چہرے کو یاد کر کے فوراً رکھی ہو گئی۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“

”مولوی ابوالہاشم۔ ماہی گیر ہیں اور اس گاؤں کی مسجد کے پیش امام۔ ان کے لڑکے بھی میرے

میں اور جاسے درگزر بھی ہیں۔ میں ان کے ہاں دو مہینے سے مقیم ہوں۔ کھانا میں کافی کام ہو رہا ہے۔ گو

رفتار سست ہے۔“

آپ نے ان دونوں میاں بیوی کو میرے متعلق کیا بتایا ہے؟“

”تمہارے متعلق۔؟ کچھ نہیں۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ اس ہندو لڑکی کو مسلمان کر کے شادی کرنے

والا ہوں۔“ ریحان نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”مشرم تو نہیں آتی آپ کو۔“ دیپالی نے غصے سے سرخ ہو کر کہا۔

”بالکل نہیں۔ چلو۔ اٹھو۔“ ریحان نے بڑے نکتہ اور شائستگی سے اس کے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر کہا اور لائٹن اٹھالی۔ وہ بانس کی سیڑھیاں چڑھ کر چھوٹی سیڑھی میں داخل ہوئے

زمین بنی نے مچھلی بھات ان کے سامنے رکھا۔ دیوار پر پھیلے چھیلی پکڑنے کے جال کے نیچے

وہ دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کا سایہ دیوار پر بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ اتنے میں مولوی

درمھی والا جھکا جھکا سایہ بھی پر چھایوں میں آ شامل ہوا۔

”بابا۔ بخار۔“ ریحان نے دونوں بوڑھے پر چھایوں سے کہا۔ ”یہ ہماری کولتھم ہے۔“

کو ٹنٹم دیپالی۔

مولوی نے سر اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ اور سر ہلایا۔

ریحان ہتارہا۔ یہ ہمارے لئے کو ٹنٹم بھی ہے اور دیپالی بھی۔ کسی طنز میں تم کو سمجھاؤں گا کہ اس دیپالی میں کو ٹنٹم اور دیپالی ایک کیسے ہو سکتی ہیں۔

بس شروع ہو گئی تبلیغ۔ ایک منٹ کو بھی پارٹی لائن چلانا نہیں بھولتے۔ دیپالی نے ذرا الجھن سے سوچا اور کلیخت لے ایسا لگا کر سامنے پر چھایوں میں بنوئے چند سرکار کا سایہ بھی اکر کھڑا ہو گیا ہے۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ وہ سر جھکا کر تندھی سے کھانا کھانے میں مہمک ہو گئی۔

کھانے کے بعد ریحان نے کہا۔ رات بہت آگئی ہے۔ تم اتنا طویل سفر کر کے آئی ہو دیپالی۔ ب آرام کرنا چاہو گی؟

”جی ہاں۔“

”گڈ نائٹ“ ریحان نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”گڈ نائٹ۔“

ریحان اور مولوی ابوالہاشم کمرے سے باہر چلے گئے۔

اُس رات، سندھ بن کے عتیق منڈلے میں، زینب بی بی کے برابر والی کھاٹ پر لیٹ کر دیپالی نے موجِ ندگی کی کوئی تاگ بھی ہے۔ بہت جلد سے نیند آگئی۔

دوسرے روز صبح سویرے وہ جھونپڑے سے نکلتی ہوئی ایک قریبی کنج میں چلی گئی۔ جہاں دور سے ایسی گلدار ہرنوں کی ایک ڈار چو کرٹیاں بھرتی گز رہی تھی۔ وہ ایک درخت کی شاخ پر ہاتھ لکھ کر ان خوبصورت نون کا نظارہ کرنے میں محو تھی۔ جب کسی نے پیچھے سے کھنکارا۔

”ہوئی غریب شکنتلا، اس وقت اس پوز کو دیکھ کر فوراً بے ہوش ہو جاتی اور کا لید اس کو میں دوبارہ لکھنا پڑتا۔“

دیپالی نے پلٹ کر دیکھا۔

”ریحان۔ آپ اس قدر نون سیرس ہو گئے ہیں کہ مجھے آپ کی طرف سے فکر ہو چکی ہے۔ آئیے۔“

میں آپ کو آپ کے رسالے دے دوں۔“

”اجی پڑھ لیں گے رسالے“ وہ آرام سے ایک درخت کے کٹے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

”مجھے آپ سے جنگ کی تازہ ترین صورت حال ڈیکس کرنا ہے۔“

”وہ بھی کر لی جائے گی۔“

”اچھا تو چل کر ناشتہ تو کر لیجئے۔“

”ناشتہ۔ ادہ۔ آج کا مینو کیا ہے ہمارے بریکفاسٹ کا؟“ ریحان نے شان سے پوچھا۔

”مرغ مسلم اور پلاؤ۔ یا جو کچھ بھی آپ مسلمان لوگ کھاتے ہیں صبح کو۔“

”اری بیوقوف۔ مسلمان ناشتے میں مرغ مسلم نہیں کھاتے۔“

”واہ۔ جہاں آرا کے ہاں میں نے ایک مرتبہ مرغ مسلم اور پراٹھے کھائے تو اس نے کہا

کہ صبح پکے تھے۔“

”جہاں آرا کون۔؟“ وہ دونوں ٹپکتے ہوئے اب جھونپڑے کی طرف لوٹ رہے تھے۔

”میری دوست ہے۔ نواب قمرالزماں چودھری کی لڑکی۔ سخت فیوڈل۔ لیکن بجد سویٹ۔“

”ادہ۔“

وہ جھونپڑے میں داخل ہو گئے۔ زینب بی بی نے رات کا بکایا ہوا ہینٹھا بھات سامنے رکھا۔

”میں آج ٹاٹ جا کر آپ کے لئے کھانے پینے کی سامان خرید لادوں گی۔“ دیپالی نے ریحان سے

انگریزی میں کہا۔

”دیپالی تم چند روز یہاں رہ کر میرے لئے بہتر کھانا پکا دو گی۔ مگر ان دونوں کو تو ساری زندگی

اس کے علاوہ کچھ میسر نہیں ہوا۔“

”ادہ۔“ دیپالی نادم ہو کر المونیم کی روکائی پر جھک گئی۔ زینب بی بی چولہے پر چائے اوتھنے میں

مصرود تھیں۔ چار پینے کے بعد وہ دونوں دوسرے کمرے میں گئے جس میں ریحان کی چار پائی کچی تھی۔

فرش پر کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک کونے میں اس کے ٹرنک کے اوپر بیڑی کاربڈیو رکھا تھا۔ ریحان نے

صبح کی خبروں کے لئے ریڈیو اون کیا۔ اے۔ آئی۔ آر۔ دہلی سے میلون ڈمی سیلو کی آواز گونجی۔

خبریں سننے کے بعد ریحان نے کہا۔ چلو باہر چلیں۔ وہ دونوں باہر نکلے۔ جھونپڑے کے نیچے گھاٹ

مولوی کی ناؤ بندھی ہوتی تھی۔ مولوی صاحب دن بھر کے لئے کسی کام سے گاؤں جا چکے تھے اور پانی سطح پر بکری عقاب پھیلیوں پر جھپٹا مار رہے تھے۔

”میں وہ چکرے ہرن دیکھنا چاہتی ہوں، جو صبح آسمانی تیزی سے بھاگ گئے۔ آگے جا کر جنگل زیادہ خوب رت ہو جاتا ہے۔“

”زیادہ خوب صورت اور زیادہ خطرناک۔“

”مگر میں وہ ہرن ضرور دیکھوں گی۔ اتنے حسین ہرن میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھے۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر سیتا کے انجام سے واقف ہو؟“

وہ سنستی، ہوتی اتر کر کشتی میں بیٹھ گئی۔ ریمان نے کشتی کھول کر دھارے پر چھوڑ دی۔ وہ اس اور اس منظر اور اس ماحول کا ایک لازمی اور فطری جزو معلوم ہو رہا تھا۔ دیہاتی کو نیک بیک خیال آنا کہ زندگی کے پس منظر سے بالکل واقف نہیں۔

ناؤ پانی کی سطح پر روانی سے بہ رہی تھی۔ ریمان نے آہستہ آہستہ نیک ساری گان گنگنانا شروع کیا۔ پھر چپ ہو گیا۔

کنا رہے چھکے سُدری درختوں پر رنگ برنگے پرندے چکر کاٹ رہے تھے۔

”تم کو احساس ہے شو کوئی کہ ان دریاؤں اور لہ دھرتی نے کیسے کیسے دکھ دیکھے ہیں؟ میں ان دکھوں کا تقم ہوں۔“

”کپ۔ آپ بھی لائون کے رہنے والے ہیں؟“

”ہاں، تم نے مولوی ابوالہاشم کو دیکھا۔ میرے بابا مولوی ابوالہاشم کا نمونہ ہیں ایسے ہی صابر۔“

اور بولے۔

”اوہ۔“ وہ چپ ہو گئی۔ وہ یکرید نہ کرنا چاہتی تھی کہ ایک عزیز کسان کا لڑکا لندن اسکول آف

سینچ گیا۔ یقیناً وہ اس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ لندن کیسے نئے تھے۔“

”لندن۔؟“ ریمان نے چونک کر رہا۔ ”لندن کا یہاں کیا ذکر ہے؟ یہاں ملک دیکھو اور دیکھو

لے اس کے ساتھ کیا کیا؟“ وہ خاموش رہا۔ ”میں ۱۹۳۵ء میں لندن گیا تھا۔ تم میرے حالات زندگی

جاننا چاہتی ہو؟ میں نے علی گڑھ سے ہائی اسکول اور ایف اے کیا تھا۔

”علی گڑھ۔“

”ہاں یہ تمہارے لئے تقریباً اجنبی نام ہے۔ گریہ ملک اور قوم کی ایک اور بیدار ہم داستان کا ایک حصہ ہے اور اس داستان سے تم کو واقف ہونا چاہئے۔ پھر میں نے ڈھاکے لوٹ کر بی اے اور کلکتہ سے ایم۔ اے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے تمہارے چچائی کتاب ”بنگال کی اقتصادی تاریخ“ پڑھی تھی۔ وہ رک کر کسی سوچ میں کھو گیا۔ اور پھر چپو چلانے شروع کئے اور کہنے لگا ”اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ان کی جیتھی۔ کوئی سڑتی سی لوندیا کسی اسکول میں پڑھ رہی ہے اور ایک دن میری زندگی میں سائیکہ کی طرح داخل ہوگی۔ دیکھو کھٹن کی مناسبت سے کسی بر محل تشبیہ دی ہے۔ وہ ادا سے ہنسا۔“

”میرت خوب آگے چلے!!“

”اس کے بعد ایک۔ ایک وظیفے پر لندن چلا گیا۔ وہاں میں اور ادا اور کتے اور بے سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ہمارا بڑا ہی تاریخی قسم کا گروہ تھا وہ!“

”اور واپس آتے ہی کووڈ ٹم سے انقلاب کے شعلوں میں، ویسپالی نے کہا۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ پھر اس نے کہا: ”کلکتہ میں چند سال ہوئے پروگریسیو رٹرنز کی دوسرا کالفرنس ہوئی تھی۔ اس میں تمہیں آنا چاہئے تھا۔ بڑا اولہ خیر تجربہ تھا۔“

”آپ بھی لکھتے ہیں؟“

ریحان نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دکھایا: ”ارے تم کتنی جاہل ہو۔ یہ رائیٹی مجھے ابھی کس شے کی ہے اور وہ جو میں نور الرحمن بنا رہا ایڈٹ کر رہا تھا تو کیا لکھا اس کو دوڑا تھا؟ ویسپالی کیا تم نے وائسیری کتاب نہیں پڑھی؟ ادا نے تم کو نہیں دی پڑھنے کو؟“

”کیا افسانے لکھتے ہیں؟“

ریحان نے چپو چپو کر آسمان کی طرف احتجاجاً ہاتھ پھیلانے: ”اوہ لڑکیاں۔ لڑکیاں۔ اس نے فریاد کی۔“

”نہیں سچ بتائیے۔“

”میں افسانے نہیں لکھتا ہوں نہ شاعری کرتا ہوں۔ شعوس کا کام کرتا ہوں۔“

”تھوڑا سا انکسار آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کو کتاب کا کیا نام ہے؟“

”انیسویں صدی میں بنگال کی زرعی حالت۔“ ریحان نے منہ لٹکا کر کہا۔ ”ارے دیپالی تم بڑی جاہل نکلیں۔“

”اور یہ پروگرام کیسے لکھا گیا ہوتا ہے؟“

ریحان نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے اور کہا۔

”نہیں بلینز۔ بتائیے نا۔“

”ابھی جب کالج واپس جاؤ گی تو گرد دیو نے جو پیغام کانفرنس کے نام بھیجا وہ پڑھ لینا، سمجھ میں آجائے گا۔“

”گرد دیو نے کیا کہا تھا۔؟“

”انہوں نے کہا تھا کہ میری طرح گوشہ نشین بن کر کام نہیں چل سکتا۔ اومادی کو چاہئے تھا کہ تمہیں سب باتیں بتاتیں۔“

اومادی۔ اومادی۔

”آپ نے بہت سے لوگوں کو آئیڈیالائز کر رکھا ہے۔“

”ہاں۔“

”کون کون۔“

”بہت سارے ہیں۔ ان میں سے ایک تم بھی ہو۔ دیپالی تم کلچرل فرنٹ پر کام کر چکی؟“

”آپ جو کہیں گے کروں گی۔“

کشتی اب درختوں کی سڑنگ میں سے گزر رہی تھی۔

”مغرب میں بھی یہی سب ہو رہا ہے؟ جدید؟“ دیپالی نے پوچھا۔

”مغرب میں۔؟ اسپین میں ایک خونریز جنگ لڑی جا چکی ہے دیپالی۔“

”مجھے اور بتائیے۔ لندن کے متعلق۔ جب آپ وہاں طالب علم تھے۔“

”جب ہم وہاں طالب علم تھے۔“ ریحان چپوٹے ایک طرف دکھ کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ واقعی تڑپا لگتا

”تھا۔“ اس زمانے میں وہاں بڑے معقول لوگ جمع تھے۔ چاک۔ راج آئنڈ اور سجاد ظہیر نے مل کر بی ڈبلیو اے

قائم کی تھی۔

”آپ انگلینڈ ہی میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے؟“ دیپالی نے بات کاٹی۔

”ہاں۔ اور وہاں آکر دیکھا کہ ہمارے ساتھی۔ علی گڑھ اور لکھنؤ۔ اور جامعہ ملیہ اور کلکتہ اور سب

جگہوں کے نوجوان ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ پرانے دہشت پسند بھی اب ہماری طرف آچکے

تھے۔ شوکتی۔ ہم لوگ خوش قسمت ہیں جو اس زمانے میں پیدا ہوئے اور ملک کیلئے کچھ کر سکنے کے اہل ہیں۔“

سرنگ کے اختتام پر بیچ کر ریمان نے کشتی موڑ لی۔ ”آگے گھڑیا لوں گی راجدھانی ہے۔ اب واپس

چلتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

واپسی میں ریمان خاموشی سے پتو اچھلانے میں مصروف رہا۔ بادل گھرائے تھے اور سورج کبھی کبھی

بادلوں میں سے نمودار ہو کر چمکنے لگتا تھا۔ لفتق اور رام چڑیاں سارے میں اڑتی پھر رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر انہوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ تیسرے پیر

کو ریمان نے دیپالی کے دروازے پر آن کر آواز دی۔ ”شوکتی۔ یہاں آنا تو۔“ دیپالی کھاٹ پر ساری بچھا

کر اور اپنے تھیلے کا تکیہ بننے بے خبر مورہی تھی۔ زینب بی بی گھڑائے کر شام کے پکانے، رینڈھنے کے لئے پانی

لینے ندی پر گئی ہوئی تھیں۔ ریمان ذرا جھجکتا ہوا اندر آ گیا اور کواڑ سے لگ کر خوابیدہ دیپالی کو دیکھنے لگا۔

”شوکتی!“ اس سے چند منٹ بعد پھر آہستہ سے آواز دی۔ وہ ہڑا کر اٹھ سیٹھی۔

”وہ رسالے کہاں ہیں؟“ ریمان نے پوچھا بے مقصد سوال کیا۔

”ابھی لاتی ہوں۔“

ریمان ذرا احمقوں کی طرح کھڑا سر کھجاتا رہا۔ پھلپنے کمرے میں چلا گیا۔ دیپالی اخبار اور رسالے

اُس کے پاس لے گئی۔

”آؤ باہر روشنی میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔“ ریمان نے کہا۔ وہ یہ رسالے حاصل کر کے واقعی بے

خوش نظر آ رہا تھا۔ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا ہو۔

برآمدے میں چٹائی بچھا کر وہ سورج ڈوبنے تک رسالوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ ریمان دیپالی

و مختلف مضامین کے نکات سمجھاتا گیا۔

سامنے گھاٹ پر ناؤ آ کر رکی۔ مولوی صاحب اترے۔

زینب بی بی نے اندر سے آواز دی۔ ”کھانا تیار ہے۔“

کھانے کے بعد دیپالی پھر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی۔ اور افق پر قیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔
ان نزدیک کے کھمبے سے بگ کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آ رہا تھا۔

زندگی کا۔ ایک اور دن ختم ہو گیا۔ ایک انمول دن گزر گیا۔ ایک شعر چڑھا جا چکا۔
ان نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیپالی کو آواز دی۔

”گڈ نائٹ۔ دیپالی۔“ اور وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔

دوسرے دن وہ پگڈنڈیوں پر سے گزر کر گاؤں میں گئے۔ کسانوں اور چھیروں سے باتیں کرتے
۔ اور رات گئے واپس آئے۔ راستے میں دیپالی کی ساری ایک جھاڑی میں الجھ گئی۔ ریحان اس کی
بنے کے لئے زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ کانٹے نکالتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر دفعتاً پوچھا۔ ”ساری
آیا۔ تمہاری چوری کا پتہ چل گیا۔؟“

”جی ہاں۔“ وہ ایک تھپر پر بیٹھ گئی۔ اور چاند کی روشنی میں ساری کے چاک میں گرہ لگانے
نش کرنے لگی۔

”مجھے ان ساریوں کے کہنے کا بڑا سبب ہوا تھا۔“ ریحان نے کہا۔ ”میں نے سر چاہتا، جو لڑکی اتنی
بانی دے سکتی ہے۔“

”میں نے کیا قربانی دی ہے۔“ دیپالی نے ہنسنے لگا کر بات کاٹی۔

”کیوں۔ کیا میں جانتا نہیں کہ لڑکیوں کو اپنی ساریوں اور گہنوں سے کتنی وابستگی ہوتی ہے۔“ وہ
خاموش رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اتنی کے پاس بھی دو باجوہ ساریاں تھیں۔ جب وہ بیاہ

تھیں تو میری دادی ماماں نے ان کو دی تھیں۔ وہ ساریاں میں تم کو دوں گا دیپالی۔“

دیپالی سکتے میں رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ گھبرا کر تھپر پر سے اٹھی۔

”کیوں۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟“ ریحان نے پریشانی سے دریافت کیا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔ گھر چلیے۔“

وہ اونچے نیچے ٹیلوں، اور جھاڑیوں کو بھلا ننگے جھونپڑے کی طرف رواں ہو گئے۔ دیپالی نے

ایک دم چپ سا دھلی تھی۔

تیسرے روز وہ دونوں ٹہلتے ہوئے ندی کے ساحل پر کافی دور نکل گئے۔ جب، اچانک دور ایک لائچ نظر آئی۔ دیپالی ہم کر ایک درخت کی اوٹ میں چھپ گئی۔ یہ سرکاری لائچ تھی۔ غالباً معمول کے دو پراس طرف سے گزر رہی تھی یا شاید کچھ سرکاری افسر شکار کے ارادے سے ادھر آئے تھے۔ لائچ شور مچاتی پانی پر گزر کر درختوں کی سرنگ میں غائب ہو گئی۔ دیپالی کا رنگ فق ہو چکا تھا۔

سارے شوکتی۔ ایک ذرا سی سوئین لائچ سے ڈر گئیں۔

دور سے گویاں چلنے کی آواز آئی۔

”ادماں۔“ دیپالی نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔ ”گھبراتی کیوں ہو بھائی! افسر لوگ شکار کھیلنے آیا ہے۔ ہم لوگ یہاں بالکل ہیں۔ یہ دنیا اور جنگل ڈیڑھ سو سال سے اپنے بچوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔“ ریحان چند لمحوں تک جنگل کے اور گنجان سناٹے کی آواز سن رہا اور پھر کہنے لگا۔ ”کل ہم جن کسانوں سے ملے تھے۔ ان کے پٹر کھے تو سارا فرانسیسی تحریک میں لڑے تھے۔“

”ریحان۔ آپ کو اپنے راستے کے بارے میں مطلق کوئی شبہ کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے؟“ دیپالی

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

”نہیں جب اپنے اصل دشمن اور اس کے ایجنٹوں کو ہم پہچان چکے ہیں تو پھر الجھن کیا ہو سکتی وہ آگے جھک کر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا۔ ”سنو دیپالی۔ یہ یاد رکھو کہ برطانوی سرمایہ داری ہندوستان قحط، غلامی، قرضے، ذات بندی اور فرقہ وارانہ کشمکش کی بنا روں پر کھڑی کی گئی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کھلنا اور نوکھالی، جواب ڈاکوؤں اور مفلس ماہی گیروں کا دس ہے۔ مغلوں اور لوہاؤں کے عہد میں کتنے تجارتی علاقے تھے؛ یورپ میں جو ۲۰۰ برس تک سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں لڑی گئیں وہ ہندو کی تجارت پر قبضہ کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔“

وہ اب درختوں کے نیچے سے نکل کر ساحل پر آگئے۔ چاروں طرف پھولوں کی ردشہی نے بڑی سہانی

مجیب سی خوشبو پھیلا رکھی تھی۔

”تم جانتی ہونا کہ سترھویں صدی میں ہندوستان کے فولاد کا پروڈکشن سارے یورپ کے فولاد

پروڈکشن سے برتر تھا۔“

دفعاً دیپالی کھلکھلا کر نہیں پڑی۔

”کیا ہوا۔؟“

”کچھ نہیں، کوئی اس وقت یہاں آن کر دیکھے کہ اس شدید ردِ مافیٰ ما حول میں ریحان الدین احمد تڑپوں صدی کے فولادی پروڈکشن کے متعلق سمجھا رہا ہے۔ اگر میں یہ بات واپس جا کر لوگوں کو کسی کو یقین آئے گا۔؟“

”ہماری جدوجہد کا تدارک کرنے کے لئے۔“ ریحان کہتا ہوا۔ ”پھلی صدی میں برطانیہ نے یہ ثابت ہا کہ امپریزم کے سامنے اس نے ہندوستان کو کتنا ترقی یافتہ بنایا ہے۔ انگریزی تعلیم اور ہسپتال اور لڑیاں۔ اور مشن کالج۔“

”یورنڈ بنر جی۔“ دیپالی نے زیر لب کہا۔

”کیا۔؟“

”کچھ نہیں۔“

”وہ خود کھیل ہندوستانی موسیقی جو مہا بھارت کے زمانے سے لے کر مغل عہد تک قائم رہی تھی۔ انگریزی سرمایہ داری نے تباہ کر دیا۔ کیا سوچ رہی ہو۔؟“ ریحان نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

”کچھ نہیں اور بتائیے۔“

”ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا۔“ ریحان نے سر کھجا کر بات دو بارہ شروع کی۔ ”مگر یورپ میں سرمایہ داری نے نئی سماجی طاقتیں بھی پیدا ہو گئی تھیں۔ جو ہمارے ہاں پیدا نہیں ہوئیں۔“

”لیکن کل تو آپ کہہ رہے تھے ہندوستانی گاؤں کی اکونومی کی برطانیہ کے ہاتھوں تباہی کو کارل مارکس۔ سماجی انقلاب بتا رہے۔ کیونکہ ذات بندی کی بنا پر ہمارے گاؤں رجعت پسند تھے۔ اور ان میں کی گنجائش نہ تھی۔“

”گڈ کولیشن۔“ ریحان نے کہا اور جھونپڑے کی طرف لوٹتے ہوئے دیپالی کو ان دقیق مسائل کے کات کھلنے میں مصروف رہا۔

جو تھکان۔ ریحان نے دیپالی کو برطانوی سرمائے کے تین ادوار۔ کمپنی کے مرحلے سرمائے، انیسویں صدی ٹریڈ سرمائے اور جدید فنانس کے سرمائے اور نئے ہندوستانی سرمایہ داروں کے متعلق سمجھانے میں صرف کیا۔

پانچویں دن جب وہ کشتی رانی کے لئے نکلے تو اچانک بعید طول ہو کر اس نے دیپالی سے پوچھا۔
”شوکتی۔ تم کتنے دن یہاں رہ سکتی ہو۔“

”لوگ گیت جمع کرنے میں جتنے دن بھی لگ جائیں۔ اس نے ہنس کر جواب دیا۔

چھ دن وہ ناؤ کھیتے کھیتے بہت دور نکل گئے۔

پھولوں کے ایک کعبہ میں سے ناؤ گزرنے لگی تو اس نے اوپر جھکی ہوئی ڈایوں میں سے چند

ٹوکر اس کے بالوں پر برسا دیئے۔ ناؤ ایک گھاٹ کے قریب پہنچی۔

بنگال کے ہندو عوام کا عقیدہ ہے کہ جب رام اور سیتا نے بن باس لیا تو انہوں نے کافی

سندر بن میں بھی گزارا تھا۔ کاٹھیاواڑ، وسطی اور جنوبی ہند سے لے کر چائینگام تک ان علاقوں کے

کا اپنے اپنے جنگلوں کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ ان جنگلوں میں رام اور سیتا انھیں اب بھی چلتے نظر آ

سندر بن کے اسی تقدس کی وجہ سے نو اکھالی اور کھننا کے جنگلوں اور دریاؤں اور سندھ

جزیروں میں پرانے مندروں، مٹھوں اور سنیاسیوں کے جھونپڑوں کی بہتات ہے۔

ریحان نے ناؤ جس جگہ کن سے سے باندھی اس کے قریب بھی جنگل میں ایک پرانا مندر نظر

آیا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کا بازار تھا۔

”بھوک لگ رہی ہے۔ آؤ کچھ کھالیں۔“ ریحان نے کہا۔ کھارے پر اتر کر وہ جنگل

داخل ہوئے۔ دفعتاً مندراؤں کے سامنے آگیا۔

دیپالی نے غیر ارادی طور پر آنچل سے سر ڈھک لیا۔

”دسویں صدی میں یہ مندر بنے۔“ ریحان نے کافی آلود معبد پر نظر ڈال کر ماہرہ انداز میں کہا

”ادفونہ۔“ مندر کے دروازے کے سامنے ایک کھنڈی تھی۔ ریحان نے مسکرا کر کہا۔

”آؤ اندر۔“ ریحان نے کہا۔ یہ تو بہت ہی تاریخی عمارت معلوم ہوتی ہے۔ یہ اسلچر دیکھ

صریحاً سیتا پیرٹ۔“

ایک بوڑھا اندھا دھندلا بھاری اندر سے پرچھائیں کی طرح برآمد ہوا۔ ریحان چیلوں سمیٹ

پرچھ کر موڑیوں کی فرسز کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بھاری کو اپنی طرف تاکنے دیکھ کر اس نے دیپالی سے

”یہ کہا۔“ اگر کچھ اعتراض کرے تو کہہ دینا میں تمہارا تہی دلوی ہوں۔ روہن سہکار۔“

”شٹ اپ“

پجاری نے نذرانے کی امید میں مسکرا کر دیپالی کو اندر بلا یا۔ اور ریحان کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ دوسرے لمحے وہ دونوں درگا بھوانی کی مورتی کے سامنے کھڑے تھے۔ ریحان نے چہرے پر مصنوعی عقیدت طاری کر لی۔

پجاری نے دونوں کی پیشانیوں پر تنک لگا کر انھیں پرشاد دیا اور دیوی کے چرنوں میں پڑے گندے کے دوہار ان کے گلے میں ڈال دیئے اور جھکا جھکا ٹٹول ٹٹول کر لو بان سلگانے میں مصروف ہو گیا۔

”لو بھئی مبارک ہو۔ شادی ہو گئی۔“ ریحان نے چلا کر انگریزی میں کہا۔

دیپالی شرم سے لال بھوکا ہو رہی تھی۔

ریحان نے جیب سے نکال کر پجاری کو کچھ روپے دیئے اور دیپالی کا بازو تھام کر اسے باہر لے آیا۔

”ارے بھائی۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر انڈین فلم میں دیکھا ہے کہ میرا دور ہیراؤن مندر میں جا پہنچتے ہیں اور پجاری عین اسی طریقے سے ہار پہنا کر ان کا بیاہ کر دیتا ہے۔ بھئی کمال ہو گیا۔“

”ریحان۔ ویل یو پلزز شٹ آپ۔“ دیپالی نے کہا اور چند قدم چلنے کے بعد ایک شکستہ ستون پر بیٹھ کر بھوٹ بھوٹ کر رونے لگی۔

ریحان حیرت سے اُسے دیکھنے لگا اور جب اس ہندو لڑکی کی جذباتی کیفیت اور موقع کی نزاکت کا اسے اندازہ ہوا تو وہ گھبرا کر اس کے قریب دوڑا تو جھک گیا۔ اور بجا جت سے کہنے لگا۔ ”ارے بیوقوف۔ منہ نہیں ہوا سیاہ۔ کون گدھا کہتا ہے کہ سیاہ ہو گیا۔ عجیب بیوقوف لڑکی ہو۔ ارے تم ابھی تک مذہبی توہمات کی قائل ہو۔ مندر اور پجاری۔۔۔ اور۔۔۔ کمال ہے۔“ وہ سر کھجانے لگا۔ ارے جتنی لڑکی۔ شادی صرف کورٹ میں ہوتی ہے۔ تم اور میں مندر اور مولوی کے قائل ہی کہاں ہیں۔ اور۔ اور کوئی۔۔۔ تنگ بھی ہے بھلا۔ چلو اٹھو۔۔۔ عجیب بے قوف لڑکی ہو بھئی۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر پلگٹڈی پر لے آیا۔ گاؤں پہنچ کر وہ ایک چائے خانے میں گئے اور لکھری کی بیچ پر بیٹھ کر کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیپالی بالکل چپ رہی۔ ریحان اسے بار بار پریشانی سے دیکھتا تھا۔ پھر وہ چائے خانے میں جمع لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ یکلاوت اسے خیال آیا کہ وہ سید غیر محتاط ہو گیا ہے۔ یہ گاؤں کھلنا شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور لو لیس کے سیاہی بھی زیادہ دور

نہیں ہوں گے۔ چائے ختم کر کے وہ دونوں گھاٹ پر آئے اور کشتی میں بیٹھ کر گھر روانہ ہو گئے۔
 ”دیپالی“ کشتی نندی کے دھارے پر آئی تو ریجان نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے۔ میں نے
 مذاق کیا تھا۔ اگر تم کو برا لگا ہے تو مجھے معاف کر دو۔“
 وہ ایک دم پھر رونے لگی۔

”اومائی گاڈ۔“ ریجان نے بازو پھیلا کر آسمان کو دیکھا۔ ”حد ہے۔“
 وہ ہنس پڑی۔ اب وہ رو رہی تھی اور ہنس رہی تھی۔ ریجان خاموش رہا۔ اسے احساس ہو
 چکا تھا کہ اُس کی اور اس لڑکی کی زندگی اس لوہا کی مانند طوفانوں سے بے پرواہ، دریا کے پُرشور دھارے
 پر کسی نامعلوم ساحل کی طرف بہ رہی ہے۔ اب وہ ایک دوسرے کے رحم و کرم پر زندہ رہیں گے۔

اب چاند بہت دیر میں طلوع ہوتا تھا۔ سُندر بن پر گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس رات
 جب مھو نیڑے ہی سب لوگ سو گئے تو دیپالی چپکے سے اٹھی۔ طاق میں رکھے خالی دیوں میں سے ایک دیا
 کال کر اُس میں تیل ڈالا۔ اور تپتی لگائی۔ پھر دیا اور کافز کا ایک ٹکڑا لے کر باہر چلی گئی۔ اور نندی کے کنارے بیٹھ
 کر اس کاغذ کی چھوٹی سی ناؤ بنائی۔ دیا جلا کر اس ناؤ میں رکھا اور اُسے پانی میں بہا دیا۔ اور گھاٹ پر
 گھٹنوں کے بل بیٹھ کر بے حد صیوان اور سکر مندی سے اُسے دیکھنے لگی۔ دیا دریا کی دھار پر دو رنگ
 بہتا چلا گیا اور پھر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ اچانک دیپالی کو احساس ہوا کہ ریجان اپنے کمرے سے نکل کر آ رہے
 ہیں کھڑا اُسے نندی میں چراغ بہاتے دیکھ رہا ہے۔ وہ جلدی سے اٹھی اور سیڑھی چڑھ کر بھاگتی ہوئی اپنے
 کمرے میں چلی گئی۔

دوسری صبح وہ جو لمبے کے پاس بالکل نارمل اور بتاش نظر آنے کی کوشش میں مصروف تھی۔
 ریجان نے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”گڈ مارننگ۔“
 ”گڈ مارننگ۔“

زینب بی بی اور مولوی صاحب اس سے باتیں کرنے لگے۔ مولوی صاحب اس سے لڑائی کی خبریں
 پوچھ رہے تھے۔ ریجان نے چائے ختم کرنے کے بعد اپنے کمرے میں جا کر ریڈیو لگایا۔ دیپالی زینب بی بی کے

کے ساتھ کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔

اچانک ریحان کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔ ”دیپالی“

”کیا ہوا؟“ وہ ڈڈی لئے لئے برآمدے میں گئی۔

”ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔“

لوگ گیت جمع کرنے کی مدت ختم ہوئی۔ دیپالی اور ریحان گھاٹ پر کھڑے تھے۔ قرب و جوار کے اوڑوں میں بھی ہوائی دنگش حیر چڑھائیاں فروخت کے لئے منڈی لے جانے والے چھتریاں لگائے کاریگروں ہجوم ساحل پر جمع تھا۔ ماہی گیر اپنی اپنی کشتیاں لے کر مکمل رہے تھے۔ مولوی ابو الہاشم حسب عادت خاموشی سے سر جھکائے اپنی کشتی کے بادبان دو: ست کرنے میں مہمک تھے۔ وہ دیپالی کو باگھیر گھاٹ تک پہنچانے لے تھے۔ بہت لمبا سفر تھا۔

رات وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں بالکل چپ چاپ کھڑا اندھیری ندری پر سے گذرتی ہوئی کشتیوں دیکھ رہا تھا۔ دیپالی اس کے ٹرنک پر ریڈیو کے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے ریحان سے کہا تھا۔ ”آپ کو اب ڈکوارٹرز سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ اس نئی جنگ کی وجہ سے پھولشن بدلنے والی ہو گئی نا۔؟“

وہ چونکہ اٹھا۔ ”جنگ۔؟ کیسی جنگ۔؟“ اس نے صہجھلا کر پوچھا۔

دیپالی نے تعجب اور ادا سی سے اس پر نظر ڈالی۔ ”آپ حقیقت سے اتنی آسانی سے کٹ جاتے ہیں۔“

”ایسا۔ ایسا سب کبھی نہیں ہوا شوکتی۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا اور اسی طرح کھڑاندی

بیکھتا رہا۔

”کل۔ اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ دیپالی نے کہا۔

”کیوں۔؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”ازرے۔ ریحان۔ میں یہاں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتی۔“

”وہ اس کی طرف مڑا۔ ”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو، تم یا میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتے۔ شاید کہیں

نہیں رہ سکتے۔“ پھر چند لمحوں بعد اس نے برآمدے میں جا کر مولوی ابو الہاشم سے دیپالی کی واپسی کے انتظامات

تعلق بات چیت شروع کر دی تھی۔

یہیں دن پہلے کی بات تھی۔ آج وہ سندرن سے واپس جا رہی ہے باگھیراٹ پہنچ کر وہ اسٹیمر کے ذریعے بار لیرال اور فریڈ لور کے دریاؤں پر سے گزرتی نارائن گنج چلی جائے گی۔

ریجان اب پریشانی کے ساتھ کلکتے کے خفیہ ہیڈ کوارٹرز سے کسی اطلاع کا منظر تھا۔ پارٹی کے نمائندے بڑے بڑے رپورڈر تپتے ہوئے راجستھان کی دیوبلی جیل میں بند تھے۔ ان کے پاس سے اسمگل ہو کر کسی نئے ڈائریکٹو کا کلکتہ ہوتے ہوئے سندرن پہنچنا محنتوں کا نسخہ تھا۔ سندرن پر بارشیں شروع ہو چکی تھیں میں یہاں جانے کب تک رہوں گا۔" ایسا لگتا ہے کہ جیسے کلکتے کے ساتھ مجھے بھول ہی گئے ہیں۔" اس نے سچ بڑی طول آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔

اور اب دیپالی چھتری کے نیچے چھپی گھاٹ پر کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر چھتریوں کا میلہ سا لگا تھا صوبہ ماو بار آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ چھتری لگتی ہے تو سندرن کے جنگل اور کھال اور دریا اور سڑا اور سندرن صوبہ پانی میں ڈوب جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے ایک بڑے سے واٹر ٹرک لینڈ اسکیپ کو واٹس کے بعد پانی کی چلیمی پی میں چھوڑ دیا ہو۔ اور ساسے رنگ پانی میں پھیل کر آپس میں لگدٹ ہو جائیں۔

ریجان چھتری لگائے دیپالی کے قریب کھڑا تھا۔ اچانک اس نے بڑے غصے سے کہا: تم بھی جا رہی ہو چلو بیٹی کوٹھم۔" مولوی ابوالہاشم نے اسے آوازی دی۔ وہ اور زینب بی بی لگے باضابطہ کلکتہ ہی لپکارتے تھے۔ انھیں یقین کامل تھا کہ بہت جلد یہ لڑکی ریجان کے ہاتھوں پر مشرف بہ اسلام ہو کر اس سے نکاح کرے گی۔ جانے ریجان نے ان دونوں بھولے میاں بیوی کو کیا ٹی پڑھا رکھی تھی۔ زینب بی بی نے تو ایک رات ریجان سے بڑی رازداری سے کہا تھا کہ کلکتہ کو مولوی صاحب کلمہ پڑھا دیں اور شربت کے پیمانے پر نکاح ہو جائے۔ یوں بھی یہ برسات کا زمانہ اور شادیوں کا موسم تھا۔ ان بیچاری نے برسوں سے سینے کر رکھ ہوئی ایک نئی سوئی ساری بھی نکال کر ریجان کو پیش کر دی تھی۔ یہ ساری انہوں نے اپنی بیوی کے لئے رکھی تھی اور جب ریجان نے ان کو سمجھایا کہ پہلے اسے گاؤں جا کر اپنے باپ سے بھی اجازت لینی ہے تب ہم وہ یہ ساری اپنی طرف سے تحفہ دینے پر تضر رہی تھیں۔ ریجان کے انکار پر انہوں نے کہا تھا۔ ہمیں غریب کو کورہم ہے یہ تحفہ نہیں لینا چاہتے ہو بھئی اور روئے لگتیں نہیں۔ لیکن ریجان بے حد سٹیٹا یا تھا۔ اس مندرجہ واقعے کے بعد اب دیپالی سے یہ کس طرح کہے کہ یہ مٹرخ ساری بھی لے لو، جسے پہنا کر زینب بی بی تمہیں دلہ بنا نا چاہتی ہیں۔ مجب گھپلا ہو رہا ہے یہ خدا کی قسم۔ اس نے سیدنا کچھ کر سوچا تھا۔ مگر زینب بی بی کا دا

رکھنے کے لئے وہ ساری ان سے لے کر ٹرنک پر رکھے ہوئے اخباروں کے نیچے چھپا دی تھی۔ زینب بی بی کے جانے کے بعد دیپالی ریڈیو سننے کے لئے اس کے کمرے میں آئی اور ٹرنک پر بیٹھنے کے لئے اس پر سے اخبار اٹھائے تو نیچے سرخ ساری پر اس کی نظر پڑی اور ریمان خود شرم سے سرخ ہو کر فوراً کمرے سے باہر بھاگ گیا تھا۔

دیپالی چھتری ذرا اونچی کر کے اس کی طرف مڑی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اتنے میں دونوں یکساں دیکھتے ہیں کہ زینب بی بی اپنی خشک چھتری لٹکائے بغل میں ایک بندل والے اقلاد خیزال پگڈنڈی پر سے بھاگتی چلی آ رہی ہیں۔ نزدیک آ کر انھوں نے اجنب میں لپٹی ہوئی سرخ ساری دیپالی کے ہاتھوں میں ٹھونس دی اور کچھ کہنے سے بغیر اسی سروت سے گھاٹ کی بھیڑ میں غائب ہو گئیں۔

چند قطرے ٹپ ٹپ بندل کے کاغذ پر گرے۔ دیپالی نے اوپر دیکھا۔ شاید بارش آگئی۔ مگر وہ ریمان تھا جو اس کے قریب کھڑا تھا۔ یہ آنسو اسی کی آنکھوں سے گرے تھے۔

وہ دونوں چپ چاپ کھڑے دریا کے کنارے منظر کو دیکھتے رہے۔ کشتیوں نے لنگر اٹھا دیئے تھے۔ بادبان کھول دیئے گئے تھے۔ قسم قسم کی کشتیاں سطح آب پر کھرجکی تھیں۔ مولوی ابوالہاشم نے اپنی کشتی جیٹی سے لگادی اور دوبارہ پکارا۔ "کو لٹم بیٹی۔ اللہ کا نام لے کر آ جاؤ۔ اللہ تم دونوں کا نگہبان۔ اللہ"۔ دیپالی نے چپکے سے دل میں دہرایا اور سرخ ساری کا بندل مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ کر آگے بڑھے اور کوڈر کشتی میں بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب کا چھوٹا لڑکا جواب تک چٹائی کی چھت کے اندر دیپالی کا سامان رکھنے میں مشغول تھا باہر نکلا اور دونوں باپ بیٹوں نے چپو منبھالے۔ ریمان نے گھاٹ کی میٹھیوں پر آکر اوداع کے لئے ایک ہاتھ اٹھایا اور پھر گر دیا۔

عین اسی وقت ایک نو کشتیوں کی بھیڑ میں سے تیزی سے نکلتی سامنے آکر مولوی صاحب کی کشتی سے لگ گئی۔ مولوی صاحب کا ہم شکل ایک داڑھی والا نوجوان کوڈر گھاٹ پر اترتا۔ اس نے اپنے باپ کو اور دیپالی کو آداب کیا اور ریمان کے پاس جا پہنچا۔

"ریمان بھائی ..."

ریمان جواب تک سر جھکائے کھڑا تھا چونک پڑا۔

"تم اس وقت کیسے؟"

ابوالقاسم نے اپنی تہ پر بندھی میٹی کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا اور آہستہ سے کہا: "او ماری"

نے آپ کو کلکتے فوراً بلایا ہے۔ کل رات میرے پاس سیندر —
دیپالی نے صرف اتنا ہی سنا۔ اُمدادی نے آپ کو کلکتے بلایا ہے۔ اُمدادی نے آپ کو فوراً —
اُمدادی نے آپ کو — اُمدادی نے آپ کو فوراً — اُمدادی نے —
کشتی گھاٹ سے الگ ہو کر یانی میں پہنچ چکی تھی۔
اُمدادی نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔ اُمدادی نے —

”شوکتی —“ گھاٹ پر سے ریمان کی آواز آئی۔ ”ٹھہرو۔ میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں؟“
”میں میدھی ڈھاکے جاؤں گی۔“ اس نے کلفت ذرا خشکی سے جواب دیا۔
”ہاں۔ ہاں۔ لیکن کچھ دور تک —“

ریمان تازہ انگریزی اخباروں کا پلندہ البواقا سم کے ہاتھ سے لے کر اس کے ساتھ آہستہ آہستہ گفتگو
میں مصروف ہو گیا۔ اب وہ دیپالی کے وجود سے بالکل بے خبر ہو چکا تھا۔

وہ چند منٹ تک اسی طرح کشتی میں بیٹھی رہی۔ پھر مولوی ابولہاسم نے آنکھوں آنکھوں میں اسے
شارہ کیا کہ وہ گھاٹ پر اتر آئے۔
لوڑھے مولوی صاحب دنیا دیکھ چکے تھے۔

ارجمند منزل

نواب قمر الزماں چودھری کا کتب خانہ ارجمند منزل کے بیرونی، طویل برآمدے کے ایک سرے پر تھا۔ اس کمرے کے سیاہ و سفید ٹائلوں کے فرش پر بیش قیمت کشمیری تالین بچھا تھا۔ جس میں بنا ہوا "شجر حیات" کا ایرانی نمونہ اب کافی گھس چکا تھا۔ دیواروں کے برابر محکم شحیم الماریاں استادہ تھیں۔ ایک طرف آنیوس کی بڑی میز پر چاندی کا قلمدان اور کاغذ اور کتابیں نفاست سے موجود تھیں۔ بڑے درجے کے نیچے، جو پہلو کے باغ میں کھلتا تھا۔ نواب صاحب کی آرام کرسی بھی تھی اور چاندی کی نقشیں پتر چڑھی نیچی جو کی پر سچوان دھرا تھا۔ دیواروں پر سرسید، جالی، مسر سلیم اللہ اور شیر بنگال لے۔ کے فضل الحق کی تھا دیر اور نزل تھیں۔ ڈھاکے کے مغل قلعے ہلال باغ کا بڑا دل آویز و اثر گذار، آتشخان کے ادپر اور بوڑھی گنگا کے کنارے شائستہ خاں کے دور میں بنی صحت گنبد مسجد کا دائرہ مقابل کی دیوار پر سجا تھا۔ بی بی پری کے مقبرے اور حسینی والان کی مختصر تصاویر ایک الماری کے ادپر رکھی تھیں۔ جناح صاحب کا دستخط شدہ پورٹریٹ نیز کی عقبی دیوار پر آویزاں تھا۔ مسلم بنگال کے پرانے اور نئے بنگلہ اخبار شہکار، نوبو نور، بنگو ستانیر شاہتیہ پیریکا، اسلام پرچارک، المسلم اور تہیر کے مجلد فائل اور الہ سال، پیسہ اخبار، ہم میندار اور ڈھاکے سے شائع ہونے والے پرانے اردو رسالوں جادو اور المشرق کے فائل ایک الماری میں مقل تھے۔ دوسری الماریوں میں بنگلہ، فارسی اور اردو کی کتابوں اور قدیم نسخوں کا اچھا خاصہ خیرہ موجود تھا۔ انگریزی کتابوں کی تعداد مقابلتاً کم تھی۔

جولائی ۱۹۴۷ء کے ایک اتوار کی صبح نواب قمر الزماں چودھری اپنی آرام کرسی پر نیم دراز سچوانے میں لگائے صوبائی مسلم لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے جو تیسرے پہر کو ارجمند منزل کے بڑے ہال، منفقہ ہونے والا تھا، اپنی تقریر لکھنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ تازہ اخبارات کا انبار ان کے نزدیک اخروٹ

کی کشمیری میز پر موجود تھا۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے اپنی بلند پیشانی پر لٹکی پھرتے ہوئے تقریر کا افسانوی پیراگراف سوچ رہے تھے۔ چند منٹ بعد انہوں نے فائونٹین پن اٹھا کر ٹیکہ میں تعسیر لکھنی شروع کر دی۔

نواب قمر الزماں چودھری بڑی بڑی آنکھوں والے ایک وحیدہ و صلح پچاس سالہ ثقہ، وضو دار اسٹوکرٹ تھے۔ ان کے والد نواب نور الزماں مرحوم صلح خرید پور کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ انھوں نے ارجمند منزل تعمیر کروانے کے ایجنسی لینڈلارڈ کی حیثیت سے ڈھاکے میں اقامت اختیار کی تھی۔ نواب صاحب مرحوم نے خود کو نوابین ڈھاکہ کے توڑکار نہیں سمجھنے کے شوق میں راگ رنگ حقیر اور دوسرے رئیسانہ مشاغل پر بے گامشا روپیہ اٹھایا تھا۔ اس وجہ سے اب بھی ان کے جانشین نواب قمر الزماں کاشمیر کے چوٹی کے مسلمان رؤسا میں شمار ہوتا تھا۔ نواب نور الزماں مرحوم کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ڈھاکے میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے اولین اراکین اور سرپرستوں میں شامل تھے۔ ڈھاکے کے اکثر مسلمان رئیسوں کی مانند نواب صاحب مرحوم کے یہاں بھی اردو کا چرچا تھا۔ اور بچوں کو گھر پر بلکہ کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی تھی۔ نواب قمر الزماں کی والدہ نور النساء بیگم دہلی اور لاہور کے نانا رسالوں، محنت اور تہذیب نسوہ کی خریدار تھیں اور ”مسئلہ بیگم نور الزماں چودھری ڈھاکہ بنگال“ کی طرف سے کبھی کبھی اصلاح معاشرت پر ان کے مضامین ان جریدوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی یعنی بیگم قمر الزماں کشتیا ضلع کے ایک خالص ”بنگالی اسپیکنگ“ زمیندار کی بیٹی تھیں۔ انھیں اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ مگر جہاں آراء اور اس کے بھائی اور بہنوں کو گھر پر اردو پڑھائی گئی تھی اس وقت جبکہ نواب قمر الزماں اپنی خاموش اسٹیڈی میں سکون سے بیٹھے تقریر لکھ رہے تھے۔ باہرانی شور مچ رہا تھا۔ کونٹھی کے وسطی ہال میں لیگ کے جلسے کے لئے ایک قطار میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں پوربنی رلم سرن اسٹیج کی میز پر رکھے گلڈن میں پھول سجایا تھا۔ باقی دوسرے ملازمین کمرے کی صفائی میں لگے تھے۔

لیکن اندر تانخانے میں جس قدر جہل پہل اور رونق تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ تین دن بعد نواب قمر الزماں چودھری کے فرزند اور جانشین نواب زادہ نیر الزماں کی بارات چڑھنے والی تھی۔ شادی کے جوڑے سب سے پہلے جوہری پھیرے لگا رہے تھے۔ گیت گائے جا رہے تھے۔ فہریرے سے رشتہ دار آنے

دفع ہو گئے تھے۔ بارات دیتاج پور جائے گی۔

تقریر لکھتے لکھتے نواب صاحب نے اٹھ کر سالوں کی الماری میں سے المشرق کا فائل نکالا۔
 اہانہ رسالہ تقسیم بنگالہ کے بعد جب لارڈ کزن نے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر مسلم اکثریت کا ایک
 پر بنا دیا تھا، مسلم بنگال کی ایک مشہور ہستی، حکیم حبیب الرحمن نے ۱۹۰۶ء میں نکالا تھا، تاکہ اردو
 ذریعہ بقیہ مسلمانان ہند سے ذہنی اور سیاسی رابطہ قائم کیا جاسکے۔ یہ پاکستان کی اولین داغ میں
 ۶۔ نواب قمر الزمان نے اپنی تقریر میں اس رسالے کے پہلے شمارے کے ایڈیٹوریل سے ایک اقتباس نقل
 کیا۔ "۱۶ اگست ۱۹۰۶ء اگر غور سے دیکھے تو کسی سعید تاریخ ہے کہ اس دن ہم کو زندگی اور موت
 مرض و صحت کا پورا پورا احساس ہوا اور ہم خواب اور نیم خوابی سے گھبرا کر چونک پڑے۔ مسلمانوں کے
 اب کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ بحیثیت برٹش انڈیا کے ایک مستقل آرگنائزین قائم کریں۔ بنگالی اخبار
 لڑی تحریر اور درشت لہجے سے اب ہمارا کیجو منہ تک آ گیا ہے۔ اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ آخر ہماری حالت
 ہوگی؟ ہم اپنے لیڈروں کے متعلق کون سی بھتی ہے جو روزانہ نہیں سنتے۔ ہمارے لیڈر کیوں بڑے ہیں۔
 لئے کہ وہ بہت سادہ سادگی نقصان برداشت کر کے صرف اس لئے پارٹیشن کے موئید ہوتے ہیں کہ یہ مسلمانوں
 لئے مفید ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے باوجود ملکی ہمدردی ہونے کے نام نہاد سودیشی تحریک میں جو پارٹیشن
 سزا دے لئے ایک آرہے، شرکت گوارا نہ کی کہ اس سے اپنی قوم گھائے میں رہتی۔"

اقتباس کا بنگالی ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے فائل بند کیا اور ۱۹۰۶ء سے لے کر اب تک کی
 اسی جدوجہد کا مختصر تذکرہ قلمبند کرنے کے بعد میز پر رکھ دیا۔ سوائے اخباروں میں مسلم لیگ کے صفحہ
 اخبار ڈان کا تازہ شمارہ تلاش کرنے لگے۔ اس شمارے میں مجوزہ پاکستان کا تفصیلی نقشہ شائع ہوا
 اور نواب صاحب اس نقشہ کے حوالے سے بنگال و آسام کے متعلق چند اہم نکات اپنی تقریر میں شامل
 فرماتے تھے۔ جب وہ پرچہ نہیں ملا، جو کل شام کی ڈاک میں دہلی سے آیا تھا۔ تو انھوں نے ذرا بے دماغ ہو کر
 "جیائی۔"

ایک ملازم کتب خانے کے دروازے کا ادوا مچھلیں پر وہ سرکا کر اندر داخل ہوا۔
 "تازہ ڈان اخبار۔" نواب صاحب نے کہا۔ "نیر میاں سے پوچھو۔ وہ تو نہیں اٹھانے
 ان سے کہنا ہیں پاکستان کا نقشہ چاہئے۔"

”حضور۔ پاکستان کا نقشہ تو نیر زمیاں نے اس میں سے کاٹ کر باہر برآمدے میں دیوار پر لگا دیا ہے۔ فرمائیے تو انکھیر لاؤں۔ مگر دیوار خراب ہو جائے گی۔“
 ”ادہ۔۔۔ اچھا۔ ٹھیک ہے۔ رہنے دو۔ جاؤ۔“
 ملازم باہر چلا گیا۔ نواب صاحب پھر لکھنے میں مصروف ہو گئے۔

اور اُس وقت عبدالقادر کو چوان کی کھڑکھڑاتی ہوئی گھوڑا گاڑی اور جنبد منظر کی برساتی میں داخل ہوئی۔

دیپالی سرکار گاڑی کے دروازے کے چٹخمی کھول کر نیچے اتری عبدالقادر کو کرایہ ادا کیا۔ عبدالقادر حسب معمول سر جھکائے گھوڑے کو ہٹاتا آگے بڑھ گیا۔ سر جھکے دیپالی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ گیا لیکن اندر جاتے ہوئے اس کی نظر صدر دروازے کے برابر والی دیوار پر پڑ گئی جہاں پام کے گٹلے کے اوپر نیر الزماں نے مجوزہ پاکستان کا نقشہ ڈرائنگ بنوں کے ذریعہ لگا دیا تھا۔

دیپالی معٹھک گئی اور آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ پنجاب، آس، بنگال، کشمیر، سرحد و سندھ، بلوچستان۔ وہ تیوری پر ہی ڈال کر بڑے غور سے اس نقشے کو دیکھ رہی تھی۔ اس وقت تک ملازم ہال میں کرسیوں لگا کر جا چکے تھے۔ اور طویل برآمدہ خاموش پڑا تھا۔

اتنے میں ایک گھبیر، نرم آواز نے اسے چونکا دیا۔

”دیپالی بیٹی۔ اتنے دھیان سے کیا دیکھ رہی ہو۔؟“

اُس نے مڑ کر دیکھا۔ نواب قمر الزماں اپنے کتب خانے کے دروازے میں کھڑے شفقت سے مسکراتے تھے۔

اُسے جہاں اُرا کے بابا بہت اچھے لگتے تھے۔ اس قدر بہتر اور نفیس اور خوش اخلاق گو ان سے باتیں کرنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ لیکن وہ خود اپنے باپ کی اتنی منہ چڑھی اور لاڈلی تھی اس لئے نواب صاحب سے بھی بے تکلفی سے بات کر لیتی تھی اور ان سے ذرا خالفت نہ تھی۔ اب اس نے آنکھیں پھیلا کر انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کیا ہے۔ کا کا۔؟“

”بیٹی، تم کو تو جانا چاہئے۔ ایک روز ہجرت جلد۔ انشا اللہ جب پاکستان بن جائے گا تو

باکستانی ہوگی۔"

"میں۔ کاکا۔" اُس نے اسٹڈی کے دروازے کی طرف چلتے ہوئے دریافت کیا۔
نواب صاحب نرمی سے ہنسنے۔ اپنی نساہی اولاد میں جہاں آزار ان کو سب سے زیادہ
ری تھی۔ اس وجہ سے جہاں آزار کی سہیلیوں کا وہ بڑا خیال کرتے تھے۔ علاوہ ازیں دیپالی ان کے
نے دوست کی لڑکی تھی

"اتنی دیر میں کیوں آئیں۔ تمہارا صبح سے انتظار کیا جا رہا ہے۔" انہوں نے کہا۔ اب جاؤ جلد
ر۔ جہاں آزار تمہارے لئے بہت سا کام لئے بیٹھی ہے۔"

"ابھی جاتی ہوں کاکا۔ مگر پہلے آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گی۔" دیپالی نے سنجیدگی سے کہا۔
"ہاں۔ ہاں پوچھو بیٹی۔ آؤ۔" نواب صاحب نے پردہ ہاتھ سے ایک طرف کواٹھا دیا۔ دیپالی
اسٹڈی میں داخل ہوئی۔ نواب صاحب جا کر اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ دیپالی قریب ایک صوفے پر
گئی۔

"تمہارے باپ کیسے ہیں۔"

"اچھی طرح ہیں۔"

"اچھا ذرا میں یہ کاغذ پڑھ لیں، پھر تم سے بات کرتا ہوں۔" نواب صاحب نے عینک کس
ر رکھ کر کاغذات بھیک کرتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر سرکار اسکول میو، نواب قمر الزماں کے ہم جماعت تھے۔ ڈاکٹری پاس کرنے کے بعد کچھ عرصہ
ہارجنڈ منزل کے فمیلی ڈاکٹر رہے۔ مارے دوستی کے فیس نہیں لیتے تھے۔ اس لئے نواب صاحب نے
س کے بجائے تحفے تحائف اُن کے گھر بھجوانے شروع کئے۔ ڈاکٹر سرکار نے ارجمند منزل ہی آنا چھوڑ دیا۔
اب صاحب کو اُن کی مالی حالت کا خوب اندازہ تھا۔ ڈرگا پوجا درعید کے مواقع پر جہاں آزار نے
دیپالی کو ساریاں تحفے میں دیں تو اُن کو دیکھ کر ڈاکٹر سرکار کا منسا تر گیا۔ انہوں نے دیپالی سے کہا۔ جب
ہاں اس کو کچھ دے نہیں سکتیں تو اس سے لیتی کیوں ہو۔ لہذا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

"بھئی ہم کیا کریں۔" نواب قمر الزماں نے اخباروں کا پلندہ ایک تپائی پر سرکاتے ہوئے کہا۔
ہمارے یہاں تم جانتی ہو۔ بیماری کا سلسلہ کتنا ہتلے۔ جہاں آزار کی ماں اختلافِ قلب کی مریضہ ہیں۔

آئے دن ڈاکٹر کی حاجت۔ مگر تمہارے باپ ایسی اٹھی کھوپڑی کے آدمی ہیں۔ مجبوراً ہم نے ڈاکٹر کھوش کو لگا لیا۔ بتاؤ بھلا اگر ڈاکٹر اور وکیل دوستوں سے فیس لینا چھوڑ دے، تو کرے کیا۔“

”آپ ان کو سمجھائیے۔“ دیپالی نے کہا۔

”خبطی ہیں۔ ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔ تم بتاؤ بیٹی۔ ایسی پریشان سی کیوں نظر آ رہی ہو

اور تمہارا شانتی نکیتھی کیسا چل رہا ہے؟“

”ٹھیک ہے کا کا۔“

”ہوتے با بوا ایک روز ملے تھے، بتلا رہے تھے کہ تم چھٹیوں میں گھر آنے کے بجائے لوگ گیت

جمع کرنے سنتھال پر گزرجھی گئیں۔“

”جی ہاں۔ کا کا۔“ دیپالی نے بڑی بے چینی سے مجرموں کی طرح صوفے پر پہلو بدلا۔

”بے چارے ہیبت سخت پریشان تھے کہ برسات کا زمانہ ہے۔ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہوگی

کہیں بیماری نہ پڑ جائے۔“

دیپالی اپنے آپ سے نظریں چڑا کر دریچے سے باہر دیکھنے لگی جہاں کا سنی پھول کھلے تھے۔ کیہ

پرسکون سہانا اتوار کا دن تھا۔ مگر نہ جانے کیوں دل کو پنکھے سے لگ گئے اور پاکستان کا نقشہ۔

اس نے بابا کو اتنا بڑھو کا دینے کے احساس کو نظر انداز کرنے کی سعی کرتے ہوئے دوبارہ نواب صاحب

کو مخاطب کیا۔ ”پاکستان واقعی بن جائے گا کا کا۔؟“

”انشاء اللہ۔“ اب وہ کاغذات ایک طرف رکھنے کے بعد آرام کر رہے تھے۔ دراز ہو کر کسی سوپ

میں کھو چکے تھے۔ دیپالی نے ان کے خیالات میں مداخلت نہیں کی۔ سمجھا اور دیوار پر لگے دائرے کلرنگ

دیکھنے لگی۔۔۔ ڈھاکے کے آثار العنا دید۔ قلعہ لال باغ۔ مست گنبد مسجد۔ بی بی پری کا مقبرہ۔

حسینی دالان۔

نواب قمرالراہ بننگال کے اس اسلامی ماضی کے وارث ہیں۔ دیپالی نے سوچا۔ اور اسے یاد

آیا۔ اُس کی جنم بھوم مین سنگھ کے وسیع وسیع علاقے میں۔ ہندو اور بوجھ بننگال کے پرسوں اور

روزہ خیر، کھنڈر بھی موجود ہیں تو میں صرف اس ہندو ماضی کی وارث ہوں؟ اس ماضی اور اس اسلا

ماضی کی وراثت کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں۔؟

لیکن ریحان نے سندھ میں ایک روز اس سے کہا تھا۔ تاریخ آپ سے آپ میں سمجھا دیتی ہے ہم خود تاریخ ہیں۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی تاریخ کی مجموعیت کی سب سے بڑی تصویریں۔ نواب صاحب آنکھیں بند کئے، میچوان کے آہستہ آہستہ کش لگا رہے تھے۔ اور غالباً دیہاتی لی سے بے خبر ہو چکے تھے۔ دیہاتی نے انھیں دیکھ دیکھ ہنڈ، نیک نفس، شریف انسان، مسلم لیڈر۔ لیکن اپنی نیک نفسی اور خلوص نیت کے باوجود ان کو عبدالقادر کوچوان کے مسائل ساس ہے؛ عبدالقادر کوچوان پاکستان کے قیام سے مستفید ہوگا۔؛ مجھے یہ سب کون ہے؟

ریحان نے کہا تھا۔۔۔ دیہاتی۔۔۔ ہندوستان کے نوے فیصدی انسان مطمئن ہیں اصحابِ ی کی تلخی، کم مائیگی، کمتری اور بے عرقی کے احساسات کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ زندہ رہنے کی لہجہ اور اخلاق اور مذہب اہل فلسفے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ انسان کو جھوٹا اور گھٹیا اور کمینہ اور عاری بنا دیتی ہے۔ ہم ہندوستانی اسی لئے جھوٹے اور کمینے اور کردار سے عاری اور بے ماضی سمجھا رہے ہیں کیونکہ آبادی کم اور گیموں اور چاول واقف تھا۔ لیکن کوئٹل نظام اور آبادی نے ملک کا یکوم نکال دیا۔ ہندوستان والوں کو جھوٹا اور بے ایمان بنا دیا۔ ہر کوئی ملک سے لامحالہ گھٹیا اور کردار سے عاری ہو جاتے ہیں۔ غلامانہ ذہنیت بے معنی اصطلاح نہیں ہے۔ سورج اب نصف النہار پر پہنچنے والا تھا۔ کتب خانے کے وسیع دریچوں میں سے آتی ہوئی۔ ل نے شہنشاہ اور نگزیب عالمگیر کے بیٹے، صوبے دار بنگال، شہزادہ محمد اعظم کے بولے قلعہ بڑی پینٹنگ کو جھلملا دیا۔ دیہاتی مسخوڑ ہو کر اس پینٹنگ کو دیکھا کی۔ ریحان نے کہا تھا۔ (وہ) سوچ رہی تھی۔ جس طرح پادری بھرتی بات بات پر اس سے کہا کرتے تھے۔ "یسوع"۔ "ریحان نے کہا تھا،۔۔۔ ہمارے بنگال کی، ڈھاکے کی مسجدیں۔ قلعے، پرائے مملات، عات، ہماری سنگیت اور سنگتراشی، یہ سب اس شہر سے، روحانی ماضی کی یادگار ہیں۔ عمارت کے شہر کا موجودہ فرقہ وارانہ کھنچاؤ اور افلاس برطانوی کولو نیلزم کا ثبوت ہیں۔ رکھانے کو کم ملے گا وہاں فرقہ وارانہ کشمکش ناگزیر ہے کہ سب ایک دوسرے کے منہ سے اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگ کا قانون ہے۔ برطانوی نظریہ ایک ایسی بدکار

ہے۔ جس کے سامنے کھڑے ہوئے قطار اندر قطار مختلف ہندوستانی نعرے اپنے اپنے کھنکول
 جو لیاں پھیلاتے ایک دوسرے کو دھکیلیں کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں۔ اور پھر پھولوں میں مصروف
 لہے جو کے غرغر شہرہ، اب نارمل عوام آپس میں فساد کر کے ملک کی قسمت کا آج کل فیصلہ کروا
 رہے ہیں۔

”ہاں بھائی دیپالی۔ کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔“ نواب صاحب نے ایک دم زور سے
 گڑگڑا کر آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

دیپالی چونک پڑی۔ پھراس نے کہا۔ ”کاکا۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ ملک تقسیم ہو جا۔
 نواب صاحب چند سیکنڈ تک سچوآن گڑگڑاتے رہے اور پھر رساں سے کہا۔ ”بیٹی تم
 علوم ہے کہ سارے ہندوستان کے مسلمان تباہ حال ہیں، ایک وقت تھا کہ اسی بنگال کا مسلمان
 حال اور آسودہ تھا۔ صرف اس صوبے میں ایک لاکھ اسلامی مدارس تھے۔ بیٹی۔ ایک لاکھ در
 اب یہاں مسلمانوں کی عزت اور جہالت کی کیا حالت ہے؟ خود تمہارے گرو دیو شیکور بنگالی
 کی اقتصادی پیمانہ اور ان کے ساتھ سماجی بے انصافی کا اعتراف کر چکے ہیں۔“

”مگر کاکا۔ آزاد متحدہ ہندوستان میں بھی تو مسلمان خوشحال ہو سکتے ہیں۔“

”متحدہ ہندوستان میں۔؟ ہرگز نہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”اور سب
 متحد کب تھا۔ اسے انگریزوں نے متحد کیا۔ دیپالی تم میری بچی ہو۔ میں تم سے کیا بحث کروں۔
 اب تمہارے بابا سے بھی بحث نہیں کرتا۔ جوانی کے زمانے میں ہم دونوں خوب جھگڑتے
 جب وہ احمق الدین اپنے باپ دادا کی کچی کھچی زمینیں بیچ کر کانگریس میں گھس گئے تھے۔ جیل
 گئے تھے۔“ انھوں نے پھر سچوآن کی نے منہ سے لگائی۔

”کاکا۔ میں بچی نہیں ہوں۔“ دیپالی نے اٹھ کر کہا۔ ”میں آپ سے یہ باتیں ڈسکن کرنا چاہتا

نواب صاحب نے ذرا اداسی سے مسکرا کر اسے غور سے دیکھا اور کہنے لگے۔ ”میں بھی

تھا تم اس سر پھرے سچاے دیشیش بابو کی بھتیجی ہو۔ تم بھی سر پھر ہی ہوگی۔ مگر آج ایک نصیحت کرتا

قومی جدوجہد کے چکر میں تم کسی آفت میں نہ پھنس جانا۔ تمہارے باپ پہلے ہی ایک بہت بڑا

سے چکے ہیں۔“

”قربانی۔۔۔“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔ ”تیاگ اور قربانی تو اس دس کی پرانی روایت ہے۔
 تو تم بدھ سے لے کر جہاتا گاندھی اور جواہر لال نہرو تک سب قربانیاں دیتے آئے ہیں۔ تیاگ اور
 ۔۔۔ تیاگ اور قربانی۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ نواب صاحب ذرا مسکرا کر چپ ہو رہے۔

”نہیں کا کا۔۔۔“ دیپالی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ملک کو تقسیم نہ ہونے دیجیے۔“

”بیٹی۔۔۔“ نواب صاحب نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا اور تمہارا نقطہ نظر بالکل
 نہ ہے۔ میں تم سے کیا کہوں۔۔۔“ پھر انہوں نے کرسی پر سپلو بولا اور قریب کی میز پر سے اپنی ناکھل
 ٹھاکر لے دھیانی سے اس کے اوراق پلٹتے ہوئے دہرایا۔ ”بالکل جدا گانہ ہے۔ ہم ۱۹۰۶ء کی تقسیم
 سے محوش تھے۔ کیونکہ اس میں ہمارا اقتصادی فائدہ تھا۔ تم لوگوں نے اسے اپنی سیاسی عوام پر فرض
 سمجھا اور اس کو ختم کرنے کے لئے تشدد کی تحریک شروع کر دی اور ہم پھینکے گئے۔ یہ ہم پھینکنے
 تمہارے ہیرو قرار پائے۔ بیٹی معاف کرنا۔ تم نے ہی یہ ذکر تھیرا ہے اور تم کہتی ہو کہ تم اب بڑی ہو گئیں
 سمجھ دار ہو۔ اس لئے میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ اسی دھاکے میں تقسیم کے خلاف احتجاج کرنے کے
 لڑیوں پر ہم پھینکے والوں کے پانچ تہ خفیہ گروہ تھے۔۔۔“

”پانچ تہ۔۔۔ کا کا۔۔۔“ دیپالی نے آنکھیں پھیلا کر دہرایا اور سوچا۔ میں اس ہم پھینکنے
 روہ کی روایت کی پیرو ہوں۔ اور نواب قمر الزماں چودھری مخالف کیمپ میں ہیں۔ ایسا کیوں
 ۔۔۔؟

”بنگال کی مسلم اکثریت کا یقیناً اس تقسیم سے فائدہ تھا۔ تم نے تو بیٹی گاؤں میں ہندو
 ان اور ہندو زمیندار کے پنجے میں پھنسنے مسلمان کسان کی حالت نہیں دیکھی۔۔۔“

”آپ بھی تو زمیندار ہیں کا کا۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔“ نواب صاحب نے ذرا ہنسنے لگا کر سچپان کی نے الگ کی اور گھنٹی بجائی۔
 ”میں ملازم ایک تابع فرمان جن کی طرح نمودار ہوا۔ نواب صاحب نے ابرو سے سچپان کی طرف
 دیکھا۔ ملازم چلم تازہ کرنے کے لئے باہر لے گیا۔ نواب صاحب دیپالی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ”کیا
 ہی کا ٹکریس میں زمیندار اور سرمایہ دار شامل نہیں۔۔۔؟“

”میں کا حکم ایسی نہیں ہوں کا کا۔“

”پھر۔ پھر کیا ہو۔؟“ وہ دفعتاً چونک اٹھے۔ ”تم بیٹی کہیں کیونسٹ تو ہو گئیں؟ بنگال میں آج کل یہ تھی دبا پھیل رہی ہے۔“ انہوں نے بڑی آرزوگی اور تردد سے نظر ڈالی۔

”جی نہیں۔ میں کیونسٹ نہیں ہوں کا کا۔“

نواب صاحب کو اس انکار کا قطعی یقین نہ آیا۔ وہ تاسف کے ساتھ سر ہلایا کہہ دیا۔ ”دیپالی نے ذرا بے خوبی سے کہا۔ کا کا میں تو محض دیش کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔“

آنادی کی خاطر۔“

”ضرور خدمت کرو بیٹی۔ آزادی حاصل کرو۔ مگر یہ آزادی مسلمانوں کے لئے نہیں ہوگا اتنی تمہیں ان کے خیالات میں ہے۔ دیپالی نے لرز کر سوچا۔ تو ہم لوگ، ریحان اور سائے، محض ایک مصنوعی، غیر حقیقی، خیالی دنیا آباد کر رہے ہیں۔؟“

جن تازہ چلمے لے کر اندر آیا۔ چلم پچوان پر رکھی اور چند قدم پیچھے ہٹ کر دروازے باہر نکل گیا۔ کہ نواب صاحب کی طرف پیٹھ کر کے نہ جاسکتا تھا۔ دیپالی نے نواب صاحب سے در کیا۔ ”کا کا۔ یہ کیوں کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ صرف نوابوں اور راجاؤں کی جماعت ہے راجہ محمود آباد۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں۔ اور جیسے نواب قوہ الزماں چودھری۔“ وہ کھا کر ہنسنے لگی۔ نواب صاحب نے تپانی سے گلے ہوئی چاندی کی موٹھ والی چھڑی اٹھا کر اسے گویا پیٹے ارادہ ظاہر کیا اور پچوان کا ایک کش لگا کر بولے ”بنوے چندر نے اپنے لاڈ پیار میں تجھے بالکل برباد نہیں بتائیے کا کا۔“ وہ مچل کر بولی۔

نواب صاحب تیوری پر بل ڈال کر اسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”دیپالی۔ تمہارے ٹھاکر دادا ابھی زمیندار تھے اور ان کی اور میرے والد مرحوم کی آپس میں خاصی دوستی دونوں کے ہاں ناچ گانے اور ناٹک کی محفلیں جتنی تھیں اور عیش ہوتے تھے اور یہ دونوں بزرگ میرے آبا مرحوم اور تمہارے ٹھاکر دادا انگریزوں کے وفادار تھے۔“ پھر وہ جیسے یکنگت پرانی بات سوچنے لگے۔ جند محفلوں بعد انہوں نے کہا۔ ”اسکول میں بنوے چندر اور میں ہم جماعت تھے۔ نہ

یہ پانچ چھ سال کچھ سے چھوٹا ہے۔ مگر مسلمان رئیس زادہ ہونے کے کارن میری انگریزی تعلیم خاصی پر دانی اور دیر میں شروع کروائی گئی تھی۔ خیر۔ ” وہ آنکھیں بند کر کے ابروؤں پر اپنے ہاتھ کی اور انگوٹھا پھیرنے لگے۔ اور پھر کہا۔ ” ہمارا ایک اور کلاس فیو لوبھی تھا۔ وہ سید مرتضیٰ حسین۔ جو بڑا کٹر نیشنلسٹ مسلمان ہے اور تمہارے دشوا بھارتی میں بڑھا تا ہے۔ خیر۔ پھر تمہارے باپ چچا اپنی قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ وہ جس سیاست میں شامل ہوئے، وہ میرے نزدیک مسلمانوں مخالف سیاست ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو مجھے بے چارے دشمن کی شہادت کا صدمہ نہ نہیں ہوا۔؟“

”بہی جب اس کی آنکھیں اور شبلیں اور باتیں یاد آتی ہیں۔ دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ مگر سچی مجھے سوچیں یہ ہے کہ وہ گمراہ تھا اور اپنی جان اس نے بیکار ضائع کی۔ یہ تشدد پسندی اور دم پھینکانا۔ گولی مار دینا۔ اس طریقے سے کیا برطانیہ کی طاقت کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے؟ مگر اب بہر حال اس ایک کا زور کم پڑ چکا ہے۔ خیر بھائی دیپالی۔ یہ بڑے گنجلک معاملے ہیں۔ بڑی ہوگی تو سمجھو گی۔“

”نوعمری کا جوش ہے اور انقلاب زندہ باد کے نعشے لگا رہی ہو۔ مگر سردھڑکی بازی سوچ سمجھ لگانا چاہئے۔ اور بی بی تم اس فلاکت زدہ زمانے میں پیدا ہوئیں۔ تم بے چاری نے دیکھا ہی کیا ہے۔ تو سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تمہاری چند رکنج نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ میں سمجھتا ہوں اگر ارے بھٹا کر دادا کے زمانے کی امارت تھوڑی سی لہمی تک باقی ہوتی تو شاید تم اس جوش و خروش

”خوابوں اور امیروں کی مخالف نہ ہوتیں۔“

”لیکن ادمارے تو اب بھی بڑی رئیس زادی ہیں۔ دیپالی نے کہنا شروع کیا۔“

”ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ بیرسٹری تو ش رائے کی لڑکی تم سب کی سرغنہ گرو بن گئی ہے۔ مگر میں اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ دیپالی میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ میرے لات پر تم کو غصہ ہی آئے گا۔ خیر تو تم مجھ سے ڈسکس کیا کرنا چاہتی تھیں۔؟ وہ پھر مکرانے لگے۔“

”کا کا۔ میں صرف یہ کہہ رہی تھی۔“ دیپالی نے اب ذرا غیر یقینی لہجے میں کہا۔ ”کہ بھوارے کے نئے اتحاد کی بھی کوشش کی جاسکتی ہے۔؟“

”اتحاد۔ اتحاد ہے کہاں۔؟ پنجاب کا آریہ سماج اور مہا ایشٹرا اور بنگال کی ہندو تجدید

اتحاد کی نشانیاں ہیں۔؟“

”میں دوسرے مسلمانوں کے متعلق تو نہیں جانتی گاگا۔ مگر ہمارے بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا کلچر تو بالکل ایک ہے۔“

”مانتا ہوں بھائی۔ یہاں کا کلچر ایک ہے۔ یہاں کی نوک سنگیت، لوک سائینس ہر چیز میں مسلمانوں کا لٹنٹرا احصہ ہے۔ مگر ہندوؤں نے کبھی اس کا اعتراف کیا؟ بنگالی کلچر سے انہی نے انحص ہندو بنگالی کلچر ہوتی ہے۔ پچھلی صدی میں تو زور شور سے یہ بحث چھیڑی گئی تھی کہ بنگالی مسلمانوں کی زبان ہی نہیں۔ بنگلہ ادب اور تہذیب ہمہ ہندوؤں کا ورثہ ہے۔ کیا ہم اتحا نہیں چاہتے تھے؟ خدا کی قسم ہم اتحا چاہتے تھے اور کھچھل آٹھ سو سال کی تخلیق شدہ بنگالی لوک سنگیت اور ادب اس کا مکمل ثبوت ہے۔ مگر اب مسلمانوں سے اتنی نفرت۔ ان کے لئے حقہ کا ایسا رویہ۔ تم نے آئندہ کھٹھڑھا ہے؟“

دیپالی نے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن بنگال کے مسلمان پسماندہ اور مفلس کسان اور ماہی گیر اور ملاح اور کارگر ہیں۔ اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تمہارا ہندو بنگالی پریس نواب سر سیم اللہ کو انگریز کا چٹھو کہتا ہے اور یہ جواتے بنگالی ہندو ناسٹھ ہیں۔ یہ انگریز کے چٹھو نہیں۔؟“

دیپالی خاموش رہی۔ نواب صاحب نے ذرا جوش بات جاری رکھی۔ ”تم بنگالی کلچر کے اتحاد کی بات کرتی ہو۔ بالکل صحیح ہے۔ سو ڈیڑھ سو سال قبل تک یہ کلچر واقعی ایک تھی۔ راجہ رام موہن رائے عربی اور فارسی کے عالم تھے۔ نوابین مرشد آباد کے دوستک ہندو متر فارسی پڑھتے تھے۔ تمہارے گرد دیو، جن کا خاندانی نام انگریزوں نے ٹھا کر کے بجائے ٹیگو کر دیا۔ ٹھا کر کا یہ خطاب۔ اس خاندان کو بنگال کے مسلمان نوابوں ہی نے دیا تھا۔ تم یہ بات جانتی ہو۔؟“

دیپالی نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

”ایک زمانے میں یہ ٹھا کر خاندان پیر علی برہمنوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے قنوجی برہمن کی ذات پات کی قیود توڑ کر مسلمان نوابوں کے یہاں ملازمت کر لی تھی۔ خود اپنا نام دیکھو۔ سرکار مجموعہ دلدیا مزدار، تعلقہ دارا اور قانوں گو۔ یہ سب بنگالی کا بستھوں کے مغل عہدے تھے، جو اب تمہارا ذات بن چکے ہیں۔ نواب صاحب نے پچوان کی نے ایک طرف رکھ کر لمبی سانس لی۔“

”مگر کا کا۔۔۔ دیپالی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہندو تجدیدیت کے ساتھ مسلم تجدیدیت بھی تو شروع ہوئی بنگال میں۔۔۔ سندھ میں اسے ریکان نے ایک شام وہابی تحریک کے متعلق بتلایا تھا۔ جس کی زیر قیادت مسلمان مولوی انیسویں صدی میں بنگالی مسلمان کسانوں سے کہتے پھرتے تھے کہ وہ اپنے ہندو اجداد پر سوجا ترک کر دیں۔“ اور پھر لڑو ادا انگریزوں نے آپس میں۔ ”اس نے باواز بلند کہا۔ ”ہر بات کا الزام انگریزوں کے سر تقویر بنا بالکل غلط چیز ہے۔ تم لوگ چند مفروضوں کی بنا پر بنی ساری دلیلیں پیش کرتے ہو۔“ انہوں نے گھڑی دکھی اور چونک کر کہا۔ ”تمہارے ساتھ میں بیگار کی مفروضی میں اتنا وقت نکل گیا۔ مجھے ابھی تقریر بھی تو لکھنی ہے۔“ انھوں نے تپائی پر سے کاغذ اٹھایا۔

”کا کا۔۔۔ مجھے سنائیے اپنی تقریر۔۔۔“

”بھاگ جاؤ۔۔۔“

”نہیں کا کا۔۔۔“ اس نے اُن کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیا اور نامکمل صفحہ پڑھنے لگی۔ ”اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانان بنگال نے عیسائی مبلغین کے خلاف اور ہندو احمیاء کی مدد سے اخبار اور رسالے نکالے اور ہمارے لیڈر قوم کی بے چارگی پر خون کے آنسو روتے رہے۔ بھائیوں! قادیانہ ہے کہ شہرہ کے بعد سے آج تک، لاہور سے لے کر جالنگام اور دہلی سے لے کر مدراس تک کے مسلمان محض خون کے آنسو روتے رہے ہیں۔ مگر اب مل کا وقت آ گیا ہے۔“

دیپالی نے پڑھ کر کاغذ میز پر رکھ دیا۔

نواب صاحب المشرق کا فاسل الماری میں واپس رکھنے کے لئے آرام کرسی سے اٹھے۔۔۔

دیپالی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”تم نے مسلم احمیاء کے متعلق کسی کانگریسی کی کتاب پڑھی ہوگی۔“

”جی نہیں کا کا۔۔۔ ریکان کا نام اس کی زبان پر آنے آتے رہ گیا۔“ ایسے ہی بس ادھر ادھر سے سناتے۔۔۔

نواب صاحب الماری کھول کر کتابوں کا جائزہ لینے لگے۔ دیپالی نے دریچے سے باہر جھانکا۔ ریکان نے کہا تھا۔ (یسوع مسیح نے کہا تھا) آج سے دو سو برس قبل تک بہت سے بنگالی صوفی گورکھ رتے جیسے ناموں کی کتابیں لکھتے تھے اور شہنشاہ گاتے تھے۔ بہت سے صوفیوں کے سلسلے

تترنگ یوگ تک کے ہم شکل تھے۔ بنگالی خانقاہوں میں ایک اچھا خاصا "مسلم یوگ سہتیہ" تھوٹا ہو چکا تھا۔ مدار شاہ کے فقیر اور ہندو یوگی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اور یہ مذاری فقیر اور ہندو سنیا کا مشابہہ، کہ جیسا ناک قحط کے بعد کمپنی کی انولج سے لڑتے بھڑتے پھرتے تھے۔ اور ریجان نے بتایا تھا کہ ایک مرتضیٰ شاہی فقیروں کا سلسلہ تھا۔ جن کے گرو سید مرتضیٰ آئند نے یوگ قلندر اور وشنو بھونور کی ایک کتاب لکھی تھی۔ ایک شادی شدہ برہمن زادی ان پر عاشق ہو کر ان کی چلی بن گئی تھی۔ اس کا نام آئند یا دبی تھا۔ اسی لئے وہ مرتضیٰ آئند کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر۔ ریجان نے کھنکار کے اضافہ کیا تھا۔ جس طرح اس خاکسار کو باؤل فقیر سید ریجان دیپالی کہا جائے گا! درجے میں کھڑے کھڑے دیپالی کو یہ بات یاد کر کے ہنسی آگئی۔ "You and I — we two are —"

the stuff all human love is made

اب سمجھ میں آتا ہے کہ ہمارے سارے باؤل مغنی عشق مجازی اور عشق حقیقی اور انسانیت کے عشق کے متعلق کیا گاتے پھرتے تھے؟ شیخ مدن باؤل، ہستون شاہ، حسن رضا، لال شاہ۔ یہ سنگیت کا درویش جن کی شاعری اور موسیقی نے اتنی شدت سے گرو دیو کی شاعری اور موسیقی کو متاثر کیا۔ کیا یہ مشترکہ ذہن نہیں؟ اور دیپالی نے خود اپنے گاؤں میں سنگھ میں دیکھا تھا کہ برہمادتیہ فقیر جو مسلمان تھے۔ منتر پڑھ کر اور گفتیاں بجا بجا کر مسلمان کسانوں کی مرادیں پوری کرنے کا تپ کرتے تھے اور مسلمان کسانوں کے ہاں شادی کے موقع پر منگل چنڈی وجے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ خود ریجان کا عرف روٹو میاں تھا۔ وٹو ہندوؤں کا نام بھی تھا۔ کیا یہ سب تہذیبی مماثلت یا اتحاد کے بے حد سطحی مظاہر ہیں، یا ان کے پیچھے کوئی ایسی گہبیر تاریخی، نسلی اور نفسیاتی مصدویت بھی پنہاں ہے؟ جو سیاسی تبدیلیوں سے بلند تر اور مادہ رار ہے گی؟ دیپالی بہت زیادہ الجھ کر دریچے سے مڑی۔ نواب صاحب الماری بند کر کے لکھنے کی میزنگی طوط جا رہے تھے۔

"یہ سب طبقاتی سیاست ہے" دیپالی نے ریجان کے الفاظ دہرائے اور اونچی آواز میں

کہا۔ "اب میں جاتی ہوں کا کا۔"

نواب صاحب نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور شاہانہ دقار سے چلتے ہوئے اس کے نزدیک آکر اس کے صبر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم بیٹی۔ مجھے آج تک معلوم نہ تھا کہ اتنا زیادہ پڑھ لکھ گئی ہو مجھے تمہاری

طرف سے بہت تشویش ہو گئی۔ لڑکیوں کے لئے اتنا بڑھ کھ جانا بہت مضربے۔ اسی لئے میں نے جہاں آجا، کو کالج سے اٹھالیا۔ تمہارا اصل فرض وہ ہے، جس کے لئے اندر تمہارا انتظار کیا جا رہا ہے۔ جاؤ جاؤ کے اپنے بھائی نیر کی بری کے جوڑے ٹانگو۔ جاؤ۔ بھاگو۔“

”جی کا کا۔۔۔“ دیپاتی نے ہنس کر کہا۔ اور تقریباً دوڑتی ہوئی کتب خانے سے باہر نکل گئی۔

نواب صاحب کیس میں سے عینک نکال کر بڑی میز پر جا بیٹھے۔

ارجمند منزل کے پائیں باغ کے وسط میں سنگِ سرخ کا بڑا خوبصورت تالاب تھا۔ جس کے چاروں طرف اونچی، کنگورے دار منڈیروں کے ساتھ ساتھ سنگی بنچیں نصب تھیں اور بیرونی میٹھیوں کے دونوں جانب حسنہ حنا کی جھاڑیاں تھیں۔ تالاب کے کنارے سیل کے نیچے کئی لڑکیاں ایک تخت پر جمع سلامتی میں مصروف تھیں۔ قریب ہی گھاس پر سیٹل پاشیاں کھچی تھیں اور بڑی سرگرمی سے جوڑے سل رہے تھے۔ تالاب کی دوسری جانب گلابِ خاص کے گھنے سائے میں ایک مسکتے سا ”شاہی تخت“ بچھا تھا جس پر نجیم آرا راطلسی دلائی پھیلائے اس پر گولے کا چومکھا جال بنانے میں مصروف تھی۔

یہ ”شاہی تخت“ اس زمانے کی یادگار تھا جب نواب نورالزماں مرحوم کے ہاں ارجمند منزل کے باغ میں جاترا والوں کی منڈلیاں آکر ڈیرے ڈالتی تھیں۔ لوک نائک کھیلے جاتے تھے۔ بنگالی تھیٹر کمپنیاں تاریخی، سوشل اور سیاسی ڈرامے اسٹیج کرتی تھیں اور شہر کے ہندو اور مسلم امرار جمع ہو کر ”شاہجہاں“ ”ٹیپو سلطان“ ”سراج الدولہ“ ”میر قاسم“ ”کرانی جیون“ اور ”خودی رام باسو“ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ (خودی رام باسو، جو ایک دہشت پسند نوجوان تھا اور جسے مظفر پور کے انگریز جج کنگز فرڈ پر قتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں حوالہ میں پھانسی ہوئی تھی ہزاروں ہندو گھروں میں اس کی لاکھ تبرک کی طرح تقسیم کی گئی اور لوگ اس کے تصویر بنانا کر سیتے لگے۔ اس کے متعلق مقبول ڈرامہ بھی ارجمند منزل میں کھیلا جا چکا تھا) یہاں گریش چندر اور شیگور کا چرچا رہتا تھا۔ اور بنگلہ سنگیت نائگوں کی موسیقی لوبھی تھی۔

ڈھاکے میں اردو تھیٹر ۱۹۰۶ء سے پہلے سے قائم تھا اور اواخر انیسویں صدی تک یعنی جب نواب نورالزماں فرید پور سے آکر وہاں سکونت پذیر ہوئے۔ شہر میں متعدد تھیٹر کمپنیاں موجود تھیں جن کے

نشی اور ایکویسٹریس لکھتو سے منگوائے جاتے تھے اور ایکریس میں مردانہ پارٹ کرتی تھیں۔ ۱۸۷۱ء تک، جب نواب قمر الزماں کے دادا پہلی بار فریڈ پور سے ڈھاکے آن کر رہے تھے۔ شہر میں چونتیس تھیرٹھ کینیڈا قائم تھیں۔ اور اس زمانہ سے لے کر آج تک ارجمند منزل میں نانگ کا سلسلہ جاری تھا۔ سنگالی زمینداروں کو تھیرٹھ کا ارصد شوق تھا۔ اپنے گھروں میں ایسٹج کئے جانے والے ڈراموں میں اکثر وہ خود بھی ایکٹنگ کرتے تھے۔ ”جلتہ گھر“ زمینداروں کے مکان کا لازمی حصہ تھا۔ ارجمند منزل کے جلہ گھر میں اب سیاسی میٹنگیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر اس کی ایسٹج اور دیگر ساز و سامان جوں کا توں موجود تھا۔ نواب نور الزماں کے چھوٹے بھائی نوابانہ فخر الزماں مرحوم نے خود ایک ٹیکسٹری کھونی تھی۔ خواص و عوام سبھی اسٹیج کے رسیا تھے۔ کلکتہ میں مدتوں سے رپو اوٹنگ ایسٹج موجود تھی اور ”ترکی حور“ نانگ میں پہلی بار بیک گراڈیٹر میں فلم کے مناظر سے کام لیا گیا تھا۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور دوسرے شہروں کے ہر محلے کی اپنی نانگ منڈلی تھی۔ دیہات میں جہاں ترا والے گاؤں گاؤں گھومتے تھے۔

اسی دور کے ”سین سینریوں“ کے پردوں، اونچی اونچی چینی کے گلدوں، فرنیچر، شاہی ملبوسات، نفتی تاج، دارلصی مونچھوں، کاکھ کی تلواروں اور دیگر لوازمات کا انبار ارجمند منزل کے شاگرد پیشے کے ایک گودام میں مقفل تھا۔ اور جب کبھی کالج میں ڈرامہ ہوتا تو دیہاتی اور روزی فوراً ارجمند منزل کا رخ کرتیں۔ نواب زادہ تیز الزماں گودام کھلواتے اور وہ اپنے مطلب کی چیزیں نکال کر لے جاتیں۔

نواب زادہ فخر الزماں مرحوم نے ”مراجہ بھوج“ کے عنوان سے خود ایک سنگیت نانگ منگہ میں تصنیف کیا تھا۔ اس کے لئے نئے نئے آئینوں اور رنگ برنگے نقش و نگار سے مزین دکریم آدیہ کا روایتی سنگھاسن بنوایا گیا تھا۔ جس میں ساری میں لپٹی چار مورتیاں چاروں پایوں کی جگہ تخت سربراہٹھائے کھڑی تھیں۔ بقیہ اٹھائیس مورتیاں سنگھاسن کے سر طرف بیگلے میں نصب تھیں۔ یہ ”شاہی تخت“ ایسٹج کے دوسرے فرنیچر کے انبار کے نیچے مدتوں سے دبا پڑا تھا۔ اور آج صبح ملازموں نے باہر نکال کر جھاڑ پونچھ کے گلابِ حاص کے نیچے بچھا دیا تھا۔ تاکہ صاحبزادیاں آرام سے بیٹھ کر سی پروسکیں۔

سنگھاسن کے مقابل میں سیمل کے نیچے مہر آرا مشین پر کچھ سی رہی تھی۔ تین چار خادماں

تالاب کی سیرھیوں پر بیٹھی پان چبارہی تھیں۔ ایک سیٹل پانی پر بارمونیم رکھا تھا اور ایک لڑکی بیاہ کے گیت لاپنے میں مصروف تھی۔

نواب قسم الزماں چودھری کو کتب خانے میں لیگ کے ماہانہ جلسے کے لئے تقریر لکھتا چھوڑ کر دیپالی سرکار طویل گیلری میں سے گزرتی کشادہ چوٹی نے پیر پہنچی۔ اور دوسری منزل پر جا کر جہاں آرار کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مگر کمرہ خالی پڑا تھا۔ تخت اور مسہری پر بنا رہی ساریوں کے خالی ڈبے بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مٹھائی کے گلابی کاغذوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ساری کو ٹھسی لی طرح اس کمرے میں بھی شادی کا ماحول نظر آ رہا تھا۔

نیچے سے بارمونیم کی آواز بلند ہوئی۔ دیپالی درجے میں لگی جو پھیلے بانغ پر کھلتا تھا۔ اس نے جھانک کر خجہ اور جہر آرا کو دیکھا۔ مونگیا ساری پہنے ایک اور لڑکی، جس کی پشت کو ٹھسی کی طرف تھی۔ بڑی تندہی سے شین کا سینڈل گھمانے میں مصروف تھی بادل گھرائے تھے۔ مگر ابھی بارش کے آثار نہیں معلوم ہو رہے تھے۔ بڑی سہانی ہوا چل رہی تھی۔ ایک طاز مہ تالاب کے دوسرے سرے کی اندر مٹی سیرھی پر بیٹھی چاندی کے برتن صاف کر رہی تھی۔ کتب خانے کے پریشان کن، کریناک ملکی سیاست کے تذکرے کے بعد یہ منظر کس قدر پرسکون اور نظر فریب تھا۔

باورچی خانے کی سمت سے جہاں آرا خالماں خالماں چلتی تالاب کی طرف آئی۔ دیپالی نے درجے میں سے اُسے آواز دی۔ جہاں آرا نے اسے سراٹھا کر دیکھا۔ "دیپالی۔ اتنی دیر لگا دی۔"۔
 حبلی آؤ۔"

"آئی ہوں بھائی۔" اُس نے جواب دیا۔ اور تیزی سے نیچے چلی گئی۔

"آہ۔ دیدی آگئیں۔" راج سنگھاسن پر بیٹھی ہانچم آرار نے نعرہ لگایا۔ دیپالی تقریباً دوڑتی ہوئی سیمل کے نیچے پہنچی۔ مونگیا ساری والی اجنبی لڑکی نے پلٹ کر باوربالوں کی ایک لمبی جھوٹی نذر سے پشت پر پھینک کے دیپالی کو دیکھا اسے آداب کیا اور پھر سینڈل گھمانے میں جُٹ گئی۔ دیپالی تخت کے کنارے بیٹھ گئی۔

"آج صبح سے بارش نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں نے کارخانہ باہری جمار کھلا ہے۔" جہاں آرا نے بیش قیمت

چینی ریشم کی پستی ساری کا ڈھیر اس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔ ”لو اس پر یہ سیل ٹانگ دو۔“ دیپالی نے سورت کی جگمگاتی ہیل اور ساری کے ہمرنگ دھاگے کی ریل نیچے سیتل پائی پر سے اٹھاتے ہوئے سوچا۔ پاکستان، کیونسٹ تحریک، ہندو مسلم آویزش، عالمی جنگ۔ ان سب جھگڑوں سے بے پروا جہاں آ کر اپنے بھائی کی ہی تیار کر رہی ہے۔ کیسی خوش قسمت ہے۔ میں خواہ مخواہ دنیا کی فکر میں کیوں ہلکان ہوئی ہوں۔ یہ سوچ کر اُس نے فوراً بشارت اور زندہ دل اپنے ادھر پٹاری کر لی اور جہاں آرار اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ بے فکری سے ہنسنے بولنے میں مصروف ہو گئی۔

”رندی آیا بھی ابھی تک نہیں سچیں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”آج اتوار جو ہے۔ گرجا میں دیر لگے گی۔ پھر سنڈے اسکول پڑھائیں گی۔ اختر آرار نے جواب

دیا۔ ”اب آتی ہی ہوں گی بے پارٹی۔“ تم بھی سویرے سے آجائیں تو یہ سیل اب تک ٹک گئی ہوئی۔ جہاں آرار نے دیپالی سے کہا۔

”میں باہر کا کا سے بحث میں لگ گئی تھی۔“

”کیسی بحث۔“ اختر آرار نے پوچھا، جو دیپالی کی ہم عمر تھی

”کچھ نہیں۔ پاکستان کے متعلق۔“

”کیا کہا تم نے؟“

”میں انھیں سمجھا رہی تھی کہ پاکستان انگریزوں کا منصوبہ ہے۔“

”تم اب اسے تھک کر رہی تھیں؟“ جہاں آرار نے حیرت سے پوچھا۔

”اب اگر ہاے بزرگ غلطی پر ہوں تو انھیں سمجھانا تو چاہئے ہی۔“ مونگی ساری والی لڑکی نے

مشین چلاتے چلاتے منہ لہکا کر کہا۔ دیپالی نے چونک کر اسے دیکھا۔

جہاں آرار منس بڑی۔ ”ارے دیپالی۔ یہ یا تمہیں ہے باؤلی۔ میں نے تمہیں اس کے متعلق خط میں

لکھا تھا نا؟ اس نے بڑے پیار سے کہا۔ جہاں آرار کے دل میں ساری دنیا کے لئے محبت تھی۔

مولد سترہ سالہ ذرا روشنی آنکھوں والی یاسمین مجید نے دیپالی کو دوبارہ آداب کیا۔

”یہ تمہاری رندی آپ کی اور بہاری ہجولی ہیں۔“ جہاں آرار نے اس سے کہا۔

”آں ہاں۔ دیدی۔ میرے پاس تو آپ کے تینوں ریکارڈ موجود ہیں۔ اور ایک میت پر عید، ہاں

”ہوں۔“

”ہاں بھائی۔ ہمیں یاد ہی نہیں رہتا کہ تم اتنی مشہور مغینہ ہو اور لوگ تم کو پہلے سے غائب ہی مانتے ہیں؛ بھئی ہم کیا کریں۔ ہمارے لئے تو تم وہی ہمیشہ کی دیپالی ہو۔ بقول ہماری اتنی بنوئے بابو کی خطی نڈیا۔۔۔ جہاں آمار نے بس کر کہا۔

”آپ تو مجھے بھی خطی سمجھتی ہیں آپا۔ یا سمین شگفتگی سے ہولی۔

”یہ جہل آباد، جو میں نا۔ ان کے خیال میں سب دیوانے ہیں۔ بس ہی سب سے زیادہ ہوشمند

۔ بڑی بی۔ دیپالی نے کہا۔

”روزی تاپا آگئیں۔“ انجم آرہ چلائی۔

روزی سا جھکل پر فرماتے بھرتی سیدھی تالاب کے کنارے پہنچی اور سائیکل تالاب کی منڈیر لٹکا کر تخت پر آن بیٹھی اور فوراً سلائی میں مصروف ہو گئی۔

دوسری منزل کے ایک درجے میں سے نیر الزماں نے سر نکال کر جھانکا۔ ”بھئی واہ۔ دکھو چائی ی بلوہو پائی کتنی سکھڑ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ آج کل کی لڑکیاں سینا پر دنا نہیں جانتیں۔“ اس وار دی۔

جہاں آمار نے سر اٹھا کر بھائی کا منہ چڑایا۔ روزی اور دیپالی نے اُسے فسکار کیا۔

”کتناننگ دو گے نیر بھائی۔ یا سمین چلائی۔

”جتنا چاہو لو۔“ بیگم قمر الزماں نے درجے میں بیٹھے کے چہچہ سے آکر کہا۔

”اے ہے۔ اللہ رکھے۔ ماشاء اللہ کیا اچھا لگ رہا ہے۔“ سکن بیگمے والی نمبرہ خالہ نے دیپ

پا۔ ”لے کچھ گاڈ بھی تو۔ لڑکیوں نے فریہ۔ لڑکیوں چپ ہو گئی۔؟ دیپالی تم کچھ گاڈ بیٹی۔“

نیر الزماں درجے سے ہٹ کر اندر چلے گئے۔

”بہت اچھا خالہ۔ دیپالی نے جواب دیا

بیگم قمر الزماں اور شمہ خالہ بھی باتوں میں مصروف درجے میں سے غائب ہو گئیں۔

نیچے سکن کی ڈالیوں میں مینا میں شور مچا رہی تھیں۔ تالاب کے کنارے سلطانہ جیسا کار خت مہک

پھر فاصلے پر ساگوان کے جھرمٹ میں سفید پھول کھیلے تھے۔

”دیدگا نندل کا کوئی گیت سنایے۔“ یاسمین نے کہا۔
”نندل کا۔ اچھا۔“ دیپالی سر جھکا کر سلائی کرتی رہی پھر گنگنا نے لگی۔
”نورگس باگ میں۔ نورگس باگ میں۔“

”ہمار کی آگ میں۔“

یاسمین تخت پر سے اٹھ کر اس گیت کے ساتھ مٹی پوڑی طرز کا ہلکا پھلکا رقص کرنے لگی
واقعی وہ بہت اچھی رقصہ تھی۔

”ہمار کی آگ میں۔ بھرے دل داگ میں۔“

جہاں آرا سر جھکائے سلائی کرتی رہی۔

”ہمار کی آگ میں۔ کہاں میرے پیارے۔“ دیپالی نے گایا۔ یاسمین نے گردن ہلا ہلا

بچ جاری رکھا۔

”درد دل زور۔“ دیپالی نے گایا۔

جہاں آرا ایک لخت اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

”ہرا دھاگا ختم ہو گیا۔“ روزی نے اختر آرا سے کہا۔

”دیدگی۔“ اختر آرا نے دیپالی سے کہا۔ ”ذرا طیز اور پر جا کر آپا کی الماری میں سے ہری اور سیا

ریشم نکال لائیے۔“ اس نے تخت پر بکھرے کپڑوں کے نیچے جہاں آرا کا مٹوں کا جتوہ تلاش کیا اور وہ

میں سے کنبیوں کا گچھا نکال کر دیپالی کو تھما دیا۔ ”میر بیچ والی کنبی ہے۔ چاکلیٹ کے بڑے ڈبے میں

ریشم ہوگی اور آپا کا سویٹنگ باکس اگر عقل نہ ہو تو اس میں سے ڈی ایم سی کا کاسنی لٹھا بھی نکالتی لائیے

”اچھا۔“ دیپالی نے جواب دیا اور کنبی لے کر پہلو کے زینے کی طرف روانہ ہو گئی۔

جہاں آرا کے کمرے میں پہنچ کر اس نے لمبی جوتی دکھڑی وضع کی الماری جس کے ایک پٹ

درا دم آئینہ لگا تھا کھولی۔ چاکلیٹ کا تین اور سویٹنگ باکس چوڑیوں کے ڈھیر کے پاس ایک دریا

تخت پر سامنے ہی رکھے تھے۔ دیپالی نے چاکلیٹ کے ڈبے میں سے مطلوبہ ریشم نکالیں۔ بید کا

باکس بھی کھلا ہوا تھا۔ اس کا ڈھکنا اٹھا کر اس نے کاسنی لٹھا تلاش کرنا شروع کیا۔

ریشم کے پھٹوں، ریشم اور کشیدہ کاری کے دوسرے لوازمات کے نیچے سے ڈی ایم سی

س کی جھلک نظر آئی۔ اُسے نکالنے کے لئے دیپالی نے باقی چیزیں ایک طرف سرکائیں تو کبس کی تہہ
سہی ایک تصویر دکھائی پڑی۔

دیپالی سن سی رہ گئی۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے تصویر باہر نکالی۔
یہ آج سے چند برس پہلے کے ریحان الدین احمد کی تصویر تھی۔
تصویر کی پشت پر جگالی میں لکھا تھا۔

شہزادی جہاں آرا بیگم کے حضور میں۔

اُن کے ادنیٰ غلام بے رام کی طرف سے۔

کلکتہ۔ ۱۶ اپریل ۱۹۳۵ء

اس تحریر کے نیچے ایک اردو شعر لکھا تھا۔

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ چند لمحوں تک وہ تصویر ہاتھ میں لئے مفلوج
ہی رہی۔ اتنے میں برابر کے کمرے میں کسی نے زور سے دروازہ بند کیا۔ اور وہ ہوش میں آکر چاروں
دیکھنے لگی۔ کمرہ وہی تھا۔ ساگون کی مسہری۔ بنارسی ساریوں کے ڈپتے ان گنت "طاقچوں" اور
بڑوں والی وکٹورین سنگھار میز۔ مسند۔ قالین۔ کتبوں کی الماری۔ کشمیری کڑھکتے کے پردے۔
چیز بھی نہیں بدلی تھی۔ درپے کے باہر جھلانی کی بدھم دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور نیچے تالاب کے کنارے
ٹکیوں کے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔

دیپالی نے جلدی سے تصویر سوئینگ باکس کی تہہ میں واپس رکھ کر الماری بند کی اور قد آدم کینے
سے اپنی دہشت زدہ، بچو پکی شکل نظر آئی۔ اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ اور اس کی ٹانگیں کانپ
تھیں۔

دھاگوں کی بلیں اور لچھا مٹھی میں بھینچ کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور زمینہ اتر کر سٹیل کے نیچے سنبھی۔
موسوس بھاگرنہ ازل سے ابد تک کا فاصلہ طے کر کے لوٹی ہے۔
نورگس، باگ میں۔ بہار کی آگ میں۔

درد دل زور۔

اب شمشہ خالہ کی لڑکی فریدہ ہارنیم پر زور زور سے گارہی تھی اور یا سمین پھر کی طرح

ناچنے میں مشغول تھی! اختر آراہ اور روزی سیمل کے نیچے سلائی کر رہی تھیں! نجم آراہ گلاب خاص
نیچے "راج سنگھاسن" پر سے دلائی سمیٹ کر اٹھ رہی تھی۔ یاسمین ناچتے ناچتے جا کر اس
بیٹھ گئی۔ دیپالی کو دیکھ کر نجم آراہ نے آواز دی۔ "دیدئی۔ ادھر آؤ۔"

دیپالی اختر آراہ کو دھاگے دینے کے بعد جا کر شاہی تخت کے کنارے پرٹک گئی۔

"دیدئی ذرا سنبھل کر بیٹھنا۔ اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا ہے۔ یاسمین نے کہا۔

"اچھا۔" اس نے محسوس کی طرح ہنس کر جواب دیا۔

"آستینوں کی تریپائی! نجم آراہ نے اسے بروکیڈ کا ایک ادھ سلا بلاؤ نہ تھا دیا! اور خود

کر کے کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔

نزدیک ایک سیٹیل پائی پر فریدی پور سے آئی ہوئی ایک رشتہ دار لڑکی نے گلجی کریب ڈ

کا ایک ٹکڑا اچھا کر بلاؤ تراشنے کے لئے اسے ماینا شروع کیا۔ مالا ملازمہ اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گئی

باغ چادوں طرف ڈول سا رہا تھا۔ دیپالی نے بروکیڈ کے بلاؤز کی ایک آستین کا کنارہ مو

کھنپی۔ جیال آراہ باورچی خانہ سے لوٹ کر کب آئی! اور اس کے نزدیک بیٹھ کر کب سلائی کرنے لگی!

بھی نہ پلا۔ باغ بڑے سے جہان کی طرح ڈول رہا تھا۔

سیمل کے نیچے سے روزی اٹھ کر گلاب خاص کے نیچے "سنگھاسن" پر آن بیٹھی۔ یاسمین

بندریا کی طرح تخت کی پشت کے برابر اکڑوں بیٹھ کر جینکے میں بنی سوتیوں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔

سیمل پائی پر بیٹھی لڑکی نے دلہن کا بلاؤ تراشنا شروع کیا۔

"اللہ کرے اب جلدی سے جیال آراہ بی بی کے جوڑے بھی سلیں۔" قریب بیٹھی ملازمہ

ایک انگلی سے کپڑے کا کوناد بانے ہوئے کہا۔ جیال آراہ نے مرانقا کر غصے اور کرب سے اس

ڈالی اور اپنی سلائی پر جھبک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ جنہیں اس نے چپکے

اپنی ساری کے سرخ کنارے سے پونچھ لیا۔

دیپالی نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"اپنی شادی کے ذکر پر نہ جانے کیوں اس کا یہی رسی ایکشن ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میرے

بھی رونے لگی تھی۔ جانے کیا بات ہے۔ کبھی کبھ بتاتی بھی نہیں۔" روزی نے چپکے سے اس کے

لہا۔ دیوالی اپنے ہاتھوں کا برعشرہ چھپانے کے لئے ذرا دوسری طرف کو مڑ گئی۔ مگر اس طرف گلابی بی بی شین کے بھرے ٹکڑوں میں سے کھلنا میں بنی سیتل پانی پر چھپا ہوا گلدار ہرن آتے نکلنے لگا۔

فریدہ بار مومہ بند کر چکی تھی۔ باغ پر ایک دم بڑا سناٹا سا چھا گیا۔ ساری لڑکیاں سرے اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

چند منٹ بعد باتوئی اور بے چین یا سہین نے اس خاموشی کو توڑا۔ ”کیسا unny! تخت اس نے جھٹکے پر طبلہ بجاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔

”سنگھاسن تبتی۔!“ گھاس پر بیٹھی ملازمہ مالا نے کھیسیں نکال کر کہا۔

”کون چیز۔؟“ یا سہین نے پوچھا۔

”راجہ مکرم جیت کا سنگھاسن۔“ فریدہ نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

”ادہ۔“ یا سہین نے مورتیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے سر ملایا۔

سیتل پانی پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے بھی دفعتاً باتیں شروع کر دیں۔

”امی ایک جوڑا فرشی پانچا مے کا بھی رکھ رہی ہیں۔“ آخر آرار فریدہ سے کہہ رہی تھی۔

”ادھر ہندوستان میں تو صرف عزارہ ہی پہنا جاتا ہے۔ ابا بتارہ ہے تھے۔“ انجم آرار نے جو سے واپس آچکی تھی۔ گھاس پر دوڑا نو بیٹھے ہوئے کہا۔

”آپا کے پاس تو کئی فرشی پانچا مے ہیں۔“ ہن نا آرا۔؟ مگر آپا پہنتی ہی نہیں۔“ آخر آرار نے کہا۔

”اب بڑھاپے میں کیا خاک پہنوں گی۔“ جہاں آرار نے تلخی سے کہا۔

”اے لو۔ اور سنو۔“ فریدہ نے ذرا کھوکھلی آواز میں بڑا مانا۔

”یاد ہے ایک دفعہ آپا نے عید پر عزارہ پہنا تھا۔؟ جب ہم لوگ سب خالوجان کے ہاں گئے تھے۔“ آخر آرار نے انجم آرار سے کہا۔

اُس عید پر اس نے کلکتہ سے حسب معمول شرارتاً ایک سیدھا ہیات سا عید کار ڈبھیجا

پر ہلال، کھجور کے درخت ادا دانت کے منظر کے نیچے دو ہاتھ (ایک نسوانی ایک مردانہ)

ہے تھے اور برابر میں دو موٹے مسخرے نفیریاں بجا رہے تھے۔ کارڈ کی پشت پر اس نے اردو

میں ایک سخت بازاری شعر لکھا تھا۔ "عید کا دن ہے، پتہ نہیں کیا۔ مجھے مصروف یا دہنیں
گھٹے مل لو صاحب۔ رسم دنیا بھی ہے۔ موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔" اس کی اردو
رائٹنگ کتنی کچی اور بچکانہ تھی۔ جہاں آراہ ایک گھٹنے پر سر رکھ کر سلائی میں مصروف رہی۔
"چلو لڑکیو۔ دسترخوان لگ گیا۔" برآمدے میں سے ایک بوڑھی ملازمہ نے پکا
"آتے ہیں۔" آخر آراہ نے جواب دیا۔

روزی "سنگھاسن" سے اتر کر چیزیں سمیٹنے کے لئے سمیل کے نیچے چلی گئی۔
یا سمین ابھی تک سنگھاسن، تیسری کے تصور میں محو تھی۔ اس نے اچانک سراجھا کر جہاں
اور دیپالی کو مخاطب کیا۔

"اما۔ آیا۔ دیدی۔ تم دونوں اور میں اس تخت پر بیٹھے ہیں نا۔ تو یہ pretend
کرد کہ ہم تینوں پالیوں والی دوستیاں ہیں جو راجہ بھوج اس لائق نہ ہوگا ہم اسے اس تخت پر ف
بھی نہ رکھنے دیں گے۔"

"کیا دیوانی لڑکی ہے! جہاں آراہ نے ہنس کر کہا۔
دیپالی بلاؤ زختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب جہاں آراہ نے پہلی بار اس کی وحشت زد
شکل دیکھی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ "ارے دیپالی تمہیں کیا ہو گیا۔؟"
کچھ نہیں بھائی۔ میرے سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے۔" اس نے شدید آلتا ہٹ او
رکان کے ساتھ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔

"ارے تو اوپر جا کر ڈرائیٹ رہو۔ کھانا پھر کھا لینا۔"
"نہیں۔ میں اب گھر جاؤں گی۔"
"ابھی سے؟ تمہیں ہو کیا رہا ہے بیٹھے بھلے؟"

"جہاں آراہ" دیپالی کی آواز میں التجا تھی۔ "مجھے اب گھر جانے دو۔ اتوار کو لوہ پورہ
جانا ہے۔ اس کے لئے پینگ بھی۔" وہ بات پوری کئے بغیر تھک کر چپ ہو گئی۔
"ایک تو اتنے دنوں بعد آئیں۔ ساری چھٹیاں جانے کہاں کہاں سیر سہائے کرتی پھریں

اب بھائی جا رہی ہو۔ یہ کیا دھاندلی ہے۔ اطمینان سے بیٹھ کر آج گپ بھی نہیں ہو سکی۔" جہاں آ

دیپالی پر دوبارہ نظر ڈالی۔ "تم واقعی بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ چلو جلدی سے چل کر کھانا
لو۔ پھر چلی جانا۔ مالا۔" اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ "ڈرائیور سے کہو۔ موٹر ادھر لاکر لگا دو۔
لی بی بی کی جلدی گھر جانا ہے۔ آؤ۔" اس نے دیپالی سے کہا۔

باقی لڑکیاں کام سمیٹ کر کوٹھی کے پچھلے دالان تک پہنچ چکی تھیں۔ بوند باندی شروع ہو گئی
کے پہلے قطرے تالاب کی سطح پر نچتے تھے مے بھنور بنا رہے تھے۔

ردزی بھاگی ہوئی دیپالی کے پاس آئی۔ "کیا ہوا۔ کیا ہوا جہاں آ رہی؟"
"کچھ بھی تو نہیں۔" دیپالی نے ذرا دشتی سے کہا۔ یہ میں کیا اپنا تماشہ بنا رہی ہوں اس نے
یہ کہا اور "راج سنگھاسن" سے آڑی۔ چلو دیپالی اٹھو۔ اُس نے حسبِ عادت خود کو
مب کیا۔ اور پھر لٹو پور پہنچا ہے۔ چلو دیپالی سرکار دردمسرا قدم آگے بڑھاؤ۔
وہ جہاں آ رہی اور ردزی کے ساتھ کوٹھی کی سمت روانہ ہو گئی۔

۱۷ گوڑ ملہار

جل بھٹل۔ نجر۔ تال۔ بن۔ آپ بن۔ ندی۔ نالے۔ گری۔ گولہ۔ سب ہی کچھ۔ سارا بنگال دیر
رت میں، ایک سیکڑا دریا بن چکا ہے۔ شہر کی گلیوں میں نوکائیں چل رہی ہیں۔ کالے ہاروں کے
فانی ندیاں بہتی ہیں۔ کائنات پھیل کر وسیع تر ہو گئی۔ فصلیں بونے اور ہالیدگی اور مجید اور شادابی
م۔ پٹ سن کٹنے والا ہے۔ تنکے کی نوکیلی چھبے دار ٹوپیاں اوڑھے کسان کھیتوں میں دھان بو
پن۔ محلوں دو محلوں، مکانوں اور جھونپڑوں میں ڈھوک بک رہی ہے۔ آبی راستوں کے چوڑے مکھے
جال پر بارا تیر روال ہیں۔ بانسریاں جتی ہیں۔ امراد کی دہنوں کی پالکیاں کشتیوں اور اسیٹوں
عائی جارہی ہیں۔ غریب بارتی شکستہ چھڑیاں لگائے گاتے بجاتے شہنائوں میں لہرے ایک گاؤں سے
بے گاؤں جا رہے۔ برکھائت، شادلیوں کی رت ہے۔ ہر برسات کی مانند اس برس بھی کتے بندھن
۔ ان سب دہنوں کی قسمتوں میں کیا لکھا ہے۔؟

گھر کی لکٹھی، ہزار برس کی نیو بہوؤں نے سندھیا کا اپنے اپنے آنکھوں میں لکٹھی کی اقدار کے گٹلوں کے سامنے چراغ جلا دیئے۔

پچھلی صدیوں کی وہ سدا سبھا گئیں جو زبردستی سی ہونے چلیں اور اپنے گھروں کے دروازے پر دیت کے مطابق لاکھ کے رنگ میں ڈبو کر اپنے داہنے ہاتھ کا نشان لگاتی گئیں۔ اندھیرے جنگل میں، دور افتادہ گاؤں میں پرانے بوسیدہ مکانوں کے دروازوں کی چوکھٹوں پر ان کے چھو سے نیچے کے سرخ نشان ٹھٹھا رہے ہیں ستاریک نبوں میں ان بے چاری سی سادہ تر لوگوں کی سما کے گول، نیچے لہڑاہ نیز گنبد، بارش میں بھٹکتے ہیں۔

شعرا کی موضوع سخن، افسانہ نگاروں کی ہیروئن۔ جذباتی چیز کاروں کی تصویر۔ بنگال کی عورت۔ سدا دکھ سہنے والی۔ صابر و شاکر۔ بے چاری۔

سیندور اور ہندی کی سُرخ۔ لاکھ کے رنگ کی سُرخ۔

بونددوں کی لڑیاں۔ زندگی۔ موت۔ زندگی کی پھول مالا گوندتی جا رہی ہیں۔

جب بارش تھمتی ہے تو بادلوں کے ادے شامیلانے کے نیچے مورنا چنا شروع کر دیتے ہیں کنبوں میں جو تھیکا کھلی ہے۔ بنوں میں سال کے پھول مہک اٹھے۔ بھگی، گھٹپ، اندھیری رات یا جنگو چمک رہے ہیں۔ جن کی روشنی میں کبوں نے کہا۔ ابھی ساریکا۔ اپنے محبوب سے ملنے جاتی ندی کنارے بید کے پھول کھٹے ہیں۔ ہرے اور سیاہ پروں والی مرغابیاں چلا رہی ہیں۔ ہر درختوں کے نیچے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ چھتر ٹپکنے لگے۔

بلودے بڑھ رہے ہیں۔ کھیت لہلہا اٹھے۔ بانس کے سرسراتے جھنڈ میں ہاتھی بارش سے بچنے کے لیے کھڑے کان پھٹھا رہے ہیں۔ بلکے بھلیوں کے تعاقب میں ہیں جن سے تال اور ندیاں لبریز ہو گئیں۔ پر وہابی میں کیستی مہک رہی ہے۔ بانس کے جھرمٹ میں سانپ سوتا ہے۔

ندی پر سے بارات آ رہی ہے۔ بارات آنکھن کے دو اور پڑا تو گی۔ تلسی کے سامنے چہرا زجل رہا ہے۔

یکس کا گھر ہے اور دو لہا کون ہے؟ اور کہاں ہے؟ کس کی دلہن ہے جو اٹاری پر لہاں بکھرائے پریشان سوتی ہے۔؟

۱۸ میگھ رختی راگنی

آدھی رات کے بعد بارش تھمی۔ سیمل کے خنک پتوں میں سے ٹپ ٹپ کرتی بوندیں باغ کی
رہی تھی پرگرتی رہیں۔ مینڈکوں کا شور ایک دم تیز ہو گیا۔ محل میں روشنیاں جل اٹھیں گہما
سی مذاق۔ شور۔ قذوں کی چاپ۔

دوسری منزل کی طویل گیلری میں سے گزرتی انجم آرا لہک لہک کر ٹنگور کا گیت الاپ رہی ہے۔
استھولے جوئے نبھواستھولے بنے آب سے ندی نادرے۔ گری گویا رابا رے
آشاڑھے نوبو آندوا نشبو نوبو۔

اتی گبھیرانی گبھیر نیل ادمبرے ڈمرو بلجے
وہ بے چینی سے سہری پر کروٹ بدلتی ہے۔ شکر کی ناچے۔ شکر کی ناچے۔ میں ملا رگیت گا ہی
ہمارا تے۔ آواز ڈور چلی جاتی ہے۔

لیکن سینے میں گیت جاری ہے۔

کورے گر جن نیر تھنی سگھنے۔ اٹھے روبر بھیر تانے بتانے

سینے میں وہ گارہ ہے

جبکہ وہ بال بھرائے برجی نقش و نگار کے چھ کھٹ پر بے چینی سے سوتی ہے۔ وہ سیمل کے نیچے
کے شکستہ سنگھاسن کے کنارے کھڑا گائے جارہا ہے۔ وکر ماتہ کے زرد عقیق کے تخت میں سے
سبز شاعریں چلوٹ رہی ہیں۔ انصاف کا تخت ایک دم جگمگانے لگا۔ وہ گارہ ہے۔

دیکھ دیکھ کنو بانی نوبو نوبو کتو بھاشا۔ جمور و جمور و روشو و ہارا۔

جمورو۔ جمورو۔ اتنی کتی ہیں۔ مالائستی ہے۔ سیمل کے سفید اور زرد پھولوں میں بجز
لی طاقتیں پوشیدہ ہیں۔ جاوٹوں نے۔ مجھے۔

”بی بی۔ بی بی۔ اٹھیے۔ وہ آگئے۔“

وہ ایک دم چونک کر بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔

الاسمہری پر بھی اسے جگا رہی ہے۔ چھت کا برقی پنکھا تیزی سے گھوم رہا ہے۔ کھٹے ہو
دریوں اور دردنازل میں گمازہ، سہانی، ہوا اندر آرہی ہے۔

چنبیلی کے پھولوں کی اور برسات کی رات کی ہنک۔

”کون آئے۔؟ کون۔؟“ اُس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا ہے۔ رنگ سفید پر لکیر

پاؤں میں سنسنی۔

”بی بی۔“ ملامر نے ریشمی جھار وار لمبپ کا سوچ دبا کر اطمینان سے کھیسیں نکالتے ہو

جواب دیتی ہے۔ ”اجی وہی سب۔ سگنی بکچھے والے۔ دوئی ٹھو موٹر بھر کر۔ دینا چلو چلے خاطر

سب جنے تیار میں۔ چہا ج ٹھیک سات بجے چھوٹے گا۔ آپ ابھی تک سو رہی ہیں۔ یہ اندھی

”اوہ۔۔۔“ وہ بال سمیٹ کر آنکھیں موند لیتی ہے۔ میرے خوابوں سے تمہارے خوابوں

اب قیامت تک کا فاصلہ ہے۔ اچھا بھائی۔ جو تمہاری مرضی۔

”جلدی کرئیے بی بی۔“

”اچھا۔ اچھا۔“

ملا بڑی مصروفیت سے دردناکے کا پردہ اٹھا کر باہر نکل جاتی ہے۔

وہ مسہری سے اتر کر منگے پاؤں بڑے دریچے میں جاتی ہے نیچے باغ پر گہرے بادل

کھڑے ہیں۔ یہ برسات بھی گورنے والی ہے۔ گزر جائے گی۔

بیلی چسکی ہے۔

ان مادی سودا منی روٹنگ بھرے زرتیر کو رے۔۔۔ او برتے۔۔۔ انجم آرا کی رے

آوازاں بچی منزل سے آرہی ہے۔ فریوہ اور دوسری لڑکیوں کے تھپتھے۔

وہ آگئے۔۔۔ وہ چند لمحوں قبل کی اپنی حماقت پر تلخی سے مسکراتی ہے۔ اتنے برس۔ اتنے انا

لٹے خزانے، اتنے بھادرو، اتنے موسم نکل گئے۔ وہ اب کبھی نہیں آئیں گے۔ اب کیا آئیں گے۔

دریچے سے ہٹ کر وہ غسلی نے میں جاتی ہے۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مار کر واپس

ہے۔ الماری کی طرف بڑھتی ہے۔ الماری کے تمام آئینے میں اپنے بھیگے ہوئے چہرے کا عکس دیکھتی ہے۔ یہ میں ہوں۔

وہ الماری کا پٹ کھولتی ہے۔ مرشد آبادی ریشم کی ایک بیش قیمت گلانی ساڑھی نکال کر باندھتی ہے۔ پھر وہ سوئیگ باکس کھولتی ہے۔ (یہ سوئیگ باکس اسے دن میں کتنی بار کھولنا بند کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو لولہ کی طرح مضبوط بنا لیا ہے) اس میں سے وہ برما کے گلانی موتیوں کا ہارا اٹھالتی ہے۔ جو شاہسہا نے امی کے سیف میں سے نکلوا یا تھا۔ تصویر کو اس نے مختلف چیزوں کے نیچے اچھی طرح چھپا کر رکھا ہے۔ برسوں سے وہ تصویر اسی طرح بید کی اس ہندوئی کی تہ میں رکھی ہے۔ اتنی مدتوں بعد بھی اسے یقین ہے کہ اگر اس پر اس کی نظر پڑے گی تو اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔

وہ بال گوندھ کر اپنے ہن کر کرے سے مسکراتی ہوئی نکلتی ہے اور نیچے تہیوں اور شادمانیوں کی دنیا میں شامل ہونے کے لئے اپنے ہندی لگے ہاتھ کو جنگلے پر لکانی ہوئی میٹر میاں اتارنے لگتی ہے۔

آٹاڑھے نوبو آندو آتنبو نوبو۔

میری ہر لحظہ، ہر آن جلتی ہوئی چتا اس نے دیکھی ہے؛

نواب قمر الزماں جو دھری کی بڑی صاحبزادی جہاں آواز بیچیم۔

نیچے برساتی میں سترہ سالہ ریاسین مجیدہ خوش اور بنشاش، جارجت کی ہری، اور دل چیزی، ساری پیٹے، دو چوٹیاں گوندھے، زبور پیٹے، موٹر سے اتری ہے اور بآدے میں کھڑی فریدہ اور خیر آباد کے ساتھ قہقہے لگا لگا کر نیر الزماں کو تنگ کر رہی ہے۔ خوش اور بنشاش۔

اُس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؛

ادوہ اجنبی، بھولی لڑکی، جوان پرتشور، دریاؤں، طوفانی راستوں کے اس پار، دینلچ پور کے ایک دور افتادہ گاؤں میں اجنبیوں کے اس قافلے ایک اجنبی انسان کی آمد کی منتظر ہے۔ اس کی

میں کیا لکھا ہے۔

دھان کے پودوں کی آواز سنو۔ جو ہرے سنائے میں آہستہ آہستہ بڑھ رہے ہیں۔

۱۹

بھیرنی کا خواب

کس کی دلہن ہے یہ، بیکراں، بھیانک رات نے پوچھا۔ جو بھیرنی کی طرح بال بکھرائے، پریشان سوتی ہے؟

بلندوں کی نظریاں سرسری سدن کے باغ پر ٹپ ٹپ گرتی سُرخ مٹی میں جذب ہو گئیں۔ عمارت کے ایک کمرے میں، کھڑک کے نیچے، پلنگ پر مدہ بے حسنی سے گروت بدلتی ہے۔ سارا باغ جگنوؤں سے جگمگا رہا ہے۔ وہ بھوج پتروں کے ڈھیر پر چڑھی تھھی ہے۔ میں جگنوؤں کی روشنی میں زعفران سے تمہیں ڈھکے کھوں گی، اور پون دوت کے ذریعے بھجواؤں گی۔ جس طرح ہم اپنے الفاظ ہوا کے حوالے کرتے ہیں۔ اگر بولیں تو کی ہو۔ جگنو اور بھوج پتر اچانک غائب ہو گئے۔ گور کھاٹی کا میڑھی میڑھی شانوں والا خونک درخت اس کے سر پر چھوے جا رہا ہے۔ بھوانی کا لوڑھا مندر جڑ سے اکھڑ گیا۔ اس سال بڑا بھاری سا بیٹلون آیا تھا بھائی۔ کتب خانے میں دروازے نہیں ہیں۔ صرف دیواریں۔ صرف دیواریں۔ کوئی راستہ نکلنے کا نہیں۔ کھڑکھڑکھڑ۔ بھوج پتروں کے نیچے سے وہ نمودار ہوتا ہے۔ بڑی چالاک سے، چوہے کی طرح چھناوہ ماسنے آگیا۔ بھگتو۔ سر مڑا۔ عینک لگائے۔ کھڑاؤں پہنے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔ کھیسین نکال کر وہ ایک بھوج پتر اس کے حوالے کر دیتا ہے۔

(یہ بھگتو چائنا بھون میں پڑھا تھا ہے) وہ غور سے پڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڑی عجیب زبان ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ فائنل امتحان اسی زبان میں ہو گا۔ بجلی کرکی۔

بھگتو بھی غائب۔ وہ چائنا بھون کے برآمدے میں کان لگا کر سن رہی ہے۔ "میری آواز تمہاری کرک۔ میرے آنسو تمہاری مسلسل جھڑی۔ میرے من کی آگ تمہاری بجلی۔ میرے دل میں ماس کا چہرہ ہے اور تمہاری آغوش میں چاند۔ میں اور تم یکساں ہیں۔ بھائی بادل۔ پھر مجھے کیوں تنگ کرتے ہو۔"

بڑا مدھم، سہانا اجالسا رے میں پھیل گیا۔ پھول بن میں چمپک کے شگونیوں کا چرانا سا نور ہا ہے۔ ندی کے کنارے کنارے چلتا رہتا رہتا خرابیاں اس کی سمت آ رہی ہیں۔

وہ چکروں کا محبوب لمبے بالوں، کالی آنکھوں والا، ہاتھ میں کنول سنبھالے، انگلیوں سے امرت گراتا۔ اولوکتیشور۔ پدم پانی۔

وہ کلا بھون کے باغ میں موجود ہے۔ مسرور۔ محفوظ۔ مندلاں بوس۔ برآمدے میں سکی ٹوپی اوڑھے نقرائی سچپان گڑ گڑا رہے ہیں۔ ہر طرف تصویریں ہی تصویریں۔ جو ان گھاس پر چلتا اشوک کے پھولوں کا تاج پہنے وہ اس کی جانب آ رہے ہیں۔ لوگ تاتھ۔ لوکتیشور

وہ خوشی سے کھل کھلا کر ہنستی ہے۔ وہ پین کی طرح منہ اٹھا کر بانسری بجاتا ہے۔ وہ چاندی سے بنا۔ سیاہ بادلوں سے نکلتا سورج۔ ایتا بھ۔ منجھتری

سیکراں نور۔ سیکراں رحم۔ سیکراں محبت۔

بالکل قریب آ کر اس نے سینک اتاری اور گھور کر اُسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر آنکھیں ہی نہیں تھیں۔ آنکھ۔ ناک۔ منہ۔ کچھ بھی نہیں۔ خالی چہرہ۔ بالکل خالی چہرہ۔ انڈے جیسا۔ اس چہرے جیسا چاہو بنا لو۔ بھکشو نے غرا کر کہا۔ وہ دہل کر چینی۔

یہ لو۔ بھکشو نے کہا۔ اور خالی ہاتھ اس کی طرف بڑا دیا۔

یہ کیا ہے؟

دودھ کا گلاس۔ جاؤ جا کر پرستش کرو کیسی کیونست ہم مدد تو۔ پوجا پاٹ نہیں کرتیں

ہیں مٹی تم کیونست تو نہیں ہو گئیں؟

کس کی پرستش؟

اپنی۔ ہم سب اپنی اپنی پرستش کرتے ہیں۔

مگر آج تو ناگ پنچی ہے۔

ہاں۔

کون سی؟ کس صدی کی ناگ پنچی۔؟

ازل سے ابد تک۔ محض ایک لمحہ۔ وہ اٹھ اٹھا کر مسخروں کی طرح ناچنا شروع کر دیتا ہے

خوب زور سے نکرا رہا ہے۔ مائی نیم برس بہری متی۔ سارے کپالی کھوپڑیوں کی مالائیں پہنے، ترنگے، ہرے اور لال پھریرے اڑاتے، گھنٹیاں بجاتے، اندر گراؤنڈ مٹھ میں اتر گئے۔ تمہ نے آندڑ مٹھ پڑھا ہے؛ ترکی ٹوپی والا جو کر۔۔

چلتی چلتی وہ دریا پار آگئی۔ سامنے سُرخ لہروں پر بہری ناؤ بنا بتوار ہے جاتی ہے۔ ناؤ پر مگریزی میں لکھا ہے۔ "ایس۔ ایس۔ علاول"۔ بھئی واہ۔ ناؤ پیسے جا رہی ہے۔ بے آواز منظر میں سے ساؤنڈ غائب۔ بھیانگ۔ وہ خود کشتی میں بیٹھی ہے۔ اچانک دھماکہ۔ اب دنگ میں سے لائن شاہ قاتا، ہوا نمودار ہوتا ہے۔ لائن شاہ جادوگر۔ سینکڑوں برس ہوئے مر گیا۔ پھر بھی گار رہا ہے۔ دھندلی نکل۔ ہیولا۔ کتنا ہی غوسے دیکھو۔ صاف نظر نہیں آئے گا۔ میں عشق ہوں۔ ناقابل فہم۔ غیر مرئی۔ لُرفت سے باہر۔ لائن شاہ ڈائیسلاگ لول رہا ہے۔ اس کے دھواں ایسے ماتھ میں کدَم کا پتہ ہے۔۔ ل کی شکل والا کدَم کا پتہ۔ کیا گاتا ہے۔ لائن شاہ کہ میرے پاس شیشے کا ایک گھر ہے۔ اس میں میرا بڑوسی رہتا ہے۔ اسے میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میرے ادرا اس کے درمیان گہا دریا حاصل ہے۔ اس دریا کو کیسے پا کر دوں۔ کاش وہ خود ہی میرے پاس آجائے۔

اوجھاتی رہے۔

اب وہ دوسری طرف کروٹ بدلتی ہے۔ سامنے گھڑیاں ہی گھڑیاں۔ گھڑیا لوں کی فوج یہ گھڑیاں اپشت پر ایک ایک سیلولوئیڈ کا کام دیو۔ سوار ہے۔ جا پانی کام دیو۔ بوگس۔ تاریک طویل رنگ برنگی ٹرنگ۔ اندھکار۔ سمہر۔ میں اس دریا میں ڈوب جاؤں تو مجھے جسٹ بلا صی دینا۔ ہے بن مانی۔

بتوار بغیر ناؤ کے بہے گی۔ ناؤ بغیر ندی کے رواں ہے۔ چراغ بتا لو کے روشن ہے۔ لوہنا راز کے جل رہی ہے۔

جنگل کا جنگل چل رہا ہے۔ ندی کے ماشد بہتا ہے۔ اور ندی ساکت ہے اور انسان درختوں اطرح جھے کھڑے ہیں

ہاتھی۔ سیاہ ہاتھیوں کی قطار۔ مٹی کا کلام ہتھی، سُرخ تالاب کے کنارے کھڑا احمقوں کی طرح
کان ہلارہا ہے۔ دھماکہ۔ ونگ میں چھپا لائن شاہ پھنس پھنسی آواز میں اگاتے گاتے اس کا گلاب بیٹھ گیا کہتا
ہے۔ جہاں آواز آدھی رات کو اسی تالاب میں ڈوب کر مر گئی۔ اب لائن شاہ انگریزی میں اناؤنس کر رہا ہے۔
نواب زادی جہاں آواز بیگم کو قتل کر دیا گیا۔ مرڈران کو لٹہ پلٹہ۔ زندہ ہے مگر جیتے جی مر گئی۔ ایک اور
دھماکہ۔ رعد کی کڑک۔

وہ بڑا بڑا کراٹھ بیٹھی۔ باہر زرد سے سجلی چمکی۔ بادل گرج رہے تھے۔ اُس کا دل بُری طرح دھتکت
رہا تھا۔ اُس نے پشیمانی پر ہنڈھ پھیرا۔ دہشت سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ اس کی رُوم میٹ ابائی
دوسری کھڑکی کے نیچے اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ وہ چند منٹ تک ساکت و سامت بیٹھی رہی
باہر تاریک آسمان پر بادل پھٹے اور چاند کی جھلک دکھائی دی۔ پھر چاند کھڑکی میں سے اس طرح جھانکنے
اگا۔ جیسے بادلوں میں سے پھسل کر کرے میں آن کرے گا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید چاند مجھے کوئی
جواب دے۔ رات کوئی فیصلہ سنائے۔ اس نے رات کی گرج بار سمفنی پر کان لگا دیئے۔ نہیں۔ اس
نے پلکیں جھپکائیں۔ نہیں۔ میں اپنے جسم، اپنے دماغ، اپنے پریشانی خوابوں میں مقید ہوں۔

ردائی کے وقت اُس نے باگھیراٹ پر کہا تھا۔ شوکتی۔ تم کیسے میں زندگی سے ڈرنا ہو گریز نہیں۔
شوکتی۔ یاد رکھو۔ مرد موت کا مقابلہ موت سے۔ مگر عورت موت کا مقابلہ زندگی سے کرتی ہے۔

۱۶۱۔ وہ دل میں شدید تلخی سے منہی۔ اور پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی اپنے اپنے پاؤں کے
انگوٹھے کو غور سے دیکھی کی۔ زندگی! اس نے سوچا۔ زندگی! تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟

وہ صبح دھماکے سے شامی نکیتن واپس پہنچی ہے سوچتے سوچتے اس کا دماغ ماؤن ہو چکا ہے۔
رات کو اسے جیسا تک سینے دکھائی دیتے ہیں۔ دن میں وہ گم سم رہتی ہے۔ ایسا میرے ساتھ کیوں ہوا؟
چار سو میں۔ دھتوکے باز۔ ٹھگ۔

میری بڑی خوفناک غلطی یہ تھی۔ اس نے بالی سمیٹے ہوئے خود سے کہا کہ تو می ادرین ملا تو می جیو
جہد کو نظر انداز کر کے میں ایک ذاتی جہز باقی جھمیٹے میں پڑ گئی۔

شرمنگ۔ افسوسناک۔ اس نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھیں اور وہ بے پاؤں لٹھی
کھڑکی میں رکھی صراحی میں سے پانی اٹیل کر پیا۔ نکلا اس صراحی پر واپس رکھ کر باہر جھانکا۔ چاند بادلوں

میں کہیں بہہ چکا تھا۔

ساری عمر بات نہیں کروں گی۔ پہچان کے نہیں دوں گی۔ دھوکے باز۔
دھوکے باز۔ باغ بہت سنسان ہے۔ رات چیتے کی آنکھ کی طرح مجھے گھور رہی ہے۔ عمر
عمر بات نہیں کریں گی۔ ارے آپ کی اسلیٹ تو مجھے اب معلوم ہوئی بچہ جی۔ گردک۔

برآمدے میں مدھم بلب روشن تھا۔ مرے ہوئے برساتی پتنگوں کا مختصر سا ڈھیر بلب کے سین نیچے
فرش پر پڑا تھا برآمدے کے باہر کمرشہن چوڑا کی ڈالیاں ٹھنڈی ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ مینڈک خاموش
ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی جھینگرہ چلا اٹھتا۔

اسے ایک دم سردی سی لگی۔ وہ کھڑکی میں سے مہٹ آئی۔ نیم تاریکی میں ہاتھ بڑھا کر سر ہانے کی ریز
پر رکھا ہوا اٹھٹی کیس کھولا اور ٹٹول ٹٹول کر ایک مٹی کا ہاتھ نکالا۔

ہاتھ نکلنے پر رکھ کر اسے بڑی بہادری اور دھمیان سے دیکھنے لگی۔ چھوٹا سا
بے چارہ مسخرا مسخرا اور زرد نقش و نگار والا مٹی کا ہاتھ۔

ابوالقاسم کی آمد کے بعد وہ مولوی ابوالہاشم کے کہے پر کیا محبت پرٹ کشتی سے اتر آئی تھی اور وہ
ایک ایک بات بڑی تفصیل سے یاد ہے۔ ایک ایک بات۔ اس رات وہ اور ریحان ٹہلے ہوئے ایک
بستی کی طرف گئے تھے تو وہاں۔ وہاں کھاری دوکان پر مٹی کے کھلونوں کی قطار میں سجایا ہوا نئی کتنا
لیوٹ لگا تھا۔ وہ کھٹکھٹ کر اسے دیکھنے لگی۔ تو ریحان نے خرید کر اسے دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
جب تم بہت دکھی ہو اسے اردین کے چراغ کی طرح گھسنا۔ میں فوراً اجاڑوں گا۔ سنبھال کر رکھنا اسے تہہ سکر
لی طرح۔

اور ریحان نے کہا تھا۔ عاشق۔ بچے۔ وحشی۔ یہ سب فطرت سے بے حد قریب ہوتے ہیں اور تصنع اور
ہذب ریاکاری کے پردوں میں اپنے اصل جذبات نہیں چھپا سکتے۔ اور ان سب کو ٹوٹم، منتروں اور
خویروں کی ضرورت بھی رہتی ہے۔ بچے اپنا پسندیدہ کھلونا سر ہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ وحشی تعویذ
پہنتے ہیں۔ عاشق بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتے ہیں۔ پرانے خطوط، پرانی تصویریں، نشانیاں
ادکاریں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم اور تعویذ ہیں۔

بڈا شوکتی! مولوی صاحب کے جبونیڑے کی طرف آتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ تم ایک چھوٹی

کئی تھی ہو۔ تمہیں حفاظت کی ضرورت ہے، میں تمہارا تعویذ ہوں، جو تمہیں ہر خطرے پر دکھ سے بچائے گا۔
میں کہ ایک کپڑا کی سیراگی ہوں، قوم کو مایا جال سے نکلانے کے نئے تپ کرنے والا مٹھ دھاری گوسا میں
تم میری شوکتی ہو۔

ہر علامت۔ ہر تصور بے حد با معنی ہے۔ پیاری بچی۔۔ بچہ اس لے بڑی گمبیرا آواز میں کہا تھا۔
تمہارا یہاں آنا بے حد خطرناک بات تھی۔ مگر میں نے مجرا بے احتیاطی سے کام لے کر تم کو یہاں بلا دیا۔ کیونکہ مجھے
محسوس ہوا تھا کہ میں نے اگر تم کو جلد از جلد نہ دیکھا تو واقعی میں مرجاؤں گا۔ تم میرے اس جرم کا باعث ہو
لیکن چونکہ تم میرا ظلم ہو۔ اس لئے مجھے معلوم ہے کہ کوئی نصیبت نہیں آئے گی
شاید میں بے حد کمزور انسان ہوں۔

بے احتیاطی۔۔ ہا اس نے دفعتاً بے انتہا سرا سیم ہو کر پوچھا تھا۔
ہاں۔ کچھ عرصہ سے بڑی ناش غلیظوں کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر جب پہلے روز تم آوا
سے دو ڈیٹنڈ میں ملیں تو ان کو تمہیں ہرگز یہ نہ بتانا چاہئے تھا کہ نور الرحمن میاں دراصل میں ہی تہ۔ اگر تم کو
پکڑ کر ایذا پہنچائی جاتی اور۔۔

ادہ نو۔۔ اس نے دہل کر کہا۔
تم صرف سر بند راو را دہلی سے واقف ہو اور وہ بھی کچھ نہیں جانتے۔ او مارے بھی کچھ نہیں جانتیں۔
دفعتاً وہ اس بے حد خوفناک نظر آیا۔ را کھشش۔ پاتا مال میں رہنے والا ناگ دیوتا۔ را سپوٹین کا
ایسا جادو گر۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ اندھیرے سندھ بن میں مہذب دنیا سے سینکڑوں میل دور اس
پراسرار اجنبی کے ساتھ موجود تھی۔ نوعمری میں انسان ایسا DARE DEVIL کیوں ہو جاتا ہے۔ اب کیا ہو گا؟
پولس اور تھرڈ ڈگری۔

اچانک وہ ہنسا۔ اور کہنے لگا۔ چنانچہ شوکتی۔۔ میں تم کو میرے جواہرات تو تحفے میں اور نشانی کے
طور پر دے نہیں سکتی تم مٹی کے اس حقیر کھلونے کو ہی احتیاط سے رکھنا۔ یہ تم کو ہر آفت سے بچائے گا۔
دیپاتی ہنسی کو نکلتی رہی۔ پرانے خط۔ تصویریں۔ نشانیاں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹے ہیں۔ اس نے غم
غصے سے ریحان کے الفاظ دل میں دہرائے۔ بید کی ایک سندھ فچی میں رکھی ہوئی ایک پرانی تصویر میں ٹوٹے ہیں
تم اسے بھول گئے۔

جہاں آرا۔ میری سکھی۔ میری بہن۔ میں نے تجھ سے تیرا آدمی چھینا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔
 آیا۔ اب نہیں چھینوں گی۔ واپس کر دوں گی۔ مجھے معاف کر دینا۔ اس انجانی غلطی کو معاف کر دینا آیا
 ”ارے دیپاتی۔“ ابانی نے غصے سے کہا ”تم تو بالکل کسی بھرتی کی ایسی ہوتی معلوم ہو رہی ہو۔“
 وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا چہرہ اور تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔
 ”سب خیریت ہے ابانی۔“ اس نے جلدی جلدی آنسو پونچھ کر ناک سنکنے اور بال سمیٹتے ہوئے
 آہستہ سے جواب دیا۔ دروازے کے جھک کر سنگھار میز کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ بھرتی۔ ابال بکھرائے فیہ
 کی جوگن۔!! ”ہر علامت ہر امیجری بے حد با معنی ہے۔ پیاری پتی۔“ کپالی بیراگنی کا بچہ۔ ڈیم
 — ڈیم — ڈیم —
 اس نے پلنگ سے پاؤں اتار کر چلتیں اپنی طرف سرکائیں۔

زندگی کی ہر نئی صبح آفاقی رات کے اٹھاہ سمندہ کے کنارے ایک نیا اجنبی ساحل ہے۔ جس پر ہم اپنے
 خوشگوار یا اذیت دہ خوابوں کی کشتی سے مسرور یا مغموم، لبشاس یا خوفزدہ، اترتے ہیں۔
 نیند کی نوکارات کے دریا پر ساری زندگی بہتی رہتی ہے۔ ہم اپنی عمر عزیز کے کئی برس بغیر تپواری اس
 نوکامیں گزار دیتے ہیں۔ عمر رواں کی ہر نئی صبح جب ہم جاگتے ہیں۔ ہمارے خوابوں کی نوکامیں دم غائب ہو جاتی
 ہے اور دوسری رات تک کے لئے ہماری منتظر جا کر پھر اپنے ساحل سے لگ جاتی ہے۔ نیند کی پرسکون
 طوفانی پلدا پر خوابیدہ انسانوں کے سینوں کی ان گنت نوکامیں رواں ہیں۔ ایک دوسرے کے پاس سے گزرتی
 جاتی ہیں۔ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ڈوب جاتی ہیں یا کبھی کبھی دو نوکامیں اکٹھی گھاٹ کی سمت بڑھتی ہیں
 مقدور کی زمینت بی بی اپنے کالے سوکھے مضبوط ہاتھوں میں سرخ ساری کا بندل سنبھالے دلہن کی منتظر

چلتیں پیروں میں ڈال کر اس نے اپنی رسمٹ واپچ اٹھانے کے لئے تکیہ سرکایا اور تب اس کی نظر
 متقی کے ہاتھی پر پڑی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ ہاتھی کو اٹھا کر کھڑکی میں گئی چند محظوظ تک ٹھٹھکی رہی
 ایک دم بڑے زور سے اُسے باہر بھینک دیا۔ پل کے پل میں وہ بے جا کھڑکی کے نیچے اُٹی ہوتی برساتا لگا۔

میں قائب ہو گیا۔ ہاتھی ڈبا دکھا س۔ اس نے مسکرا کر دل میں کہا اور باہیں پھیلا میں۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں ہر جادو ٹوٹنے۔ ٹوٹم، ٹوٹھکے، تعویذ اور طلسم کے اثر سے مطلق آزاد ہوں۔ ہڑتے۔ خود کو بے حد بٹکا پھٹکا محسوس کرنے کی سعی کرتی ہوئی وہ برآمدے میں چلی گئی۔

۲۰

ہرے بنگال کا آئندگان

پاٹ کے پیلے پھول مرجھانے لگے۔ کھیتوں میں درانتیاں چل رہی ہیں۔ گتھے پانی میں ڈبو دیئے گئے مگر کھپانی میں کھڑے کسان ریشہ علیحدہ مکر نے میں جٹے ہیں۔ یہ ریشہ دھویا اور سکھا یا جائے گا۔ جھونپڑے میں چرخے اور کر گئے چلیں گے۔

بنگال کے کسان نے اس ریشے کی خاطر سال بھر اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ بارش میں بھیگ کر دھوپ میں جل کر وہ شاندار فصل تیار کیا ہے۔ کچھڑ اور بدلو کے سمندر میں ڈوب کر سونا نکالا ہے۔ اب یہ "طلاتی ریشہ" کارگو کے سبب فولادی جہازوں پر لڑ کر طویل دو یا ڈی پر سے گزرنا جوٹ اسٹیشنوں پر پہنچے گا۔ چاند پورا اور مدار کی پورا اور نرائن گنج میں اتارا جائے گا۔ کلکتے کے تاریک کنارے اور اسکاٹ لینڈ کے جگمگاتے بیگ۔ بنگال کے اس سہرے دھن کی منزل ہیں۔

پاٹ کے سڑتے سڑتے برکھادت بھی بیت چلی۔ گھاٹ اور کلیاں دو تارے کی جھنکار سے گونج رہی ہیں۔ سارے میں دھان کے لہر سبز پودے لہہاتے ہیں۔ چوپال میں شہدی گان کی مٹھائیں ہیں۔ شیخ مدن بادل اور درگانی فقیر اور لگلا کئی۔ گاؤں کے نت نئے مندر سے گھول اور کبوتر کی آواز بلند ہوئی۔ راوہا کرشنا۔ راوہا کرشنا۔ راوہا کرشنا۔ راوہا کرشنا۔

چنڈی داس کی راوہا۔ راہ پر شاد کی کالی۔ درگانی فقیر سکاٹ۔ لٹڈوس، لٹڈوس، لٹڈوس، لٹڈوس۔ بادی بوڑھے ہو گئے۔ رات نے چاند نیک شگون کے گھڑے کی طرح آسمان کے آنگن میں رکھ دیا۔ بنگالوں کی پرواز جھیلیوں میں اسی طرح منعکس ہے جیسے ان گنت سفید کنول کھل جائیں۔ امیروں

تے ہاں بے تماشہ کھانے والے برہمنوں کو اب گرمی محسوس ہو رہی ہے۔ گاؤں کے کسی نے کہا۔

پھر ایشیہ کی تیز دھوپ پانیوں پر پھیل۔ سیندر راہے سرخ سورج کی گرمی نے نازک بدن

بلگوں کو دکھی کیا۔ نرسلوں میں چکنے دے پر نداد رہن گٹر یاں ماداس ہوئیں۔ ایک پک گئی۔ اب ہینیاک دریا اپنی پانی رتقا رپر داپس آرہے ہیں۔ سیلاب اتر گیا۔ وخت سطح آب سے نمودار ہوئے۔ ٹیلوں پر بے چھوڑ نٹھے منے زمردیں جزیروں کی طرح پانی میں کھڑے ہیں۔ ہر طرف ڈونگیاں چل رہی ہیں۔ ریت کی لہروں پر راج تہیں کے بیچوں کے نشان پڑے ہیں۔ زرخیز بیسی دھرتی پر نئی فصلیں بونی جاتی ہیں۔ جھونپڑوں کی مرمت کی جا رہی ہے۔

درگا پوجا کے لئے منڈپ اور بازار سج گئے۔ سارا دیس سنگیت سے گونج رہا ہے کہ درگامیکے آنے والی ہے۔ بیابا بیٹی کے سواگت کے لئے گھر گھر تیار کی گئی ہے۔ ہر منڈو ڈر مستن درگا کی ماں اور ہر گرسبت گری راج ہے۔ گیتوں میں درگا کی ماں نے کہا۔ آما کو میکے کب بلاؤ گے گری راج، جاڑے نکلے، برسات مٹی۔ خزاں آگئی۔ مگر گوری اب تک نہیں آئی۔ اُسے تہنے کیسے خبطی سنا سکی کے پتے باندھ دیا۔ اس کا نورنگ بھی کالا پڑ گیا ہوگا۔ جب کہتی ہوں گوری کو کبیشاں سے لے آؤ تم ٹال جاتے ہو گری راج۔ میں اُسے لینے کیسے جاؤں۔ میں تو لوک لاج سے مری جا رہی ہوں۔ ایسا بے تکا بھکاری دامو۔

شکر نے جڑی مشکل سے چاردن کے لئے گوری کو میکے بھیجا ہے۔ ہر سو تہوار کی دھواں پھی ہے۔ دجے گاتے ہوئے دیوی کو گھروں سے وداع کیا گیا۔ دیوی سجے ہوئے جگردوں میں دریاؤں پر پتڑ پانی میں ڈبوی گئی۔

کارنگ میں رات کو آسمان کی شخاف ٹھیل پر چاند کا خزاں آلود کنول تیرا تیرا بھرتا ہے۔ کچی سرک پر گتے کے چھلکے بکھڑے پڑے ہیں۔ ہوا میں زعفرانی گرد اڑتی ہے۔ جو کی بالیوں پر طوطے ٹپٹھے ہیں۔ تیز چاندنی میں پھیول نے اپنے جال دیاؤں پر پھلا دیئے۔ ان کی بانسروں کے سڑوں نے پردیس جانے والے مسافروں کو مضطرب کیا۔ فضا میں آسمان کا دریا بہ رہا ہے۔ اڑتے پگٹے اور سفید بادل اُٹھ کے ریتیلے ساحل ہیں اور ستارے اس کے نیلو فر۔ ندی کنارے رٹھندی کچھ میں جھوا ما سوتا ہے۔ گاؤں کے کسی نے کہا۔

ادگھران مینے میں دھان تیار ہو گیا۔ منڈیوں میں قیامت کی چہلی پہل ہے۔ گانے کے مقابلے کئے جا رہے ہیں۔ گھر گھر نئے چاول کی کھریک رہی ہے۔

چاول۔ چاول۔ چاول۔

کو "سہرا جنگال" سال میں بین باہر جادل اگانا ہے اور بھوکا رہتا ہے۔

گلابی جاڑوں میں سپاری کے سڈوں درخت نگاہن سپاریوں سے لد گئے۔ پوش کی چاندنی راتوں میں چھیروں کے جال روپہلی پھیلیوں سے بھرے۔ کئی ہوئی فصلوں کی رکھوالی کے لئے چمن بنائے گئے۔ الاؤ کے گرد غازی گان کی بھس جی جھونپڑوں میں پرال بھجانی جانے لگی۔ رات کو گیدڑ جنگلوں سے باہر نکل آئے۔ سرسوں پھولی۔ دیاؤں پر کشتی رانی کے مقابلے شروع ہوئے۔ مساری گان کے جوشیلے سر آبی راستوں پر پھیل گئے۔

مالکھ کی طویل راتوں میں بندر سردی سے کانپ رہے ہیں۔ کتا چولہے کے پاس بیٹھا ہے۔ لڑکیاں چرائے اور مری رخصتی میں سوزنیاں کاڑھنے میں مصروف ہیں۔ پردیسی مسافر گاؤں والوں سے پرال اور بھوسہ مانگ رہے ہیں۔ عزیز بڑھیا آگ تاجتی اپنی کٹی سے باہر نہیں نکلتی۔ دھان کے گھٹوں کے پاس اُپلے جل رہے ہیں۔ آپس میں جھڑتے مسافر چوپال کے الاؤ کے پاس اکڑوں بیٹھے ہیں۔ اماؤس کے سرد اور تاریک اندھیرے میں چڑھیوں اور جادو گرینوں نے اپنے اپنے چولہے جلائے۔

صبح کا دھندلکا سارے گاؤں پر چھا جاتا ہے۔ ذورائق پر سرخ بھون پہنے رکھو گھٹ کاڑھے اوشا سسرال جاتی نظر آتی ہے۔ پھیران کی سُرخی کی طرح لال۔ جنیو پہنے۔ تلک لگائے۔ کندھے پر لال انگوٹھا ڈالے سوہے ٹھاکر برگد کے پیچھے سے جھانکتے ہیں۔ لونبھائی۔ وہ مائی اور سنار اور تیلی کے پھپھوں تک پہنچ گئے۔ مائی کی لڑکیاں باغ میں پیشپ انجلی کے پھول چھتی ہیں۔ تیلی کی لڑکی تلاب پر برتن مانجھتی ہے۔ صبح تڑکے سورہیہ ٹھاکر ان کریم سیل کی پٹھر پر برستی ہیں جو سرسبز چولہے پر سرسوں کے پھولوں سے لدا آرام سے لیٹا ہے اور کبر اس ناپکوں پر جم گیا ہے۔ گڈڑیاں اور پیوند بھری رضائیاں اوڑھے یا تری گلیوں میں بیٹھے رادھا کرشن لے نئے گاگا کرستی والوں کو جگکار رہے ہیں۔ کولہو چلنے لگے۔ گرہ کی بھیلیاں بنیوں کی دوکانوں پر نیسے۔ گاؤں کے کبے نے کہا۔

ادراب جنگلوں میں پلاش کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ بنوں میں شیر دہارتے ہیں۔ شیشیر کے خنک اندکے نیچے پہاڑی راستوں پر اور کڈ کھلے ہیں۔ سرسوتی پوجا کے لئے مورتیاں گھرا کر دھوپ سا سکھائی جا چکیں۔ سرسوں پک گئی۔

پھانگن میں بانس کے ہرے بھرے جھنڈوں میں سے گدرتی، شہد کی مکھیوں کو جلو میں لئے ران سنجی۔ دکھن کی سہانی ہوا میں چلیں۔ لڑکیوں نے بالوں میں کلیاں سجائیں۔ رنگین کشتیاں

لے کر مابھی دریا رک پر نکلے۔ پشپہ بنوں میں بھونرے گونجنے لگے۔

پھول بن میں آدھی رات کو انارے بھونرے۔ میں چاند کی بتی جلاؤں گی ماور شہنم سے
باتیں کریں گی اور سپنوں کی پگڈنڈی پر چلتی تمہاری ادراؤں گی۔ بہت دھیرے سے انارے بھونرے۔ کہیں تہرا
گیت ختم نہ ہو جائے۔ میری نیند نہ ٹوٹ جائے۔ پھول اور ڈایاں نہ جاگ اٹھیں رے بھونرے۔ گاؤں
کے کبئی نے کہا۔

ہر جانی ہوا جنگل جنگل منڈلاتی پھر رہی ہے۔ چاروں طرف رنگ ہی رنگ پکھر چکے ہیں۔ رنگین ناؤ کا
مانجھی اودی موجوں پر اپنی سبک کشتی کھیتا ہے۔ بن کھاتے دریا کی موڑ پر اسے سرخ رنگ کا جھونپیر نظر
آیا۔ ندی کے کنارے ہری گھاس پر نشی ساری سوکھتی ہے۔ شام کی پرچھائیوں میں چھپی کالی باڑی کی سمت سے
پائل کی آواز آرہی ہے۔ جھم جھم کرتی وہ گھاٹ پر آ کر اپنا رنگین گھڑ پانی میں ڈبو دیتی ہے۔ اس کی شکل کی
ایک جھلک نے مجھے دیوانہ کر دیا۔ سورج لہروں میں ڈوبتا جا رہا ہے اور میں اپنی ناز کھے رہا ہوں۔ جھیلی
کے مغنی نے کہا۔

چیتروک شہد ایسے مینے میں پلاش پھولوں سے لد گئے۔ گل مہر کی پتیاں جھڑنے لگیں۔ جنگلوں
میں زرد اور سرخ پتوں کے فرش پکھ گئے۔ آم کے کنجوں میں کوئل کوئی طوطے کی چونچ ایسے سرخ سورج
ماما کا غصہ پل پل بڑھتا جا رہا ہے۔ جھیلیاں پکڑنے کا ہنگامہ شباب پر آیا۔ کشتیوں کی مرمت کی گئی۔ میسلے
لگے۔ خلق خدا جا ترا کے تاشوں سے محفوظ ہوئی۔ ندیوں اور جھیلیوں پر بنسیاں اور جاں سنبھالے دیہاتوں
کی بھیڑ جمع ہے۔ جگمگاتی جھیلیوں کے انبار ہر سو لگ گئے۔

بوئی شاک میں شیفالی مہکی اور مادھوی اور لکھل۔ اشوک اور مہوے اور انٹاس اور ششم اور
لاکھ کی شانوں پر کپوں کھیلے۔ پاٹ کی نئی فصل بوئی جا رہی ہے۔ خوشگوار ہوائیں آمدھویوں میں تبدیل
ہو نہ لگیں۔

جوئی شٹو کی دھوپ میں تال اور لو پکھر سو کھنے لگے۔ زرسلوں کے پرند اور بٹلے اور دریائی باز
پر پھیرا کرتے باز ہے ہیں۔ خوفناک خوفناک نیروسندھکتے۔ چھڑاؤ گئے۔ جھونپیریاں گر گئیں۔ باربان بکھر
گئے۔ ہواؤں کی غارت گری جھکڑنے دھرتی پر پھلوں کی بارش کر دی۔ بازار اور ہاٹ آم سے پٹ گئے۔
اب جا رہا کھل چکے ہیں۔ اور چپا اور رو جینی گندھونے راتیں معطر کر دی ہیں۔ تباہ حال کسان پھر جھونپیروں

ادرجاوں کی مرمت میں جٹ چکے ہیں۔ برسات کے انتظار میں نئے مجال بنے جا رہے ہیں۔ شدید دھوپ و خشک سالی۔ اللہ نیگہ دے نیگہ دے رے۔ اللہ نیگہ دے۔ اللہ رے اللہ۔

تب بنگال کی کھاڑی سے آشاڑھ کے درشا کا الیزبادلوں کے لشکر آگے جو عمارت شروع ہوئے۔ نیکی کے زرگل کا بھوت مل کر، کھوپڑیوں کے بجائے بنگلوں کی قطار کی! لاپسے سیاہ بادلوں کا جوڑا باندھ کر، دھنک کی چھڑی اور بجلی کی جھنڈیوں والا عصا۔ سنبھالے برہنوں کو ڈرانے کے لئے موسم نے پھر جا ڈگر کا روپ دھارا۔ آسمان بارش کا تاریک درخت بن گیا۔ جس کی واڑھی زمین تک آرہی ہے۔ سہ ماہیوں کے بھوکے موربوں میں چلانے لگے۔ گلابی کیلوں سے لدا درخت اپنے پتوں کا چلو بنا کر بارش پر پانی پی رہا ہے۔ بید کے پھولوں سے بھکتی نندی جامن کے درختوں کے نیچے رواں ہے۔ مچھلی کے لواقب میں بنگا لڑاں پتوں کو پر امید لگا بھوں سے دیکھتا ہے۔ مغلس کسان کی سیوی سر پر چٹائی اورھے، ہر طرف ٹپکتے جو پٹے کا بچا ڈکرنی پھر رہی ہے۔ جنگلوں کے آدمی واسی کانن درگا کی پوجا کے لئے درختوں کی جڑوں میں خون چھڑک کر بلوا کے پیالوں میں تاڑی پی رہے ہیں۔ گاؤں نے کبی نے کہا۔

دریا چڑھے۔ میگھنا اور بہیم پتر۔ پدما اور معدھو می۔ بھیرب اور بھاگرتی۔ شب بٹھری اور کرناٹی۔ سمر اور دعا لیشوزی۔ سراب کے پانچویں دن ناگ سنجی منائی گئی۔ جنگلوں میں ہاتھی چنگھاڑ رہے ہیں۔ ندیوں کے ساحل کیچھ اور کالی اور کینچوؤں اور دلدل کی راجدھانی بن گئے۔ سبیلوں سے نکل آئے۔ اوجھوں کا کاروبار چکا۔ چھڑیاں لگائے لوگ جلدی جلدی گھاٹ پر اترتے ہیں۔ بانس کے پلوں پر سے گزر رہے ہیں۔ تیرلیوں کی ایسی نازک کشتیوں کو طوفانی دریا نکل گئے۔ دریا گاؤں اپنے ساتھ بہا لے گئے۔ درخت جڑ سے اکھڑے۔ مویشی اور انسان عزاب ہوئے۔

”میری قسمت ہی خراب ہے۔ سیلاب میں سب کچھ بہ گیا۔ اللہ تو نے دنیا بنائی اور پھر مجھ سے میرا پٹ، میرا دھان سب کچھ چھین لیا۔ میری قسمت میں کتنے دکھ ہیں رے اللہ۔ میں پاٹ بیچ کر تیرے لئے سونے کی تھلاؤں گا۔ میں نے اس سے کہا تھا۔ پاٹ تو سیلاب میں بہ گیا۔

اد ناخبر رے کتنے منش۔ کتنے ڈھور ڈنگر طوفان کی بھینٹ چڑھے۔ اللہ رے۔ اللہ

رے۔ اللہ رے۔

گاؤں کے کبی نے کہا۔

اگست اندولن اور سپلر زوار

آٹھ ماہ - بھادرد - ۱۳۴۸ھ

کال کے گھٹا ٹوپ اندھمارے میں مناظر غیر مری تھا اور کی طرح روشن رہیں گے۔ کیونکہ ہر منظر جو معدوم ہوا باقی ہے۔ ان سارے گھروں، روشن کمروں کا تصور کرو جو لوگوں گزرنے کے باوجود، وقت میں شامل، موجود ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے لوگ، ٹیلو گروپ۔ ان کی آوازیں۔

چند رنج اندھیرا پڑا تھا؛ جب وہ تین اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ وہ برآمدے میں آکر میٹھک خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ برآمدے کے سرے پر چار در میں سرمنڈ لپٹے ایک داہمی والا بوڑھا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ اب نو وارد برآمدے سے اتر کر گھاس میں سے گزرتے پھوڑے ڈیورسی کی کونڈی بجا رہے ہیں۔

سونی گھر کی کھڑکی کھلتی ہے۔ گھاس پر روشنی کا راستہ سا بن گیا۔ کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا۔
"دیپالی"

"ارے تم لوگ۔" دیپالی ذرا خشکی سے کہتی ہے مگر فوراً ہار آ کر ڈپوڑھی کا دروازہ کھولتی ہے۔ وہ تینوں اس کے ساتھ کھیلے برآمدے میں آجاتے ہیں۔ دیپالی میٹھک خانے کا دروازہ کھولتی ہے، جس میں شدید صحن طاری ہے۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر تنک جاتے ہیں۔ نمودار الحق تالی بجا کر ایک پھچھارتا ہے۔ جو ترموئے دتائے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس کی خالی ڈبیانہ نشانہ باندھ کر سامنے حوض میں پھینک دی۔ روزی ہنرچی تیوری پر بل ڈلے آنگن کے درختوں کو دیکھ رہی ہے۔ تینوں خاموش ہیں۔ دیپالی بھی خاموش ہے۔

”ادھر آؤ۔ دیپالی۔“ روزی اچانک ذرا درشتی سے کہتی ہے اور دیپالی کے آگے چلتی اس کے کمرے داخل ہوتی ہے۔

کمرے میں پچھرا بھنجانا رہے ہیں۔ دیپالی نے روشنی جھانکی۔

”تمہارے بابا سونے میں ہیں؟“ روزی کا سوال

”بابا اور بیٹی ماں فریڈے پور گئے ہیں۔ پش ماں کے دیور کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس میں بابا کی شرکت رہی تھی۔ رات کو عبدالقادر برآمدے میں سوتے ہیں۔ کل یا پرسوں میں بھی چلی جاؤں گی۔ شادی اتوار کو، کھو کھو بیچارہ پر گیا تھا اس لئے میں بابا کے ساتھ نہ جا سکی۔“ وہ پلنگ پر ٹھک جاتی ہے روزی دروازہ زدتی ہے۔

باہر محمود الحق اور جیو ترسومے دتا چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ اچانک اندر سے روزی کی گرجدار آواز آتی

۔

”عندار۔۔۔“

محمود الحق تاسف سے سر ہلاتا ہے۔

اندر کمرے میں روزی بزمی عین اسی جگہ کھڑی ہے جہاں آج سے ڈھائی سال قبل دیپالی نے اسے حلف اٹھوایا تھا۔

”لوڈی۔“ روزی کی دوسری گہج۔

”پارٹی ڈائریکٹور۔“ دیپالی کا جو شیلا، برا فر دختہ، تو ضعیی لہجہ۔

”برٹش ایجنٹ۔۔۔“ روزی کی پھنکار۔

”فاسٹ۔۔۔“ دیپالی کا ترکی بہ ترکی جواب۔

جیو ترسومے دتا اٹھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ آگ بگولہ روزی اور دیپالی باہر نکلتی ہیں۔ نیک بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک زوردار بوجھار نے سارا برآمدہ نثر لور کر دیا۔ وہ چاروں بیٹھکوں میں چلے جاتے ہیں۔ دیپالی تھی جلا کر کھڑکیاں کھولتی ہے۔ کرسیوں پر ٹھک کر وہ چاروں زور شوراً میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ غل سن کر کھوکھو اپنے کمرے سے آنکھیں ملتا چھینکتا سلیر گھسیٹتا بیٹھکوں میں آتا ہے۔ وہ اب بڑا ہو چکا ہے۔ اور کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی تندرہی سے تکرار میں شامل ہو

اب یہ لوگ دہشت پسند شہداء کا ذکر کر رہے ہیں۔

دیپالی جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ آسمان پر نہ در سے بجلی چمکی۔ وہ چند لمحوں تک چپ کھڑی، ابڑ جھانک کر اپنے چچا کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ کالی گٹھا ہرے بھرے آنکھن پر اتنی نیچے آئی ہے، لگتا ہے اگر ہاتھ بڑھائے تو گرنٹ میں آجائے گی۔

”کنک لتا، روا — کل شبید ہوگی۔۔۔“ اندر محمود الحق گھر رہا ہے۔

”امپریل ہوٹل میں ریمان دا اور اومادی —“ جیو ترموئے دتا گھر رہا ہے۔ دیپالی چوکتی ہوگا
”اومادی جو کلچرل فرنٹ پر کام کر رہی ہیں — فاشنزم کے خلاف — ہا ہا —“

نار ہر شند۔

”سریری تو شش رائے کی صاحبزادی؟“ محمود الحق کا تجا بن عارفانہ۔

”ڈیڈی کو نامٹ ہڈل گئی —، ہترے؟“ جیو ترموئے دتا کانفرہ۔

اب ساری آوازیں گڑمڈ ہو جاتی ہیں۔

”ڈزٹراؤ —“

”چرخہ چلاؤ۔“

”پیپلز ڈار میں معنوں نکھو —“

”ہترے — ہترے —“

”ہم جاتے ہیں دیپالی —“ روزی کی آواز۔ ”تمہیں یاد رکھیں گے۔ بانی بانی گڈ ٹائٹ۔“

”گڈ ٹائٹ دیپالی۔“ محمود الحق اور جیو ترموئے دتا کی آوازیں۔

وہ تینوں پھٹ سے کوارٹھول کر سامنے کے برآمدے میں نکل جاتے ہیں۔ دیپالی پچھلے برآمدے

میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں فرش پر جم سے گئے ہیں۔ وہ دنیش چندر سرکار کی تصویر پر نظر ڈال کر

جلد کتے پلکس جھکا لیتی ہے۔

رات کا اندھیرا اور بارش باہر ان تینوں کو نکل لیتی ہے۔

کھوکھو باہر کا دروازہ بند کر کے چھینکتا ہوا بیٹھک جانے میں واپس آتا ہے۔ کیا یہ بھی، یہ تو اند

میں شامل نہیں ہوگا۔؛ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتاتا۔ عجیب گھٹا، تلخ سا لڑکا بنتا جا رہا ہے۔ وہ خاموش

پنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔
 باہر بارش کی بھوار سے عبدالقادر کا ادھا بستر بھیک چکا ہے۔ وہ اس کے باوجود گہری نیند
 ہے۔ جب بارش کا چھینٹا اس کے چہرے پر پڑتا ہے تو نیند میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل رہا ہے
 دوسرے بدم چھٹنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ یہ منظر بھی وقت میں تحلیل نہیں ہوگا۔

۲۲

بد روئی

بھادر د کی موسلا دھار جھڑی کی وجہ سے روزی بھرجی نے اپنی سائیکل لیلی کاٹج کے ایک
 میں مقفل کر کے کھڑی کر دی ہے۔ وہ گھوڑا گاڑی میں گھرواپس پہنچی ہے۔ گاڑی اسے مشن کیاؤنڈ
 منے اتار کر برگد تلے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں مرنگلے گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر کھینچ رہے ہیں۔

روزی بھرجی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لانے کے بعد یونیورسٹی میں ایم اے کے لئے داخل ہو چکی
 ہیں۔ روزی بھرجی اس سے بے حد خوش ہیں، تعلیم میں اس قدر تہنک دیکھ کر ان کو یقین ہے کہ وہ اپنی
 ہی حماقتیں ترک کر چکی ہے۔ وہ اس پر سخت نازاں ہیں۔ میری قابل، ہونہار، بے مثال بچی، وہ
 پھیلی رسال کی حماقت اور بدتمیزی بھی معاف کر چکے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ایک اعلیٰ خاندان عیسائی
 کی تلاش از سر نو شروع کر دی جائے۔ اس مرتبہ وہ قطعی روزی کی پسند یا ناپسند کا خیال رکھیں
 وہ اس سلسلے میں وہ اس سے ابھی کچھ نہیں کہتے، یوں بھی وہ اس قدر مصروف ہے۔ پوسٹ
 بے پڑھائی کی وجہ سے دیر تک لے یونیورسٹی لائبریری میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو وہ سگن لگے جا کر
 سن کرتی ہے (اس کی شاگردیا سمیں ہائی اسکول پانس کر کے اب این اے کے لئے اس سے انگریزی
 ہے) اس طرح روزی عموماً صبح کی گئی گدات پڑے لیلی کاٹج واپس آتی ہے۔ یوں بھی اگر وہ دیر
 و بے نوپادری بھرجی باز پرس نہیں کرتے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور انھیں اس پر مکمل اعتماد
 مانہ تمیزی سے بدل رہا ہے۔ جنگ نے پرانے معاشرے کی بہت سی فیصلیں ڈھادیں۔ جنگ (قیانوی)

اور ہا بسند وضع ڈھاکے تک پراثر انداز ہو چکی ہے۔ پادری ہنرجی اپنے اتوار کے وعظوں میں اس اخلاقی کجکردی کی طرف بڑے دکھ سے اشارہ کر چکے ہیں، جو کلکتے جیسے گناہگار شہر کی مانند یہاں بھی عام ہو جائے۔

ٹھیکیداروں اور تاجروں کا نو دوتا طبقہ تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ لڑائی اس وقت بنگال میں پڑوس میں لڑی جا رہی ہے۔ کلکتے پر ہلکی سی بمباری ہو چکی ہے۔ جاپان نے مشرق میں براہیمپائر کی بنیادیں ہلا دیں۔

۵ فروری کو سقوطِ سنگاپور کے بعد ریورنڈ ہنرجی نے گرجا میں رحم کی دعا کے لئے اسپیشل منعقد کی، کو ائیر نے ROCK OF AGES ایسے جذبے سے گایا کہ بڑے بڑے شقی القلب بڑستوں کی (پادری ہنرجی کے کلمے میں ایٹی برٹش بھیرٹوں کی اب کمی نہیں) آنکھوں میں آنسو آگ

اور — O GOD OUR HELP IN AGES PAST

OUR HOPE IN YEARS TO COME

OUR SHELTER IN THE STORMY BLAST

AND OUR ETERNAL HOME.

روزی پچیس سے کو ائیر میں گاتی آئی ہے۔ مگر اس روز غائب تھی۔ خیر

A THOUSAND YEARS IN THY SIGHT

ARE LIKE AN EVENING GONE

SHORT AS THE WATCH OF NIGHT

BEFORE THE MORNING SUN.

لیکن مارچ میں جاپانی بونے سارے براہ پر قابض ہو گئے۔ رنگون سے بھاگ کر سپیل بنگال تک پہنچنے والے پناہ گزینیوں کے حالات سن سن کر پادری ہنرجی کا دل لرز گیا۔ ڈھاکے آنے والے آبرمن ہندوستانی اور برمی عیسائی قافلوں کے لئے مشن کمپاؤنڈ میں خیمے لگائے گئے۔ پادری ہنرجی د رات مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری اور دلجوئی میں جُتے رہے۔

اب بنگال کی جھانڈیوں میں برطانوی اور امریکن فوجیوں کی ریل پیل ہے، جو برما کے جنگلوں میں

ی موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ موت اور تباہ کاری کا بازار ساری دنیا میں گرم ہے۔
ریورنڈ بنرجی کو سواچند امریکن مشنز لوں کے، امریکنوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر
لوں انہوں نے اس اجنبی، بے ننگی، انوکھی، ایسی پورم قوم کے عام افراد کو پہلی بار قریب سے
دیکھا۔ امریکن افسروں کی ٹولیاں جیب گاڑیوں میں لدا کر مشن کپاؤنڈ آئے لگیں۔ انہوں نے بیش
بالف عیسائی غرام میں بانٹے، اور پادری بنرجی سے بڑی بے تکلفی اور بھائی چارے سے باتیں کیں۔
ٹی چارے کے ساتھ انگریزان کے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے۔

ملا یا میں برطانوی شکست کے بعد بنگال کے فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے ہیں۔ ایک
بنرجی نے اسٹیٹس میں پڑھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو ملا یا میں جا پانہوں نے جنگی
لیا۔ سمجھناش بابو کے متعلق بھی آئے دن خبریں چھپا کرتی ہیں۔

لیکن پادری بنرجی نے کسی اخبار میں یہ نہیں پڑھا کہ بنگال کے انقلابی، پرانے پاپی، اندھیری راتوں
از مشیں کر رہے ہیں۔

روزی پچھلے چند روز سے رات کو کافی دیر میں گھراتی ہے۔ کیونکہ لائبریری مشن کپاؤنڈ سے
صلے پر ہے۔

گھوڑا گاڑی سے اتر کر روزی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ لیکن
بنرجی حسب معمول کھانے کی میز پر صبر کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ آج اس نے بہت
پر لگا دی۔

اپنے کمرے میں جا کر پانی سے صیغی ساری تبدیل کرنے کے بعد وہ جلدی سے آکر میز پر بیٹھ گئی۔ سبز
کچن سے گرم گواہ لے کر آئیں۔

یورنڈ نے ماتھے پر انگلی رکھ کر گریس کی دعا کے لئے سر جھکا یا۔ ان کی بیوی نے بھی سر جھکا یا۔
بھی مگر انکھوں سے اپنی رست و لچ دکھتی رہی۔

لے ہمارے آسمانی باپ۔ تو جس نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں ہمارے سامنے رکھیں تیری
اسی طرح اس میز پر اور اس گھر پر رہتی رہے۔ آمین۔ پادری بنرجی نے گریس پڑھ کر سلا

اٹھایا۔ ایسٹرن ہنر جی نے ٹوچیاں پیش کیں۔ ریورنڈ نے لقمہ بناتے ہوئے روزی کو دیکھا جو کھانا شہ کرنے کے بجائے ذرا بے چینی کے ساتھ چمچے سے کھین رہی تھی۔
”کھانا کھاؤ بیٹی۔“

”جی ہاں پاپا۔“

اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا اور پانچ چھ نوالے نکلنے کے بعد کرسی سے اٹھنے لگا۔
پادری ہنر جی نے اسے ٹوکا۔

”کیا بات ہے؟“

”بھوک بالکل ہے ہی نہیں پاپا۔ یونیورسٹی کینیٹن میں بہت سے سمو سے کھائے تھے۔“
”سامے ملک میں ان بد معاشوں نے آگ لگا رکھی ہے۔ ایسے پُر آشوب زمانے میں تم اتنے گئے گھر لوٹی ہو۔ جو زون ہی کو ساتھ لے جایا کرو۔“

”منہیں پاپا۔ گرو دیو کا انتقال ہو گیا ہے نابلے چارے کا۔ تو یونیورسٹی میں ہم لوگ ان میں ایک بڑا زبردست پروگرام کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں میٹنگ تھی۔ میٹنگ کے بعد آئے جانے حسب معمول اڈہ شروع ہو گیا۔“

”آج کل اڈے کا زمانہ نہیں ہے۔ بہر طرف گولیاں برس رہی ہیں، احتیاط رکھو۔“
”بہت اچھا پاپا۔“ وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔
اچانک ریورنڈ ہنر جی کو ایک خیال آیا۔ یونیورسٹی تو اس بد بخت بناوت کی وجہ سے بند ہو ہے۔ یہ پھر مجھے دتیا نوی احمق بڑھا سمجھ کر بے وقوف تو نہیں بنا رہی؟
”روزی ادھر آؤ۔“ انہوں نے کڑک کر کہا۔
وہ جھٹک گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے حکم دیا۔

وہ اطمینان سے واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم پھر ان — ان غداروں سے جا ملی ہو؟“

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

” روزی “ ریزندہ بنجری نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک بار پھر کہنا
 ” کیا۔ “ جس سرکار نے ہمیں جنگلی سے انسان بنایا۔ بت پرستی کے جنمی راستے سے نکال کر۔ “
 ” اودہ لو پایا۔۔۔ نوٹ آگین۔۔۔ “ روزی نے ایک لمخت تھنجھلا کر میز پر بیک مارا۔ پانی کا
 چھلک گیا۔ ایستھر بنجری نے جھاڑن اٹھا کر پھرتی سے میز صاف کرتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ ” روزی “
 ” سو ری ماما۔ “ پھر وہ اپنے پاپا کی طرف مڑی۔

” پاپا۔ سنئے۔ سی۔ ایف۔ اینڈ ریزوز تو نہ صرف پکے ہوسانی تھے بلکہ اصل نسل انگریز بھی تھے۔
 آپ سے کہیں زیادہ بڑے پادری۔ آپ نے جا کر کبھی ان کو یہ سب کیوں نہ سمجھایا۔؟ “ اس نے بہت
 اتنی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

” کوٹھ انڈیا۔ کوٹھ انڈیا۔۔۔ “ پادری بنجری طیش کے عالم میں کرسی سے اٹھ کر کہے میں
 لنگے۔ احمقو۔ گدھو۔ انگریز چلا گیا تو ہم پھر اسی بربریت، بے ایمانی اور بے انصافی کے دودھ کی
 لوث جاٹیں گے۔ جس سے انہوں نے ہمیں نجات دی۔ “

روزی نے دوبارہ ذرا پریشانی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پادری بنجری اب ایک کرسی کی پشت پر ہاتھ
 زہنایت برا فروختہ آواز میں اس سے مخاطب تھے۔ ” کوٹھ انڈیا کی بچی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی
 ناڈینگیں پڑھ پڑھ کر پاگل ہو گئی۔ ہندوستان کی سنہری قدیم تہذیب! سنہری قدیم تہذیب یہ تھی کہ
 پوری کرنے کے لئے ہندو اپنے بچوں کو گھڑیا لوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ ہندو لوہ کیوں کو مار
 جاتا تھا۔ مسلمان ٹھگ مسافروں کا کٹلا گھونٹتے تھے۔ انڈین کلچر! انڈین کلچر! کتنے انگریز مشنریوں نے
 عورتوں کو جتا سے نکالا۔ اور جب وہ ان بد نصیبوں کو بچانے کی کوشش کرتے، عین وہیں شمشان گھاٹ
 اور جاتا تھا۔۔۔ خود میری پردادی کو۔۔۔ جانتی ہے احمق؟ میری اپنی پردادی کو سستی ہونا پڑا
 وکلچر۔ ہندو کلچر۔۔۔ “

روزی کو باپ کا اس قدر شدید غصہ دیکھ کر بے اختیار سنسی آگئی۔ اس نے آہستہ سے کہا ” مگر پاپا۔
 لے ہندب سچی یورپ میں بھی تو نزاروں بے گناہ عورتوں کو جا دو گری کے الزام میں صدیوں تک زندہ چھلایا
 ہا۔ اور جس زمانے میں ہندوستان میں ہندو مسلمان مزے سے اکٹھے رہ رہے تھے اس وقت آپ گے

یورپ میں INQUISITION ہو رہا تھا۔ ہا ہا ہا۔۔۔ “

”روزِ چہ۔“ ایستھر بنجی نے سہم کر باپ بیٹی کی تکرار ختم کرانی چاہی۔

”اور سنئے پاپا۔“ روزی مزے سے کہتی تھی۔ ”تیسویں کے بیماریوں نے سارے یہودیوں کو اٹھا کر
BNETTOS میں ڈال دیا۔ (میری اور بے چارے پاپا کی ڈسٹنگ سوسائٹی اس نئے دل میں سوچا) اور
یہ جو پاپا آپ اچھوتوں کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کے انگلینڈ میں ایک جمینی سوپ یا اُسے کیا کہتے ہیں۔
پاروومن۔ یہ کسی لارڈ کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں؟۔“

”کچ بجتی مت کرو روزی۔“ پاروی بنجی نے ڈامٹا۔

روزی کو ایک از رنگتہ یاد آیا (تو اس بجٹا بجتی میں آدھ ٹھنڈہ برباد جانے کا) یہ جو آپ ہمیشہ ہندوستان
کے پرانے مطلق العنان حکمرانوں کو بڑا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ خصوصاً شراج الدولہ کو، جو میرا بیرو ہے
تو کیا آپ کے ایجنٹس انگلستان میں بات بے بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دے جاتے تھے؟ جسے
دیکھو ٹاؤن آف لندن میں پڑا جھینک رہا ہے اور دوسرے سڈز کھٹ سے سرفراب۔ وہاں عام آدمی کے لئے کوئی انصاف
تھا؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑی کی چوری کی سزا موت تھی۔ اب یہ ”لائینڈ آرڈر“
کا کن منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں۔ یہ انگریز کب کبے کہنے۔ ہماری دولت لوٹ کر تو خود کو مہذب
یہاں ان بیٹیوں نے۔“

پاروی بنجی سینک تار کر اس حاف کرتے ہوئے پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بد تمیز، گستاخ، زہل
دراز انہیں بچی۔

”اور بتاؤں آپ کو پاپا۔“ روزی اب صریحاً بے رحمی پر انزائی تھی۔ ”آپ کے وہ جو ایک کٹر
رومن کیتھولک دوست ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس باسو۔ جب ان کی بڑی لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کی جو بے
چارہ ایک اعلیٰ خاندان کا بنگالی ہے تو انہوں نے فوراً بیٹی کو عاق کر دیا۔ اور آپ بھی کس قدر خفا ہوئے تھے۔
ماتوہ۔ اور ابھی پچھلے دنوں ان کی چھوٹی لڑکی نے ایک معمولی امریکن فوجی سپاہی سے سیاہ رچایا تو انکل باسو فخر سے
بھولے نہیں سمائے حالانکہ۔ حالانکہ وہ رومن کیتھولک تو کیا عیسائی ہی نہیں سوے سے یہودی ہے۔ اور
جب آپ نے بھی فوراً لائیوینا کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ تو پاپا یہ تو غلامانہ ذہنیت اور گوری چھڑی کا رعب۔“
”بس کرو روزی۔“ ایستھر بنجی نے سر اٹھائی سے کہا اور چپکے سے اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے۔
وہ گہرا سانس لے کر کرسی سے اٹھی۔

”اچھا۔ اچھا۔ بیٹی۔“ پادری ہنرچی نے طول آواز میں جواب دیا۔ ”نکال دو انگریزوں کو
ستان سے پھر دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے۔ تم سب الٹا نیشنلسٹوں کا۔ جوں ہی یہ ہٹے تمہارے
لے ہندو مسلمانوں میں وہ جوتا چلے گا، وہ بھییا نک خانہ جنگی ہوگی کر دیکھ لینا۔ تب تمہیں اس
بہوڑے پادری کی باتیں یاد آئیں گی۔“ ان کی آواز بھرا گئی

روزی نے بڑی نرمی سے کہا۔ ”پاپا۔ میں تو لوہی آپ سے تفریحاً بحث کر رہی تھی۔ آخر مجھے
کی ڈیوٹیوں میں یونہی ٹریفیاں ملتی رہی ہیں، صفت! میں قوم پرست تو یقیناً ہوں پاپا مگر آج کل جو تباہ
پہنچ رہی ہے میں خود اس کے خطرات ہوں۔“

”تم جانتی ہو بیٹی کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ برطانیہ ہر محاذ پر مار رہا ہے۔“
”ہیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ بالکل۔ بالکل۔“ روزی نے جوش سے ان کی
پوزی کر دی۔

”اچھا بس ہو گئی تم لوگوں کی ڈیوٹی۔ اب پاپا کو جا کر سونے دو روزی۔“ ایسٹرن نے اطمینان کا
دلیتے ہوئے کہا۔

”یس ماما۔“ روزی نے دروازے میں جا کر باہر جھانکا۔ مینہ تمہم چکا تھا۔ ”افوہ کتنی گھپ اندھیرا
پہ ماما۔ دیکھنا سبزی باڑی پر چٹنوں کیسے چمک رہے ہیں۔ پاپا۔“ اس نے مڑ کر پادری ہنرچی سے دوبارہ
”کیا آپ واقعی خفا ہو گئے؟ میں تو آپ کو TEASE کر رہی تھی۔ سچ پاپا۔“ کر سکی تھی اگر
بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ پادری ہنرچی خوش ہو گئے۔ ہینک اتار کر اسے رومال سے
لیا۔

”سچ پاپا۔ یونیورسٹی تو بند ہو چکی ہے، مگر ہماری لٹری سوسائٹی ٹیکور کا تعزیمی پروگرام کر رہی
جلسہ ہو گا بڑا۔“

”دیپالی اس جلسے میں شامل ہے؟ وہ بھی آئی تھی؟“
”جی نہیں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ پاپا۔ راجندر سنگیت کا پروگرام اس کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔“
”ہوں۔“ انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

”گڈ نائٹ پاپا۔“ اس نے جھک کر پورنڈ ہنرچی کا سر چھوا۔

دو لیٹن کے مستطرن خودگی کے عالم میں سیدی کرسی پر بیٹھے تھے۔ نیند میں ان کا سر سامنے کو جھک آیا تھا۔
 کی آہٹ پر وہ جھمکنے لگا اور ان کی طرف دیکھ کر بغیر علت کے مطابق پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
 ایستھر جرجی نے ان کے قریب جا کر آہستہ سے کہا: "پال — ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔"
 پادری بنر جی نے سر جھکا بلکس ملیں اور بیوی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے۔
 سے آواز نہیں نکلی۔

ایستھر گری بالانے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ان کے قریب فرش پر دوڑا نو بیٹھ گئیں۔
 باہر بجلی زور سے چمکی اور شکست خوردہ میاں بیوی کے ٹیلو کو روشن کر گئی۔ (مناظر وقت
 معدوم نہیں ہوں گے)

پادری بنر جی چند منٹ تک بالکل چپ، ساکت، سنجھ بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے لرزاں ہاتھوں
 سینک مٹولی! ایستھر نے میز پر رکھے سیاہ کیس میں سے سینک نکال کر ان کو دی۔ پادری بنر جی نے
 پلنگ کے سرانے سے انجیل مقدس اٹھائی۔ ایستھر ان کے نزدیک دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور
 ان سے سڑھانپ ہوا۔

"LET US PRAY" پادری بنر جی نے آہستہ سے کہا۔

۱۷ ساری رات پادری بنر جی حضرت ایوبؑ کی گریہ خداری کا باب پڑھتے رہے۔

اور دیکھو۔ کہ دنیا کے سارے مقدس صحیفوں کے یہ سارے ابواب کتنے ہزار بار برسوں
 نے ان گنت انسانوں کی مصیبت کے وقت میں پڑھے گئے ہیں۔ اور وہ چند الفاظ اسی طرح
 جود ہیں۔

وقت اور الفاظ انسان کے شکاری ہیں۔

گنگا اور برہمپتہ

ڈیک چیر پر ذرا آگے کوچھکا ہوا نوجوان مضطرب سرگوشی میں کہہ رہا تھا — ”ہم نے روپوشی سے باہر آنے کے بعد تم کو اتنے خط لکھے۔ ہر تیسرے روز، ہر ہفتے، ہر پتے پر، اتنے تار دیئے اتنے سند لے بھولتے۔ تم نے ایک کا — صد ہے، ایک خط کا جواب نہ دیا۔ ہماری شدید پریشانی کا بھی تمہیں خیال نہ آیا۔ ہمیں طرح طرح کے اندیشوں نے بدحواس کر دیا تھا۔ شاید تم پکڑی گئی ہو۔ شاید نئے بابو نے تمہیں گاؤں بھیج دیا ہو۔ شاید زبردستی تمہاری شادی کر دی گئی ہو، پھر ادنیٰ کے ذریعے معلوم ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔ اس کے بعد تمہارے چپ سادھ لینے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

”ہماری عقل حیران ہے —“ چند لمحوں کے وقفہ کے بعد نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”ہماری عقل حیران ہے کہ تم نے یہ رویہ کیوں اختیار کیا۔ ناراض ہو تو صرف دو سطروں میں ناراضگی کی وجہ ہی بتلا دیتیں۔ ہم نے بار بار تمہیں لکھا کسی وجہ سے خفا ہو گئی ہو تو بتلا دو۔ اور محاف کر دو۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا؟“

نیم تاریک اور سسنا ڈیک کے سرے پر صوفی سگریٹ کی روشنی چمکتی رہی۔ ڈیک کا فرش بھیدکا ہوا تھا۔ کچھ دور پر ایک خلاصی ایک بیچ پر محو خواب تھا۔

”ہم شروع شروع میں تفصیل سے تمہیں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔ سگریٹ ایک جھٹکے سے پدیا میں جا گرا۔

”پچھلی جولائی سے — کھلنا کی اس اندھیری رات سے لے کر نومبر دسمبر تک ہم ادھر ادھر روپوش رہے۔ سندھ بن میں تم سے ملاقات کے اس خطرناک ایڈونچر کے بعد ہم بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لئے تمہیں کوئی دو حرفی پیغام بھی نہ بھیجا سکے۔ ادارتے مصروف رہتے کہ غم جاناں کے متعین سوچنے کی ہمت ہی نہ ملے۔ دیوبند والوں کو دسمبر میں رہائی حاصل ہوئی اور ہم — کدھر دیکھ رہی

، کیا ہماری آواز بھی ناگوار ہے ؟ ”

دیا سلائی کا مختصر سا شعلہ لپکا۔ دوسرا سگریٹ، زیادہ مضطرب، آزرده لہجہ۔ ”کیا تم اس لئے تھیں کہ ہم دسمبر کے بعد تم سے ملنے بنگال نہ آسکے؟ ہمیں معلوم نہ تھا واللہ کہ تم اس قدم دیوانی لڑکی

دوسرا سگریٹ بھی تین چار کش کے بعد اندھیرے میں دیا میں جاگرا۔
”اگر ہمیں ایک ضروری کام سے اچانک یہاں نہ بھیجا گیا ہوتا تو شاید اب بھی نہ آسکتے،
تم — تم دوسرے گروپ سے جا ملی ہو، اس وجہ سے مجھے بغیر ”ٹرائل“ کے ”عاق“ کر دیا۔ یہ کیا
نا ہے ؟“

جہاز نرم روی سے آگے بڑھتا رہا۔
”کیا مجھے تم سے خفا نہیں ہونا چاہیے؟ میرے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنے کی آخری
ڈیم ٹیو —“

تیسرے سگریٹ کے لئے ماہ جس جلانے کی کوشش، مگر جس سیلی ہوئی تھی۔
”کیا تم کو — کسی اور سے — کسی اور — کوئی لور — ذرا کانپتے ہوئے ہاتھ۔
کی ڈبیا بھی دیا برد ہوئی۔

”شٹ اپ۔“ دوسری ڈیک چیر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے ایک لہجے سے تلملا کر جواب دیا۔
وہ اور آگے جھکا۔ لڑکی کی شکل دھیان سے دیکھی اور آہستہ سے مسکرایا۔ ”شکر ہے؟“
”کیا شکر ہے؟“ وہ بتی کی طرح غرائی۔

دریا پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے سردی کی وجہ سے کندھے سے سکیڑ کر ساری کا آئینل جسم سے
رح لپٹا۔ نوجوان نے کھادی لیشیم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے چادر اتار کر لڑکی کے کندھوں پر ڈالی۔
ہر کے توقف کے بعد بڑی نرمی اور احتیاط سے لپیٹ دی۔ لڑکی ذرا سا کپکپائی۔

بے چاری بے وقوف، نالائق بچی۔

”آپ کو — آپ کو سردی لگ جائے گی“ لڑکی نے دھیرے سے کہا۔
”تم سے مطلب؟ مر گئے تو شہیدِ محبت کہلائیں گے، قسم خدا کی تین ساڑھے تین سال سے کیا

غیر نیکل عشق چل رہا ہے۔ لاجول ولاقوہ۔

کڑوک، چار سو بیس، دھوکے باز۔

”بیالے پاس کر لیا؟“ نوجوان نے پھر مات کی۔

”گریا۔“

”فرسٹ ڈیٹرنک“

”جی۔“

”ارے ماہ شاہنشاہ۔ مبارک ہو۔ تو اب گویا تمہاری نشادی کا اشتہار اخباروں میں دیا جا سکا۔
اس نے کھنکار کر کہا۔ ”بی، الے پاس، ماہ روزخانہ داری میں ماہرہ اسندہ سنگیت کی استاد، کانسٹیٹوٹ کیا۔
بڑا کامیور روزگار ہوا ضروری ہے۔ کم از کم پی سی ایس کو ترجیح دی جائے گی۔“

”کیونہ، بے ہودہ، لوفر۔“

”وہ اٹھنے لگی، نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔“ آپ اب کہیں بھاگ کر نہ
جاسکیں۔“

”آپ کا دماغ خراب ہے۔ لڑکی نے آہستہ سے کہا لہو پھراٹھنے لگی۔

”یہ تم بھاگی کہاں جا رہی ہو؟“

”عبدالقادر جالی کے ادھر چلے بیٹھے ہیں، اگر آپ کی اس۔۔۔ کیا کہنا چاہئے۔۔۔
کلفی پر ان کی نظر پڑ گئی۔“

”پچھلے سال لنگ بھاگ اسی موسم میں آپ کہاں تشریف رکھتی تھیں، غالباً یاد ہو۔ لیکن زیادہ تر
قسم کا AMNESIA لاحق ہو گیا ہے تو۔۔۔“

”ایک مرتبہ حماقت کی تھی، اب دوبارہ ہمیں ہوگی۔ گڈ گریٹس۔۔۔ خیال آتا ہے تو رونگٹہ
کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”تم واقعی بدل گئی ہو۔“

”جی ہاں۔“

اب وہ خاموش ہو گیا۔

شاید قصہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ ایک سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یا شاید محبت ختم ہونے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی، میں سیکارا اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہوں، یہ وہ لڑکی ہی نہیں ہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک وہ بولی: "آپ — آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ — آپ نے آخر اس جہاز پر مجھے کیسے پکڑ لیا —"

وہ خوش ہو گیا۔ نہیں۔ یہ وہی لڑکی ہے! ابھی کچھ نہیں بدلا۔

"کس طرح پکڑ لیا —؟" اس نے بشارت لہجے میں جواب دیا۔ "اس طرح کہ میں ڈھاکے میں بیٹھا آپ کے گھر پہنچا۔ جو سنان پڑھا۔ چکر لٹ کر شاگرد پیشے کی طرف گیا۔ وہاں آپ کی ریاست کے میجر مولوی عبدالقادر کی اہلیہ نے ضروری معلومات فراہم کیں کہ بچے کوئی سترآبا بویں ان کے ہاں گئے ہوئے ہیں آپ کسی خاندانی شادی کے لئے عبدالقادر کے ہمراہ فریدپور تشریف لے گئی ہیں اور فلاں تاریخ کو عبدالقادر کے ساتھ ہی واپس آجائیں گی۔ گھوگھو کی بیماری کی وجہ سے۔ چنانچہ میں نے فی الفور فریدپور کا ٹکٹ کٹایا۔ میں فریدپور فریدپور کے لوگوں سے واقف ہوں۔ آپ کی بچی ہاں کے گھروالوں کو بھی جانتا ہوں۔ یہاں چپکے سے پتہ لگانا بہت آسان تھا کہ آپ کس روز، کس وقت فرانس گنج کے لئے روانہ ہو رہی ہیں چنانچہ اسی جہاز کا ٹکٹ اس ناچیز نے بھی خرید لیا۔ باقی حالات آپ نے پرہہ سیمیں پر غور فرمادئے۔"

"آپ ڈھاکے میں میرا انتظار کر سکتے تھے۔"

"نہیں کر سکتے تھے، آپ کے سلسلے میں ہم منطقی نہیں ہیں۔"

دونوں دھندلے سائے ساکت بیٹھے رہے۔ چاروں طرف بادل اور دھوا ایک ہو گئے تھے۔ ڈیک چڑ سے کچھ دور لمبی سفید دارھی والا مسلمان بوڑھا کپتان اپنے کھلے کپین کے سامنے جنگ پر جب کا گھر اٹھا اس کے نزدیک لگی ہوئی جیھڑا تو روج لاسٹ نے دیا کو حیدر ٹک روشن کر رکھا تھا۔

"روز کی کسی ہے؟" کچھ دیر بعد نوجوان نے دریافت کیا۔

"روز کی — محمودا — سب لوگ — آپ کو نہیں معلوم؟"

"ہاں۔ مرتد نے ڈھاکے میں مجھے بتایا — ان لوگوں کو کچھ سمجھایا نہیں جا سکتا۔" اس نے

گہری سانس لی "اچھا کہیں سے جس نے کہا؟"

کس منہ سے حکم چلائے ہیں، میں گیزر ہوں ان کی زرخیز۔ چروٹیوں کی داسی کتنے ہی کامیڈین جایش

اصلیت میں رہیں گے وہی نیا لہجہ ہندوستانی لارڈ ایڈمز ماسٹر۔ میں نہیں لاتی ماچس واچس۔

”اسے بھائی ذرا بھاگ کر ایک ماچس لے آؤ نا کیس سے۔۔۔ عبدالقادر میاں سے مانگ لو۔

وہ ضرور بیڑی پتے پھلے گئے۔“

”میں ان سے جا کر کہوں کہ ذرا دیا سلائی دینا جو میرے ایک عزیز دوست کو چاہئے جو مجھے بھگالے جانے

کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“

”جب تم (منقریب انشا اللہ) بھاگو گی تو بنوئے بابو لا محالہ یہی شبہ کریں گے کہ ان کے ذریعہ ہی تم ایک

سہاں بھائی کے ساتھ اڑ چھو ہو گی۔“

”اس خیال میں بھی نہ رہئے گا۔ عبدالقادر میاں میں انتہائی فیوڈل وفاداری ہے۔ وہ آپ کے

مولوی ابوالہاشم نہیں ہیں۔۔۔“ فقط وہ چپ ہو گی۔

”وہ۔۔۔ وہ ہم نے ایک سہانا۔۔۔ ناقابل یقین خواب دیکھا تھا نا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔“ لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

کچھ دور پر فوجیوں سے لدا نیم تار ایک اسٹیمر گنڈا تھا۔

”عجیب بات ہے۔“ لڑکی نے پھر جلدی سے موضوع تبدیل کیا۔ ”جب کامریڈ رندھیو سے کا

بیان چھپا پہلی بار کہ یہ جنگ اب عوامی جنگ ہے۔۔۔ تو یہ قوم پرست آئی شدت سے پارٹی کے خلاف

کیوں ہو گئے۔ خصوصاً روزی۔۔۔ وہ تو بہت ہی ایمپھیور نکلی۔ میں نے اسے کئی بار۔۔۔ کئی بار

سمجھایا۔ کہ۔۔۔ آپ نے ایک بار لکھا تھا نا خط میں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل اس پے جگہ سے نا۔۔۔

اور فاشیزم کا مقابلہ۔۔۔“

”بہت خوب، آپ کا جواب نہیں۔ ہمارے عزیزوں کے ذریعے آپ اپنے دوستوں کو

ایجوکیٹ کرتی ہیں۔ مگر میں دو سطریں لکھنے کی آپ نے زحمت گوارا نہ کی۔ اب بھائی ہمیں یقین ہو گیا کہ

تمہارے دماغ کی لایک چٹول ضرور ڈھیلی ہے۔“

”کمال ہے۔۔۔“ لڑکی نے مزید گڑ بڑا کر سید سجدگی سے سیاسی گفتگو جاری رکھی۔

”مزید زحمت کو کاٹ کر بھی سی پی، آئی سے عیندہ ہو گی۔ حالانکہ۔۔۔ حالانکہ۔۔۔“

پنڈت نہرو ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے فاشنزم کے خطرے کو پہچانا تھا۔ ”لڑکی نے اس انداز میں بات ختم کی گویا اخبار کا ایڈیٹوریل پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر بے نیازی سے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”جی ہاں۔ آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بالغ نظری ترقی پر ہے۔“

دریا کی متلاطم لہریں ایشیم سے ٹکرائی گئیں۔ کبھی کبھی پانی کی جھینٹیں اڑ کر اوپر آ جاتی تھیں۔ لڑکی کے بال بھینگ گئے۔ رات تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔

دفعاً لڑکی نے سوال کیا: ”آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ یا۔۔۔ راز کی بات ہے؟“

”نہیں۔ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ ہمیں پراونشل مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔“

مسلم لیگ — نواب قمر الزماں چودھری — ارحم — جہاں آ —

جہاں آ کی گدلی موجوں پر ڈونے لگا۔ اس کے انجن کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں بندھے پڑ گئے۔

”جیوتی دا، روزی، محمود دا، یہ سب بھی مجھ سے بے حد خفا تھے، روزی نے تو مجھے غذا اور ٹوڈی

ما۔۔۔ حد ہے۔“

”تم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا۔؟ تم تو دیش بابو کی بھتیجی ہو۔“

”آپ نے جو اتنی سختی سے منع کر دیا تھا۔“

”کب۔؟“

”اپنے پچھلے خط میں۔“

”مائی گڈنس۔“

لڑکی نے اور زیادہ ہڑبڑا کر سر جھکایا۔ ”حالانکہ مجھے اتنی شہِ مندی سی تھی کہ میں کا کا کو

LET DOWN کر رہی ہوں۔“

”مائی گڈنس۔“ نوجوان نے دہرایا۔ پھر اس نے آگے جھج کر پوچھا۔ ”اب بتلا دو ہم

سے کیوں خفا تھیں۔ ہمارے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی تھیں؟

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اٹھا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ "اس پر سکون چہ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت سارے دیس میں آگ لگ رہی ہے۔ اس نے طول آواز میں آ رطکی جا کر سرچ لائٹ کے نزدیک کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی اس کے برابر آ گیا۔
"شاید میں بزدل ہو گئی ہوں۔" رطکی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
وہ خاموش رہا۔ سرچ لائٹ دریا پر روشنی کا ایک اور دریا بنا رہی تھی۔
"آپ کتنے دن رہیں گے؟"

"پتہ نہیں۔ جتنے دن بھی لگ جائیں۔ معاملات کافی گنجلک ہیں۔ مسلم لیگ ایک عوامی تہ بن چکی ہے، اس کی تی طاقت کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی۔"

بوڑھے ناخدا نے کان کھٹے کئے۔ اور ذرا نزدیک ہو کر دلچسپی سے بات سننے لگا۔ اور ایک دفعہ کہنے لگا۔ نوجوان نے مسکرا کر اسے "سلام علیکم" کہا اور بات جاری رکھی۔ "بتکمال مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ یہاں کی مسلم جغرافیہ پر وگرنہ سویڈن رشپ کی منتظر ہے۔"
"نواب لوگ تو پروگریسو لیڈر نہیں ہیں۔"

"پروگریسو لیڈر رشپ ہماری ہوگی۔ ہمیں لیگ کے قریب آنا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی میں آج آگست ۲۲ء کی اس رات کر رہا ہوں۔ گمہ میں باندھ لو!"

نواب قمر الزماں۔۔۔ یہ ارجمند منزل جائے گا۔ اور جہنم منزل جائے گا۔۔۔ اس کا دل ذرا فور سے دھڑکنے لگا۔ وہ رینگ پھجک کر نیچے لہروں کو تانے لگی۔ پچھلے سال جولائی کی اس رات سبزی سدن میں جو وعدہ میں نے اپنے آپ سے کیا تھا اس پر قائم نہ رہی۔ اُسے چمکے سرا آ گیا۔ اس نے جنگلہ مضبوط سے پکڑ لیا۔ جنگلہ کا لوہا بالکل سچ تھا۔ میں نے ساری رات اس سے باتیں کرنے میں گزار دی۔ اب نہیں اب کچھ نہیں۔ اب اٹنڈہ بالکل پہچان کرنے میں آئی۔ آخر سال بھر تک کس مضبوطی اور بے جگری سے اپنے وعدے پر قائم رہی ہوں کہ نہیں۔ ایک سال گزر گیا۔ اس طرح باقی عمر بھی گزر جائے گی۔ اب نہیں یہ آخری ملاقات ہے۔ دیکھ لینا۔

بوڑھا پیٹے پر جھک چکا تھا، اسٹیم تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

”وٹھا کے میں آپ کہاں ٹہرے ہیں۔ لڑکی نے بالکل نارمل آواز میں دریافت کیا۔
 ”اُوا کے ہاں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک زمانہ تھا کہ ووڈ لینڈ میں ہمارے فرشتے تک۔ بیٹھا سکتے
 تھے۔ نہیں خیر۔ ہمارا ایک فرشتہ تو بھٹکا تھا۔“ اس نے پیار سے لڑکی کے بالوں کو چھوا۔ وہ قہقہہ لگا کر
 پرے سرک گئی۔ وہ کہتا رہا۔

”اب ہم مزے سے عین سرپری توش رائے کے گیسٹ روم میں ڈٹے ہوئے ہیں۔! اُوا سے تم کب
 سے نہیں ملیں؟“

”مذمتیں ہو گئیں۔“

”آہ ان سے ملنے۔ وہ دلی سے میرے ساتھ ہی آئی ہیں آج کل ان کے والدین کلکتے گئے ہوئے ہیں اس
 لئے سارے دوستوں کا اڈھلے فکری سے وہیں ہوتا ہے۔“

”دلی میں آپ اسپرین ہوٹل میں ٹہرے تھے؟“

”ہم۔۔۔؟ نہیں تو۔ اُوا وہاں مقیم تھیں۔ ہم ایک دوست کے یہاں تھے، کیوں؟ تم کو کیسے
 معلوم ہوا؟“

”آکاش بانی آئی تھی۔۔۔“ لڑکی نے خشکی سے جواب دیا۔ زحوان نے اسے غور سے دیکھا۔

”تم واقعی بدل گئی ہو۔۔۔ ایک سال میں بدل گئی ہو۔ تم میں تعجبی آگئی ہے۔ تم اتنی سیدھی مانتی

بھولی تھیں، تمہیں کیا ہو گیا۔ کون تمہاری اس تبدیلی کا ذمے دار ہے؟ اس نے بجا جت سے کہا۔

ماں۔ مجھے مضبوط بنانا مجھے فولاد کی طرح مضبوط بنا۔ لڑکی آنکھیں میچ کر دوسری طرف دیکھنے

لگی۔ لیکن ہر سمت دریا کا دھندلا طاری تھا۔

”تم دن بھر گھر پر رہتی ہو؟“

”جی ہاں۔“

”میں کسی وقت تمہارے ہاں آسکتا ہوں؟“

”کسی وقت نہیں۔“

”کیسے؟“

”یہ ہے۔ میری مہربانی۔“

”اچھا۔“

اسٹیمراب دیا کے موڑ سے گزر چکا تھا۔ ملاح نے بہتہ گھمانا ختم کر دیا۔ سامنے روشنی کا راستہ ہے حد وسیع ہو گیا۔ وہ دونوں جنگلے پر جھکے دریا کی منور لہروں کو تلکے رہے۔ گہرا سلام دیا۔ منور پانی، حد نظر تک روشن۔ چاروں گھونٹ پانی۔ ابتدا میں خلا تھا، اور تاریکی اور خدا کی روح پانیوں پر ڈولتی تھی۔ یہ تخلیق کائنات کی رات تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ شعفا اچھی ہے، اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جدا کیا۔

اور آدم و حوا کو بنایا۔ اور ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ (آدم و حوا، اسٹیم کے جنگلے پر جھکے کھڑے ہیں، استعماعے کو اور آگے لے جاؤں تو یہ بزرگ کپتان حضرت نوح ہیں جو ہم دونوں کو نہ جانے کون سے امانات کی سمت لئے جا رہے ہیں۔ نوجوان زیر لب مسکرایا)

روشنی اور تاریکی، موت و حیات، دکھ اور سکھ، فراق اور وصال، جنوں اور خرد — سسگم تو گواند گھاٹ سے پرے، بہت دور رہ گیا۔ گنگا اور برہم پتر کی لہروں سے بنایا دیا — اس کے پانیوں میں گنگا کون سما ہے اور برہم پتر کون ہے؟

لڑکی کو زور کی چھینک آئی۔ وہ اس کی طرف ہڑا۔ وہ سوں سوں کر رہی تھی۔

”تمہیں سردی لگ جائے گی۔ چلو اندر چلیں۔“ نوجوان نے سخت کر چو کر کہا۔

”نہیں۔ میں تو ہمیں کھڑی رہوں گی۔“ لڑکی نے ضد سے جواب دیا۔ پھر وہ ایک دم کھل کھلا

کر پھرنے لگی۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو گئی۔ وہ اسے ہنستا دیکھ کر مسرور ہوا۔ اور خود بھی ہنسنے لگا کر پھرنے لگا پھر اس نے آہستہ سے زینلگ پر رکھے ہوئے لڑکی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

لڑکی نے اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا۔

ساحل بیتیاں دھندلے میں ٹمٹما کر گزر چکی تھیں۔ زرائن گنج کی روشنیاں غریب آتی گئیں۔ اسٹیم

مصرف بندرگاہ کے اجلے میں داخل ہوا۔ زرائن گنج سامنے جگمگا رہا تھا۔ زرائن گنج — اس کی گلیوں

کی نہروں پر چلتی کشتیاں، جوٹ، اسٹیشن، گہما گہمی، باہر اندھیرے میں چھپی کچی سڑکیں، نیم شدہ مینل پل،

کھیت، طویل اندھیری شاہراہ جس کے سرے پر ڈھاکہ ہمیشہ کی طرح منتظر طے کا شیفق، محفوظ، ماسٹون ہر

دنیا مترزلزل ہو چکی تھی، مگر شاید موجود تھی۔ مسرت کا وجود بھی تھا۔ ملنا ممکن تھا۔ آخر دنیا

وایسے لوگ بھی تو موجود ہوں گے جنہیں چین اور خوشی میسر ہے؛ اور سرت کے حصول میں خود غرضی گناہ

لڑکی نے ہوسے بچنے کے لئے کھادی سداک کی ددہری چادر مضبوطی سے اپنے شانوں کے روپیت لی۔

۲۴ چارلس بارلو، بنگال سوئین

”نعمتِ ہند از الفِ حمیم
پیارے بیٹے تم کے لئے۔ انیسویں سالگرہ پر

تمہارا ڈیڈ

میمی عکھ، ۱۸۸۶ء

چارلس بارلو نے میر کاگ تپائی پر رکھ کر سنہری جلد کتاب کا احتیاط سے ورق الٹا۔ یہ پوری کتاب تھی جو خود مصنف نے جو ”الفِ حمیم“ کے قلمی نام سے ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی نیٹولائف کے متعلق بید پر لطف اور طنزیہ نظریں لکھا تھا، گرینڈ ڈیڈ کو دی تھی۔ یہ اپنے زمانہ کا مقبول فن ”چیم“ دراصل ۱۵ احصار کا کیپٹن یلڈ صمیم تھا۔ گرینڈ ڈیڈ کا جگری دوست، گرینڈ ڈیڈ ان دنوں ل میں ڈویژنل کمشنر تھے۔ انہوں نے ڈیڈ کو یہ کتاب ان کی سالگرہ پر دی تھی۔ ڈیڈ آکسفورڈ سے بول پر اپنے والدین سے ملا بنگال آئے ہوئے تھے۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے والد کی مانند بنگال میں بننے والے تھے۔

ماضی کی وہ افسانوی ہستی ————— بنگال سوئین!

چارلس بارلو نے اداس، زیر لب تبسم کے ساتھ پہلی نظم پر نظر ڈالی، اس مجموعے میں وہ سارے

کراد موجود تھے جو ماضی کے بنگال سو پلین کی زندگی کا لازمی جزورہ چکے تھے۔

پہلی نظم _____ ریورنڈ مک فرسن کا خیال تھا کہ ”انڈین ناچ“ شیطانی گود کھدھدا ہے۔ ایک مدد راجہ نے ساری بھانڈی کو ناچ کے لئے مدعو کیا۔ باغ مقنوں سے سما گیا۔ سیم صاحبوں کے لئے خمے لگے۔ بڑھیا شربیں، پلاؤ، عطر گلاب، سارا اسٹیشن مدعو تھا۔ ”تاشا شاندہ لوٹ اچھا“ تھا۔ راجہ جھک جھک کر صاحب لوگ کو سلام کرتا۔ عجیب عجیب زیورہ ناک میں پہنے ناچ گر لڑائیں اور ٹوم ٹوم کی جنگی تاں پر تھر کیں۔ سازندوں کے وحشیانہ ساز چینی۔ ان کے جو بیدار عود دان اور مشعلیں سنھالے پیچھے کھڑے تھے۔ جیت رفاہ رانا سا کہہ کر ناچنے لگی۔ ریورنڈ مک فرسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ رانا ایک دیوتہ ہے۔ ورنہ انہیں تعجب نہ ہوتا کہ شیطان کی چلی ایک دیوتا کو پکار رہا ہے۔ ان معاملات سے جو ان کے سرچ سے متعلق نہ تھے، ریورنڈ مک فرسن لاعلم تھے۔

آج بھدر لوگ کی لڑکیاں کلکتہ اور شانتی ٹکمین کے اسٹیج پر ناچ رہی ہیں۔ بے چارے ان چہمہا تم مجھے اپنے بلیر ڈرم، جڑٹ، تسمارک اور فرانکو جزمین دانکی باتیں کرنے والے فوجی افسروں، اپ کٹری، مفضل، بینڈ اسٹینڈ، گزٹ، پامیر، ٹفن اور چھوٹا حاضری کی حکایات سنائے جاؤ۔ کہ اس گشتہ دنیا کے تذکرے سے ہی مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری نظم _____ ”چاندنی رات، جب دور سے نیٹوز کے ٹوم ٹوم کی بھیانگ آواز سنائی دیتی ہے، باتھ کی کھینوں ایسی بھنناہٹ۔ چوکر اسکارلاؤ۔ میں برآمدے میں آرام کر رہی پر بیٹھا ہوں باہر سرد کے دوختوں کے پیچھے سے چاند نکل رہا ہے۔ چوکر شرب انڈیتا ہے۔ اوہ انڈیا! سہانی شاموں کی سوز میں۔ تون پر لڑاں تیری چاندنی، تیری واحد یوانگی نہیں ہے۔“

چارلس بارلونے پلی کی پلی کو آنکھیں بند کر لیں۔ پھر پیر کاگ اٹھا کر ایک صفحہ اور پلٹا۔ ”میرا چالاک منشی محمدین، روزانہ مجھے اوردو پڑھانے آتا۔ گپتی۔ وہ انگریزی بولتا۔ ”نیٹوبات“ بہت کم ہوتی۔ سرکنڈے کے قلم خرید کر لانا اور روز پچار آنے چر لیتا۔ مجھے کتنی نفرت تھی اس درس و تدریس سے، منشی گپتیں ہانگتا اور میں چپ چاپ بیٹھا جڑٹ پیا کرتا۔ مگر جب میں نے امتحان پاس کیا تو ایسی اوردو بولی کہ کوئی سالار جنگ بھی گیا بولے گا۔“

ایک اور نظم _____ ”واجز کر شخا باؤ ڈی دو _____ ہند کے اس خطے میں جہاں تیسگو

جاتی ہے۔ راجہ کرشنا ہاؤسی ڈور رہتا تھا۔ جو اس سال افسوس کہ پرنوک سدھارا، راجہ ان میں سے تھا، اگر جن کانگ صاف ہوتا تو وہ سیدھے سیدھے انگریز بن جاتے۔ اس کی عادتیں صاف ہی تھیں۔ نہ بھنگ پیتا تھا، نہ رخصی کھاتا تھا نہ پان۔ تیس گوبھی میں انگریزی خاصی بولی جاتا تھا۔ پانی " پار ولایت ہوا آتا تھا۔ بلیر ڈھکیلتا تھا اور اپنے ساتھ ولایت سے تصویریں اور (نقلی) کے ہنڈل لایا تھا۔ جو ان احمق عورتوں نے اسے دینے تھے جو ایک دو تین اور تیس کو دیکھ کر خواہ جنباتی ہو جاتی ہیں۔ راجہ پونکا ناچتا تھا چیل کے بجائے بوٹ اور ٹوئیڈ کا سوٹ، اس ج بھی مثالی تھا۔ اپنی ریاست کو تمدن کر چکا تھا۔ ہیلتھ کمیشن، ویسی نیشن، ایڈمنسٹریشن، ریوے تعلیم، یہ اور وہ، اس کی ریاست اتنی عمدہ ہو گئی تھی کہ ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہم کبھی اس کا الحاق نہ کریں۔ لارڈ وائسرائے نے اس سے کہا کہ وہ ہمارا بہترین فرزند و بلند ہے اور ایک ٹیوٹر گولوں کی سلامی کا ہے۔

ار بنایا۔

" راجہ گوتانا مغربی ہو چکا تھا۔ مگر دل سے اصلیت میں ایک دم بلیک نیٹو تھا۔ دھوم دھڑکتے سیا، ہزاروں خوشامدی، حوالی موالی، ناچ گرلز، سازشی مصاحب، بھکاری، پردہت، گھوٹے، اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ گونیوٹ بجانا سیکھ چکا تھا مگر اپنے ملک کے وحشیانہ ڈھول اور بانسری بیج دیتا تھا۔ پلم ہڈنگ کا مداح تھا مگر کرمی اینڈ رائس پر رہتا تھا۔ ان خصائل سے اس کے کردار کی طبی ظاہر ہوتی ہے کہ راجہ کرشنا ہاؤسی ڈور اصل مرتے دم تک اپنے وطن اور اپنے دستور کا

ار رہا۔"

تواریکی صبح تھی، چارلس بارلو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور آرام کرسی پر دراز اطمینان سے اگلا پلٹا۔ کتاب اسے سمیڈ پچسپ معلوم ہو رہی تھی۔

ایک اور نظم " اولڈ ٹائمز لکھتا ہے: فرانس کو معلوم ہونا چاہئے کہ مشرق اولڈ کی ذمہ داری ہے۔ کہ فرانس کے لیے چند نگر اور پانڈیچری ہی کافی ہیں ناقابل یقین! کہ فرانس اہل کی لالچ کرے۔"

پانچ چھ صفحات کے بعد ایک نظم نے چارلس بارلو کو متوجہ کیا۔ "صبح کی شہ سواری جب کے مرغے بانگ دیتے اور گائیں ڈکراتیں، کابل چر دا ہے سو رہے ہوتے، تب میں اور اسمتھ مونسون

کی ہوئی طرح جنگل میں سے گھوڑا دوڑاتے نکل جاتے، مندر، ناقوس پھونکتے برہمن، وحشیانہ جنگ جبار کی یادگار قلعوں کے کھنڈر، گاڑی بانوں کے ہجوم، سیلوں کی گھنٹیاں، پنگھٹ، کسی نیٹورس کی گاڑی، بکوڑا سے، برابر سے گزر جاتے، گھنٹی بجا تا ڈاک کا ہرکارہ چڑے کے تھیلے میں ڈاک لئے پاس سے گزرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اسٹیشن قریب آ رہا ہے، صبح کی بندوق دغتی، منڈی، نیٹو، ہجوم، رنگین پردوں والی پہلی میں سے بجا نکتی ناچ گرز صاحب لوگوں کو دیکھ کر میاںک تپتے لگاتیں۔ پھر ایک صاحب اور اس کی لیڈی گھوڑوں پر گزرتے، دور سے آبادی نظر آتی، مندی، مسجد کے مینار، گنجان نیٹو شہر، دھندلکا، حسین مناظر اور اسمتھ جو اور ٹیل معاملات میں جذباتی نہ تھا کہتا — یہ غلیظ نیٹو شہر تم کو حسین نظارہ معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو —

”صاحب —“ عید الغفور نے اندر کر کہنا چارس بار لو نے کتاب پر سے سراٹھایا عبدالغفور نے تازہ اخباروں کا پلندہ قریب کی میز پر رکھا، اور واپس چلے گئے۔ چارس بار لو نے آگے ٹرھنا شروع کیا۔

”پولس والا زکاڈنر — کلکٹر ک کال، جو نراس کا مغر و کپی ٹیشن والا سب، ٹوم کنز سول اور سٹن ج، ہزم دل ڈاکٹر شاپ سول سر جن حسن نے کالرا کے دنوں میں جب جیل کالرا والوں سے بھر رہا تھا دن رات کام کیا۔ اب ڈنر کے بعد زرا اوگھ رہا ہے۔ ریورنڈ ماٹیکل دانن اداس بیٹھے ہیں۔ یہ سب بڑے معقول لوگ ہیں۔ مگر مجھ پولس والے کو سال میں دو دفعہ ان کی دعوت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ باتیں شروع ہوتی ہیں۔ مونسون آنے والی ہے جانے کب آئے گی۔ دھان کی فصل شاید اس بار بھی فیل ہو جائے، مکال کہتا ہے۔ بارش آنے تو چہے کا شکار شروع ہو۔ پھر شکار کے قصے، لیکن کپی ٹیشن والا شکار کے بجائے ذرا انتلیکچول باتیں کرنا چاہتا ہے۔ شیریں اور جھجر کے بعد خاموشی، بڑے بڑے جڑت سلگائے گئے۔ تاش ہوا۔ ڈاکٹر اب خرائے لے رہا تھا۔ برانڈی پانی کا دور چلا۔ پھر سب ”ڈرٹ کٹ ٹگپ“ سے پور ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے۔“

”اجاڑ بنگلہ —“ سر نکا ٹیم میں، کا دیری کے کنر سے ایک بنگلہ، جس سال ٹیپو گرات سے دیران بڑا ہے۔ باغ نیم درخت آہیں بھرتے ہیں۔ سنگور شور بجاتے ہیں۔ اوبو لیتے ہیں۔ دریا کے کنارے قلو کی فصیل ہے جو اولڈ انگلینڈ کی طاقت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنے والی لسلوں کے لئے ایک سبق، وہ زنا جب ہمارے جرمی جو ان شیریں کچھار تک پہنچ گئے تھے، اور اس بنگلہ کے نزدیک وہ معرکہ ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد اس

ایک اور نظم ————— "انگلینڈ ہو۔! بمبئی کی بندرگاہ پر سورج چمک رہا ہے۔ گیلے
 ٹرڈ پر گھڑیاں پر میری رحمت واپس جا رہی ہے۔ گیاہ برس بعد ہم چھ سو آئے تھے، تین سو واپس جو
 رہے ہیں۔ باقی وباؤں نے کھائے۔ مشرق پر حکومت کی قیمت ہم بیماری اور موت کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔
 ہندوستان نیلا ہٹ میں ڈوب رہا ہے، جہاں میرے تین سو دوستوں کی قبریں ہیں۔ میں اپنا ٹوپ پھٹاتا ہوں،
 ہم گھر جا رہے ہیں، ہم ہند کو بھول جائیں گے، خدا حافظ دو ستو، وباؤں نے تمہیں کھایا۔ انگلستان
 خاطر تم نے اپنی جانیں دیں۔ الوداع۔ سورج کے دیس، ہماری جلا وطنی ختم ہوئی۔

انگلی نظم ————— "اوٹی میں پھلتے ہوئے کونسل کا ممبر پیٹر اسٹریٹ جان مک ڈوسے کہتا
 — پیٹر ہم کو خدا نے یہ ملک اس لئے دیا تھا کہ ہم اسے تمدن بنائیں، اور جب ہمارا یہ ارفع مشن ختم ہو جا
 تو واپس چلے جائیں۔ لیکن ہم کرکرا رہے ہیں؟ ہم نٹوز کو کالج جانے کے لئے کہتے ہیں، اور پھر ان کو ایسی نو
 دیتے ہیں، جنہ کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہم انہیں شراب نوشی کو منس کرتے ہیں، مگر انہوں کی کاشت کو
 ہیں۔ ہم کہتے ہیں تم فکر لوگ اپنی عورتوں کو آزادی دو، اور وہ پوچھتے ہیں کیوں؟ اور طنز سے ہماری خول
 کی آزادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پیٹر اسٹریٹ جب ہوا اپنی طرف کیوں گویا یا نڈر نٹو جٹلمین سے شاد
 کرنے کی اجازت دیں، جب با اثر با بولوں کو معقول عہدے دیں، کونسل والوں کی تنخواہیں کم کر
 تب ہی اس ذمہ داری کو نبھاسکیں گے، جو خدا نے ہمارے کندھوں پر ڈال ہے۔

"تب پیٹر اسٹریٹ نے کہا: تمہارا یہ پروگرام ممکن ہے بہت خوشگوار ہو، مگر مجھے تو سہ
 بجو اس معلوم ہوتی ہے تمہا پنے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں ہم کچھ عرصے کے لئے اس ملک کے این ہیں۔
 جناب مائی حقیقت یہ ہے کہ جب تک ممکن ہوگا ہم اس کو اپنے قبضے میں رکھیں گے۔"
 "بہتیر آگے جاؤ۔"

"ہمیشی ڈمٹی فرمٹی چندر عاقل برہمن زمانے کی ترقی سے نالاں اور تھیر تھا۔ کیا ویدوں اور شاس
 میں پہلے سے سارا علم موجود نہیں؟ مصالحن ماضی سے مستغفر ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن توڑنا چاہتے
 فرنگی استادوں اور ان کی ایجوکیشن گرانٹس پر لعنت! انھیں کیا معلوم ہندو کی ضروریات کیا ہیں؟ ان ہ
 سماجیوں پر لعنت جو کہتے ہیں خدا کا میدان بہت وسیع ہے کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہی سب لو
 کا راج میں پڑھتے ہیں۔ یہی بات کیشپ چندر سین کہتا ہے۔"

بابو نیل بمل بندر بھی ایک برہمن تھا۔ مگھو ترقی کا جو شیوا حامی۔ وہ اور چند رشام کو دروازہ میں حقہ پیتے اور باتیں کرتے۔ بازار کا بھاؤ، چاول کی قیمت اور کبھی کبھی زیادہ سنجیدہ موضوع، ذاتِ دھرم وغیرہ اور اپنے متضاد خیالات پر بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز بندر نے کہا۔

ایک دھوا سے بیاہ کرنے والا ہوں۔

”گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ حقہ پانی بند کر دیا جائے گا“ چندر نے کہا۔

”زمانہ بدل چکا ہے، اب تہذیب ہمیں نئے راستے دکھا رہی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں ہندوستان کا نعرو ہے۔ ہمیشہ آگے جاؤ۔ بندر بولا۔

”بکواس۔“ چندر نے چار جھنجھال کر کہا۔ برہمن ہوتم؟ غدار؟ دھوا سے بیاہ؟ لعنت ہو! کرا اس نے بندر کی چپٹ پر ٹھوک لگائی تو وہ نیچے ہتی گندی نالی میں جاگری۔ بندر نے چندر۔ دبوچ لی۔ دونوں چیخنے چلاتے ایک دوسرے کو زد و کوب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک انگریز فوجی نے ان کو چھڑایا اور چوکی لے گیا۔ اور ان کے احتجاج پر محض اتنا کہا ”آگے جاؤ۔“

چارلس بارلو میساختہ ہنس پڑا۔ یہ بنگالی کی سچی تصویر تھی، لیکن ”سر علی بابا“ نے بابو کے متعلق جو ذہنی کی تھی وہ بھی آج لفظ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ بابو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے مر کے اب دولتی جھاڑ رہا تھا۔ چارلس بارلو نے کاہلی سے سرٹھا کر الماریوں پر نظر ڈالی لیکن اسے ”سر علی بابا کا سفر نامہ“ میں گزریں ڈیڈ نے نواب انوار الزماں کو تحفہ دیا تھا۔

گریڈ ڈیڈ، ڈیڈ۔ ماد دونوں چچا سڈنی اور کرسٹوفر۔ پھر گریڈ آنت میں۔ آنت ماڈم آنت۔ ن۔ آنت میسلڈا۔ خالص وکٹورین نام۔ بھولی بڑو غلط وکٹورین ہستیاں۔ پورا بارلو اسڈی کے آتش دان اور دیواروں پر اپنی اپنی تصویروں کے بیش قیمت چوکھٹوں کے اندر محفوظ وجود تھا۔

جبکہ باہر دور دور بچھٹ رہے تھے۔

گریڈ ڈیڈ اور ڈیڈ سلطنت کی اس تباہی پر اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ رکھلنا کے انگریزی قبرستان، بارش میں بھیکتے کتبے، قبروں کے کتبے، سارا ہندوستان انگریزوں کے زیر قبضہ ہے اپنی جانیں دے کر ہم نے اس ملک کو سنوارا۔

گرینڈ ڈیڈ سیسی بری سے ٹریننگ لے کر اٹلیہ آئے تھے۔ انہوں نے ایڈمنسٹریشن میں ان سے ٹریننگ لی تھی، جن کی اپنی جوانی میں محمد رضا خاں اور شتاب رائے زندہ تھے۔ کلاویو، ہیسٹنگز، کارنوالس، ولیم ہینٹنگ، میکالے —

کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی بیڑھیوا سویٹیز نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔ ملٹی وھوپ، لو، بارشوں، سیلابوں کی پرولے بغیر سینکڑوں میل کے فاصلے گھوڑوں، پالیکیوں اور کشتیوں کے ذریعہ طے کر کے یہ عظیم آراہنی کا بندوبست کرتے، مقدمے فیصل کرتے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کسانوں کی فریادیں سننے ان کو مائی باپ کہتے، کمپنی کے اولین دور میں بے رنگ کرپشن تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد — اور اگر اس ملک کی پرانی روایت نہیں تھی؟ نذرانہ اور رشوت؟ اب پہلی بار اہل ہند کو احساس ہوا ہے کہ اور صوبائی حکومت قتل و غارت، لوٹ مار اور زبردستی کا نام نہیں، بلکہ یہ رعایا کی بھلائی اور کئے لئے قائم ہے، مغلوں کا ایڈمنسٹریشن — اور کسفر ڈیم وہ مسعود علی سے بحث کیا کرتا اشوک، شیر شاہ، اکبر — ٹھیک ہے۔ مگر ان کے بعد؟ اور یہ لوگ بھی قانون کے تقہ نا آشنا تھے۔ سارا مشرق قانون کے تصور سے نا آشنا ہے۔

سلطنتِ روم کی وارث مسیحی یورپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی بار ہند کو قانون عطا کیا۔

اولڈ کارنوالس نے تھانوں اور پولس چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ کلیولینڈ نے آدی باہ کو انسان بنایا۔ اٹھارویں صدی میں جیسور کا ایک کلکٹر نیکل اس قدر شفیق تھا کہ عوام نے اس کی بنا کر اس کی پوجا کی۔ نکلتسن کو پنجاب کے کسان پیار سے نیکل سائیں کہتے تھے۔ جو ناہن ڈنگن میں دختر کشی کے خلاف ہم شروع کی۔ جیمز گرانٹ نے دن رات کی انتھاک محنت کے بعد ایک دیا اور انصاف پسند ایڈمنسٹریشن قائم کیا۔ یہ دو تئیس سال کی قربانیاں، عرق ریزیاں، جانفشانیاں رائیگاں جائیں گی —؟ اس عظیم کارنامے ”برطانوی ہند“ کو ہم لاقانونیت اور جذباتی حوالے کرویں گے؟ کورٹ انڈیا ان ڈیڈ —!

اٹلیا ہے کہاں؟ تہرو کے شاعرانہ تخیل میں۔ انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔!

اکوشش کی ٹریفیل ہو گیا) ادراپ واقعی اُسے ہم نے متحد کیا ہے۔ پنجاب میں مقیم لیڈری وٹسن نے
 ۱۸۸۱ء میں کھینچی تھی قلم ہاتھ
 ری کو توڑے۔ ان سب کا بیرونی اتحاد محض برطانوی برہم کے ذریعے قائم ہے۔
 گرینڈ ڈیڈ اپنی اس تصویر میں جو شملہ کے ایک مشہور فوٹو گرافر نے ۱۸۸۱ء میں کھینچی تھی قلم ہاتھ
 کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ گرینڈ ڈیڈ — ایڈورڈ بارلو، برطانوی
 کی اس شاندار روایت کی ایک مثال تھے جنہوں نے اپنی شدید مصروف زندگی کے باوجود اس
 باب میں ہزار ہا محققانہ اور عالمانہ کتابیں لکھیں۔ یہ ہندوستانی جو آج کل "انڈین کلچر" کا نعرہ
 لے رہے ہیں۔ ان کی یہ "انڈین کلچر" ان ہی بیچارے وکٹورین بڑھوں نے دریافت کر کے دنیا کے سامنے
 رکھی۔ آج ہم ان وکٹورین بڑھوں کو بددماغ، برخور غلط، سمجھتے ہیں۔ اور غالباً وہ ایسے تھے
 یا قدیم رومن باقی دنیا کو وحشی نہیں سمجھتے تھے؟ انیسویں صدی کے برطانیہ کا ایک فرد ہونا
 توڑا ہی رہا ہوگا۔ برٹش امپائر — پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ عظیم الشان
 سلطنت پہلے کبھی قائم نہ ہوئی تھی! چنانچہ یہ بڑھے۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ اور ان کے ساتھی
 غ اور ذرا خبیثی سے تھے۔ مگر کیا دولت اور طاقت کے بل بوتے پر امریکہ بددماغ اور بر خود
 بن ہو گیا؟ اور مزید ہوتا جائے گا — جب کہ اس کے پاس تہذیب بھی نہیں ہے؛
 امریکہ — ڈائلٹ — ڈائلٹ اس وقت کیا کر رہی ہوگی۔ تمہاری صحت
 — چارلس بارلو نے مگ اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔ پھر ایڈورڈ بارلو کی تصویر
 ما۔

گرینڈ ڈیڈ، پر کا قسم ہاتھ میں لے، سیاہ روشنی ڈورے والی عینک لگائے شمت کی
 سے کیا لکھ رہے ہو — ؟
 گرینڈ ڈیڈ نے بنگال کے کتنے اضلاع کے امپیریل گزٹریٹرز پر کام کیا تھا۔ شام کو تھکے ہونے
 سے لوٹ کر کھوس کے چھپروالے کسی بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر، لمب کی روشنی میں تم یہ سب
 تے ہو گے۔ چوکر۔ سگار لاؤ۔ چاند نکلتا ہوگا۔ مچھر بھناتے ہوں گے۔ تم تنہا بنگلے میں بیٹھے
 گزٹریٹری جلدوں میں ایک جلد ایک باب کا اضافہ کرنے میں جڑے رہتے ہو گے۔ اور آسام کے

ناگابائل " گرینڈ ڈیڈ کی مشہور کتاب تھی۔

برابری تصویر میں گرینڈ ما بھی ہیں۔ اونچا سا جوڑا باندھے۔ درشت چہرہ۔ سیاہ گاہک ہندوستان میں برطانوی سوسائٹی کی ایک فراموش شدہ ستون۔ ان کے برابر ہی گریت آئٹ کی تصویر رکھی ہے۔ (بوڑھا وفادار عبدالغفور جو تلم کینٹ ویل سے ترکے میں ملا ہے، کس اعتبار خیال سے روزانہ ان ساری تصویروں کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے) گریت آئٹ میں جو گرینڈ ڈیڈ تھیں۔ انہوں نے ساری زندگی چرچ آف انگلینڈ کی "زناہ مشنری سوسائٹی" کا کام کرنے میں ہی کر دی۔ جو ڈیڈ بتاتے تھے۔ ایک روز گواندو گھاٹ سے تن تنہا اسٹیمر پر بیٹھیں اور دروازہ مغربی سوئیٹ کے ایک دروازہ ضلع میں مشن قائم کرنے کے لئے یسوع کا نام لے کر چل پڑ گواندو سے موٹھیر۔ بیٹنہ۔ بکسر۔ غازی پور۔ بنارس۔ (ہر نام کا اپنا رومان تھا) بنارس خرفناک صنم کدے سے وہ اودھ کے شہر سیتاپور پہنچیں۔ وہاں مشن کیا ونڈ میں اسکول اور ہسپتال قائم کیا۔ اور بیجاری جوانی کے عالم ہی میں وہاں پہنچے کاشکار ہو گئیں۔ آج کی یہ تعلیم یافتہ قوم ہندوستان کی لڑکیاں آئٹ میں جیسی بہادر عورتوں کی مشکر گزار ہیں جنہوں نے تعلیم کی روشنی تک پہنچائی ہے۔

کوئٹہ انڈیا! بلای فونلز

اب چارلس بارلو کا سر بیجاری ما ہور ہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا تنہ میں مجھ پر ماضی کی یاد کے دور سے نیا دہ چرنے لگے ہیں ماور یہ اچھی بات نہیں۔ ڈیڈ کا آئل پورٹریٹ۔ جو لندن کے کسی دوسرے درجے کے معتمد نے ۱۹۰۷ء میں بنایا تھا تھوڑے سے ڈینڈی تھے۔ ایلن ٹیری اور واسکرو ایڈلڈ اور آبری بیرڈز لے کے دور کے فیشن اسل ٹو جو جب فرلو پر لندن جاتے تو اپنا سا رادقت فقیر اور اوپیرا اور سیلے میں گزارتے "NINETIES" کے ہنگاموں کے رسیا۔ واپس آتے اور بنگال اور اٹلیہ کے غیر دلچسپ پس ماندہ اضلاع میں اپنے فرائنڈ میں جٹ جاتے مگر اپنے لندن کے انٹلکچوئیل دوستوں سے خط و کتابت جاری رکھتے۔ کتنے برطانو صحافیوں اور شعاعوں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ڈیڈ کو علم نباتات کا شوق تھا۔ انہوں نے بھی گر ڈیڈ کی مانند ہندوستان کے حلق لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ آسام کے اور کئی ان گنت اقد

بنائیں اور بنگال اٹلیسہ اور آسام کے پودوں اور پھولوں اور درختوں پر ایک مستند اور ضخیم کتاب
الی۔

ڈیڈ کتاب لکھتے تھے اور مہاجنہوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ تک پیرس میں مصوری سیکھی
، ان پھولوں اور پتوں کے انتہائی سبک اور نفیس اسکیچ بناتیں۔
مہاجنہ کی تصویر۔ صوفیہ پر بیٹھی ہیں۔ ڈیڈ کچھ کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اس تصویر میں ڈیڈ کی کمرز
کی موٹھیں ہیں، مہاجنہ کی تازہ ترین فیشن کے گاؤں میں ملبوس ہیں۔
یہ لوگ سب مر گئے۔

گرینڈ ڈیڈ نے اپنے ہندو بنگالی منشی سے فارسی پڑھی تھی، اور سبکلا جانتے تھے۔ ڈیڈ بھی
سے واقف تھے۔ ریشٹرا ہونے کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لندن میں انٹیا آفس لائبریری
مرتب کریں گے۔ مگر لندن جانے سے پہلے ہی وہ سندھ بن میں شیر کاٹھا رہ گئے۔
ان سے گاؤں والوں نے درخواست کی تھی کہ اس آدم غور شیر سے پھانسی جو بہت سارے کلڑاڑوں
ار کر چکا تھا۔ ڈیڈ نے غوفی سے بندوق سنبھال کر اسے مارنے کے لئے اندھیرے جنگل میں گھسے اور زندہ کاپا
ع۔

انہوں نے اپنی قیمتی جان دی تاکہ یہ نیم وحشی کلڑاڑے زندہ رہیں۔

گرینڈ ڈیڈ کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا۔ جب بنگال میں قتل و غارت شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے
لمبی عمر پائی۔ نوجوان وکٹوریہ کی تخت نشینی برکینی کی ملازمت۔ غدر، وکٹوریہ کی موت اور آخری میں خودکشی
سب ہی کچھ دیکھ لیا۔ ان کو نیشن لیتے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ ریشٹرا ہونے کے بعد وطن واپس نہیں لوٹے،
دارجلنگ اور کلکتے میں سید خوجا بھورٹ کوٹھیاں بنوائی تھیں اور اپنا وقت علمی مصروفیات میں صرف کرتے
کلکتہ یونیورسٹی کی سینٹ۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ یہ اور وہ۔ چند بڑے مصلحین بھی ان کے دوست
کو یہ واقعہ ہے کہ وہ نیوز سے برابری کی سطح پر کھینچے، اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار کاٹ کر رکھی۔
رکی سلامتی اسی میں مضمر تھی۔

گرینڈ ڈیڈ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ وکٹوریہ دستور کے مطابق بہت بڑا کنہ تھا۔ مگر صرف یہ سنا
دوستان کے طیر یا اور دوسری بیاریوں سے زندہ بچے تھے اور دستور کے مطابق (تاکہ ہندوستانیوں کی بری

خصلتیں دیکھ میں، چھ چھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا۔ بڑے ہو کر کے سب سے بڑے بھائی فوجی افسر بن کر ہندوستان وئے، یس کاہل کے مارچ میں کھیت رہے۔ نھیلے نے لٹکائیں چائے کی کاشت شروع کی اور وہاں کے معمول پلانٹریئے۔ ڈیڈ جوائن دونوں سے زیادہ ذیہ۔ انڈین سول سروس کے مقابلے میں آگئے اور اس کے فورا بعد ہی ماکو بیاہ کر ہندوستان لوٹے۔

آنٹ ماڈ کی تصویر۔ روکھی پھیکی شخصیت، سفید گاؤن، ہاتھ میں بائبل۔

آنٹ جیرلڈین کی تصویر۔ خوش شکلہ جسم، شرآ نکھیں، فیشن ایس گاؤن، گلے میں موتیوں کا

گلا میں کتا ہاتھ میں پنکھا،

آنٹ میٹلڈا کی تصویر۔ جسم بھولی صورت، یہ تیلوں تصویریں ایک ایک بک شلف پر رکھ

یہ تینوں وکٹورین خواتین ڈیڈ کی بہنیں تھیں۔ تینوں ماڈمیہ کے مختلف اضلاع میں پیدا ہوئیں۔ آنٹ ماڈمیہ

بڑی شادی نہیں کی۔ یہ بھی پھوپھی سیل بارلو کی ماں اور ایل مشرق کی دوسری بیانیے میں جٹی رہیں گریٹ آنٹ میٹلڈا

اس سلسلے میں صرف گواندو گھاٹ سے سینٹا پور تک کا سفر کیا تھا۔ آنٹ ماڈ نے حنیوں کی روحانی نچ

کی خاطر گن بوٹ سیاست اور مشرقی ایشیا کی کولونیل جنگوں کے پرخطر زمانے میں تنہا کیتھی تک کا سفر کیا۔ بر

وہاں رہیں اور ماڈمیہ کی شادی کے زمانے میں جب باغیوں نے ان کے مشن پکساؤنڈ پر حملہ کیا۔ وہ چند برطانوی

بلیچیں اور امریکن مشنری خواتین سمیت جینزس کی خاطر شہید ہوئیں۔ سرزمین چین میں ان کی قبر بنی۔

آنٹ جیرلڈین۔ خوب صورت اور ظرٹ۔ لندن میں ایک بیسٹرس سے شادی کر لی۔ آنٹ

میٹلڈا بھی خوب صورت اور پیاری سی تھیں۔ ڈیڈ کی پسندیدہ بہن۔ دارجلنگ میں ایک فوجی افسر (بنگال لائ

ان پر عاشق ہوا۔ مگر سنگی کے بعد ان کو دفاع کو بھاگ گیا۔ دل شکستہ آنٹ میٹلڈا ابھی مذہب کی طرف راعز

ہوئیں۔ گارولڈز میں نیا مشن کھولا، گریڈ ڈیڈ کو ناگاکا قبائل سے بہت محبت تھی، انہوں نے آنٹ میٹلڈا کی ہم

افزائی کی۔ آنٹ میٹلڈا اب پورھی ہو چکی ہیں اور لندن میں آبائی مکان میں رہتی ہیں۔

ڈیڈ اور ماکے ہاں تین بچے زندہ رہے۔ ایلس۔ چارلس اور رچرڈ۔ وہ تینوں بھی چین میں

بمب دینے گئے۔

ایلس بارلو عجیب بات ہے۔ وکٹورین انگلستان مذہبی نہیں تھا۔ انگریز زیادہ مذہب پر

کبھی نہیں رہا۔ مگر مشرق میں آکر سب پر مذہب کا جوش سوار ہو جاتا تھا غالباً یہاں کے عجیب و غریب لیکن د

اہب سے غیر شعوری مدافعت۔ ایس کو مشنری بننے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایس جدید زمانے کی لڑکی تھی۔ کوئی درمیشہ اختیار کر سکتی تھی۔ اسے گریٹ آئنٹ میں اور آئنٹ، ماڈرن آئنٹ، میٹلڈا کی روایات سے متاثر ہونے کی ضرورت یا تھی، یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ غریب ایس شادی کر سکتی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل تھی پھر بھی یقیناً اس کی شکل دسکتی تھی۔ وہ کھیلے بیس برس سے گارڈ کی پہاڑیوں میں، آئنٹ میٹلڈا کا ٹائم کیا ہوا مشن جلا رہی ہے۔ ناکا قبائل اس کی ساری کائنات ہیں۔

مشنری عورتوں کو اس ایثار اور قربانی کا صلہ کیا ملتا ہے؟ افریقہ کے جنگل، ایشیا کے جنگل، صائب، پریشانیوں اور آخر میں تنہائی اور بڑھاپا۔ یا کسی وحشی کے ہاتھوں موت۔ کیوں؟ ایسا یہ لگ کیوں کرتی ہیں؟ کیا ان کو واقعی یقین ہے کہ آسمانی بادشاہت ملے گی؟

بارتو خواتین کا تو دہر حال سینٹ پیٹر استقبال کرتے کرتے بولا جائیں گے۔ میس۔ ماڈ۔ میٹلڈا۔ ایس۔ چارلس بارلو کرے کا چکر لگا کر پھر اپنی آرام کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ اتنی دیر سے اپنے خاندانی تصاویر مطالعہ کر رہا تھا، مگر ایک گروپ فوٹو جو اس کے ساگوان کے ڈیسک پر رکھا تھا۔ اس کی طرف سے اس کے نظریں چرائیں۔ وہ تینوں اسے زور زور سے پکار رہے تھے۔ اس کی بیوی ڈائلٹ۔ اس کے بچے ٹام۔ بریکر۔ وہ تینوں اس وقت ڈھاکے سے ہزاروں میل دور جنگ کے ہییب شعلوں میں گھرے انگلستان موجود تھے۔

بوڑھی اور مہار آئنٹ میٹلڈا بھی جو ۱۹۴۰ء کی بلٹزر کے زمانے میں اطمینان سے اپنے پننگ پر سویا رہی تھیں (وائٹ نے لکھا تھا)

آبائی مکان کی تصویر۔ ۱۴۔ اینڈریوز کر سینٹ۔ (یہ تصویر بہت چھوٹی سی ہے اور تمام نے اپنے بے بی براڈنی سے کھینچ کر اسے بھیجی تھی۔ آئنٹ میٹلڈا پورچ کی بیڑھیوں پر بتی گود میں لئے کھڑی ہیں۔ گیرل۔ ریب ہی کتے سے کھیل رہی ہے (وائٹ تصویر میں نہیں ہے)۔ یہ تصویر لکھنے کی میز پر بلا ٹنگ پیڈ کے کونے ماڈھی ہوئی دو سال سے اسی طرح رکھی ہے، اس دو سال میں لندن بر کیا قیامت گذر گئی۔

آبائی مکان۔ ریجنسی طرز کا یہ مکان گریٹ ڈیڈ کے واند نے جو سٹی میں سولسٹر تھے ۱۸۱۳ء میں خریدا

ما

مکانوں کی زندگی۔ انسانوں کی زندگی۔

اب میں پھر ماضی کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ چارلس بارلو نے لباس اس بھر کر "نغماتِ ہند" دوبارہ اٹھالی۔ کتاب کے پہلے ورقوں میں سے جو پرانی ہلک آ رہی تھی وہ اسے بہت اطمینان بخش معلوم ہوئی۔ ماضی محفوظ ہے۔

یورپین اور امریکن ہمیشہ متعجب رہتے ہیں کہ انگریز اتنا غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اتنا ماضی پرست کیوں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم لوگ کتنے جذباتی ہیں اور دوسری بات یہ — اس نے ہوتن سے لگ میں بیر انڈیٹی — کہ ہمارا ایسا ماضی اور کسی قوم کا ہے ہی نہیں۔ لاجواب، بے مثال، درخشاں۔ ایسا درخشاں بھی نہیں۔ ذرا ہندوستانوں سے پوچھو۔

دہات دی ہل۔

اب مابے طرح یاد آ رہی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے دائرہ کلڈرائینگ روم میں سب سے ہیں۔ بنگال کے وہ مناظر — سہری پاٹ سے لڑی ہوئی کشتی، دودھند لکے میں مسجد کا مینار اور برگد تلے کھڑا کالا مچھنگ کسان سامنے الماری میں ماکے دائرہ کلڈرائینگ کا البم رکھا ہے اور اس کی بک — دارجلنگ کے چھتھڑوں میں بلوس پہناؤ بچے۔ اور کلڈرائینگ گچھا۔ فرن کے پتے۔ کرشن چوڑا کی شاخ۔ اپنے دفا دار نیٹو طاز مول کے اسٹیج۔ لینے تینوں بچوں کی تصویریں۔ ایس عمر پندرہ سال، چالی عمر گیارہ سال، ڈک عمر دو سال۔

ڈک — ونگ کمانڈر چرچڈ بارلو۔ ڈیلنگ۔ بشاش خوب صورت سہری آر۔ اے، ایف مچھیں۔ یونیفارم پر تنوں کی قطار، یہ ایک اور تصویر ہے جو سامنے میز پر رکھی ہے۔ جسے میں نہیں دیکھا چاہتا ونگ کمانڈر چرچڈ بارلو — میرا نے بنگال سولین ایڈورڈ بارلو مرحوم کا پوتا۔ جیمز بارلو مرحوم کا چچو بیٹا۔ مسٹر چارلس بارلو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مرشد آباد کا چھوٹا بھائی۔ عمر اٹھائیس سال۔ جرمنی پر بمبار طیاروں کی قیادت کرنے کے لئے گیا اور زندہ واپس نہ آیا۔ پچھلے سال اسٹیٹسٹین میں شائع ہوا تھا۔

ماضی کی طرف لوٹو چاہی۔ ماضی محفوظ ہے۔ پراسن۔ پرسکین۔ چارلس بارلو مسٹر لکھنئی سے ہنس پڑا۔ سامنے کے بگ شیلٹ میں پھیلے جنگوں کے متعلق سہری مجلہ کتابیں ایک قطار میں رکھی تھیں۔

فرسٹ اینگلو فرنچ دائرہ کلڈرائینگ، کرناٹک دائرہ، پلاسی، فتح مسولی ٹیم، کبیر، فرسٹ میسور وار، رولر سلیڈ وار، فرسٹ اینگلو مرہٹہ وار، سیکنڈ میسور وار، تھرڈ میسور وار، فورٹھ میسور وار، سکنڈ اینگلو مرہٹہ وار، اینگلو گورکھا دار، پنڈاری دار، تھرڈ اینگلو مرہٹہ وار، فرسٹ برہمپور وار، فرسٹ افغان وار، فرسٹ اینگلو سکھ وار، سیکنڈ

اینگلو سکھ وار، سکندرا اینگلو بریمنڈوار، سنسھال بغاوت، سپاہی میوٹی، موکر انبالہ، بھوٹان وار، سکند
اینگلو افغان وار، تھرڈ اینگلو بریمنڈوار، مئی پور بغاوت، سرحدی بغاوت —
یہ تو صرف پچھلے دو سو سال میں برطانیہ کی مشرقی فتوحات تھیں۔ ہزاروں لاکھوں کرسٹوفر
اور رچرڈ بارلوان معرکوں میں کھیت رہے۔ یورپ کی جنگوں میں کتنے رچرڈ —
”عبد الغفور“ چارلس نے دفعۃً گرج کر آوازی۔

عبد الغفور چند سکند میں نمودار ہوئے۔

”گوسل کا پانی لگاؤ“

”جی صاحب۔“ عبد الغفور غائب ہو گئے۔

بہت خون بہایا میرے آباء نے۔ چارلس نے چیرے پر ہاتھ پھیرا۔ پرانے رومنوں کی مانند، مگر
پرانے رومنوں کی مانند انہوں نے علم دفن کو بھی مالا مال کر دیا۔
مارس اور متروا کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ پرانی کتابیں اور پرانی تصویریں، یادوں کا قبرستان۔

اڑتیس سال میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کیونکہ میری عمر اڑتیس سال نہیں ہے۔ میرے عقیدے کی عمر اڑتیس
سو یا بیس سال ہے۔ ذہنی اعتبار سے ڈھائی ہزار سال، تاریخی اعتبار سے ڈیڑھ ہزار سال اور نسلی یا دماغی
کی عمر کتنے ہزار سال — ہر سوچنے والے یورپین انسان کی یہ سب عمریں ہیں، ہر ہندوستانی کی عمر کتنی
ہے؟ غالباً لامحدود۔

پھر ہم اپنے نام رکھتے ہیں۔ ایڈورڈ، جیمز، چارلس، ٹامس، خاندانی نام باآلو۔ جو ہمیں ایک پرانے
دھند لکے سے جا ملتا ہے اور جس کی وجہ سے ہمیں مستقبل میں بھی اپنے پاؤں جمائے رہنے کی خوشگوار امید ہے۔
یہودیوں اور عربوں کا دستور ہے — فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ کیا خود پسندی ہے۔

سچے گیانی میں اتنی خودی بھی نہیں کہ وہ اپنا نام تک مکھے۔ کس اپنشد میں ہے؟

ڈیڈ بتاتے تھے کہ موتیرو کمیز نے کسی گاؤں کے برہمنوں سے دستخط کرنے کے لئے کہا، انہوں نے

جواب میں صرف نمٹو جھگوتے اور ادم لکھ دیا —

”صاحب پانی تیا ہے۔“ عبد الغفور نے اطلاع دی اور غائب ہو گئے۔

چارلس مرچھکائے بیٹھا رہا۔

آخر میں سب مر جاتے ہیں۔

ڈیڈ کو ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے پہلے ایڈیشن جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان الماریوں میں وہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ گریٹر ڈیڈ اور ڈیڈ کا کتب خانہ ان کتابوں کے مصنف جان کینی کے افسر، انڈین سول سروس کے افسر، فوجی، ہنٹری، ماہرین تعلیم، پلانٹر، ان کے بھوت پھونس کی چھتوں والے بنگلوں میں اب بھی منڈلا رہے ہوں گے۔

یہ کتابیں۔۔۔ زراعت اور جنگلات۔ آرکیولوجی، رسل و رسائل اور سول انجینئرنگ، تعلیم، ایٹنولوجی اور سوسیولوجی (آسام کے ناگ قبائل از ایڈورڈ بارو آئی، سی، ایس۔ چارلس نے فخر سے سوچا۔ نام۔ مستقبل کے گرد اود کو نون کھدروں میں بہر حال محفوظ رہے گا۔ کتاب کی جلد پر لکھا ہوا نام، اور قبر کا کتبہ۔ نام، قانون، ایڈمنسٹریشن، طب، فلسفہ، نیچرل ہسٹری، سفر نامے، جغرافیہ۔۔۔

کلکتے کا جیمز برنسپ جس نے خروشی میں یونانی نام دریافت کئے اور اشوک کے کتبوں کی عبارت پڑھی کسنگم۔ جان مارشل، جیمز فرگسن، ہویل، گرانٹ ڈن، کرنل ٹاڈ، ولسنٹ اسمتھ، مورلینڈ، جیمز مل، ولن ہیشنگز، ولیم جویز، گریم سلی، چارلس ایلیٹ، ولسن گرنفٹھ، جارج سیل۔ آرٹ ہسٹری، لسانیات، مذاہب۔۔۔

اور وہ دلچسپ ناول جو اب مضحکہ خیز لگتے ہیں، اور جدید ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑ جائیں تو وہ ان کو نذر آتش کریں۔ جن کے ہندوستانی کردار "نیٹو اورنگر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ "منٹی (گڈ اولڈ، منٹی) میرن کرافٹ، ماڈر ایمو، کرنل میڈوز ٹائیسلر کے ناول۔ "ایک ٹھگ کے اعترافات"۔ "سیتا"۔ "تارا"۔ "پھوس سلطان"۔ "فلورا اینی اسٹیل"۔ "الین ڈبلیو مین"۔ ہر اسٹیشن کے کلب کی لائبریری میں یہ ناول موجود ہوتے تھے۔

اور بچوں کے لئے کتابیں جو ہم سب نے بچپن میں پڑھیں۔ "ٹیل آر تھر اور اس کا بیرو"۔ "ٹیل آر تھر کی ہسٹری"۔ "ٹیل آر تھر"۔

عذر کے متعلق کتابوں کے انبار، اور پھر کیننگ۔

لاہور اور پشاور کی پراسرار گلیاں، چندو جانے، گنگا داس اور سدھو، اور ولی داد اور لال ٹولہ۔

ہو رکی ملائسن طوائف غالباً کپلنگ کا علاقہ کی کر رہی تھی۔ مغرب کے لئے علامتی کردار۔ ایک خطرناک
 رشتہ بے ایمان مومت۔ ہندوستان۔ جو اگریز اس جادو گرئی کے ہلاکت خیز سحر کا شکار ہوا وہ بہت
 لدا پنا کر داکھو بیٹھا۔ پھینچ رہو گیا۔ اس لئے ہمیشہ الگ تھلگ رہو۔ اس تاریک اور بھیانک جنگل میں ایما پائر
 کے اسٹینڈرڈ کو قائم رکھو۔ (اسی وجہ سے گریڈ ڈیڈ اور گرینڈ ڈیڈ اور مائٹلیمہ اور آسام کے ویران ڈاک
 بنگلوں میں شام کو باقاعدہ اس طرح کپڑے بدلتے تھے گویا لندن کے سولے میں ڈنر کھانے جا رہے ہوں)
 چارلس بارلو اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ ڈی۔ ایمز اوس، اس کے ملازم، اس کا باغ، یہ سب
 بیڑیں اسی مستحکم نظام اور روایات کا ایک جزو ہیں۔ یہ سحر انگیز اینگلو انڈین دنیا جو دو سو سال سے اس ملک میں
 باد ہے۔ اس کے جانے بوجھے کردار اور جزویات، کلکتہ، شملہ، ہل اسٹیشن، مفصل، اضلاع، صوبے،
 صوبے کا سولین خود کو اس صوبے سے ماٹل کرتا تھا۔ پنجاب سولین، سندھ سولین، بنگال سولین، سندھ
 لب، بنگال کلب۔

یہ مضبوط اور مستحکم اینگلو انڈین معاشرہ۔ یہ کسی لفٹ ونگ ہندوستانی انشاپکوسٹیل نے سچ کہا ہے کہ
 لریز ہندوستان کو کٹری اسکو ایریا زمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی صوبے گویا ان انگریز جاگوں کی
 اتی زمینداریاں تھیں۔ جس میں ہم پلہ لوگ یا انسان دوسرے یورپین تھے۔ اہل بھٹانہ ہندوستان میں ملدے
 رنے والے اپنے ہم وطنوں کو "انڈین"۔ "انڈین سولین"۔ "یا" انڈین باکس والا"۔ یا "انڈین آفیسر" کہتے تھے
 ندوستانی محض میٹو تھا۔ اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی بہترب سیاق و سباق میں کیا جائے۔
 "پنجاب کا اولڈ جارج کل مجھے جم خانہ میں ملا تھا۔" بالکل جس طرح ڈیوک اپنی بیستوں سے
 نل کے جاتے ہیں اور جس طرح انگلستان کا کٹری اسکو ایریا اپنی رعیت کا خیال رکھتا تھا۔ اسی شفقت اور
 ال سے ہم لوگ اپنی رعیت سے یہاں پیش آئے۔ زیادہ دلسوزی اور محبت سے، کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرف
 ق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسل بعد نسل ہن سب سولینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم
 لاتی اور روحانی ذمہ داری ان کو سونپی ہے۔ برطانوی ہند کی حکومت! (غدر کے متعلق ہر برٹ ایڈورڈ

، اسیویں صدی میں ہندوستان میں رہنے والے یا یہاں ملازمین کرنے والے انگریزوں کو اینگلو انڈین
 جاتا تھا، مخلوط نسل والا طبقہ "ہات کاسٹ" یا یورپین کہلاتا تھا۔

نے کہا تھا کہ یہ خدانے ہم کو اس غفلت کی سزا دی ہے کہ ہم نے عوام کو عیسائیت کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا اور خدا کی قسم ہم نے اس ذمے داری کو بہت خوب نبھایا۔ ہم تاریخ سے شرمندہ نہیں ہیں۔
کوٹ انڈیا —!

اسی اخلاقی برتری اور دیانت داری کے بل بوتے پر ہم مٹھی بھرا انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اطمینان سے حکومت کر رہے ہیں۔

گو کبھی کبھی ہماری ماؤں کو رات کے وقت ہمیں برآمدوں میں پھردانیوں کے اندر سلاتے ہوئے ایک لخت یہ دہشت آدبوچتی تھی کہ اندھیرے میں سے خود ارمو کر ٹوم ٹوم جاتے ٹیٹو حملہ نہ کر دیں۔ یہ واقعہ ہے کہ خدا کی یاد ہمیں ہمیشہ HAUNT کرتی رہی ہے۔

اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہل ہند برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے کے مقابلے میں انگریز جج کے فیصلے کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے دیوانے بادشاہوں کے زیر حکومت خوش تھے، اصول پرست کشنوں کے زیر نگیں خوش نہیں۔

کوٹ انڈیا —

یقیناً ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں، شاید سامیریلیم بذات خود سب سے بڑا جرم ہے، مگر ہماری جیسی بارکرت امیریلیم۔ ہ فرانس، الینڈا اور مجسم کی کو لو نیوں کی کیا مانگتہ بہ حالت ہے، ناقابل یقین۔

بہر حال "الف حمیم" والا زمانہ قدیم ہوئیں، پچھلی جنگ عظیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

غدر سے پہلے اضلاع میں سوشل زندگی کے مرکز یورپین چرچ اور اسمبلی روز تھے، پولیشن طبقہ

اپنی اچھوت حیثیت پر جانتا تھا اور الگ رہتا تھا۔ پھر یہ اسمبلی روز مہلب عام تبدیل ہوئے۔ ڈانس، بلیڈ، شو تہ

ڈرامے، گریٹ ڈیڈ کا ہندوستان، ڈاک گاڑیاں، کتے گاڑیاں، بگھیاں، پاکلیاں، اپاگی بردار PALANQUIN

BEARER بہرہ بن گیا، کلکتہ کا ایڈن گارڈن جہاں شام کو بیٹھ جتا تھا۔ پارسیوں کی دوکانیں۔

اسی مشن کے چند افسر ایک دوسرے سے ہی ملتے رہتے۔ سیمیں دن بھر ایک دوسرے کو چسپ بھیجا

کرتیں، بچرٹنس، پوپو، شکار، انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان اترا دل چسپ ہو چکا تھا کہ ہوم سے اکثر

لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے، گو ہندوستان سے ان کی مراد یہاں کی برطانوی سوسائٹی تھی۔

جاڑوں میں گریٹڈ ڈیڈ دور سے پر جاتے۔ جب گریٹڈ ڈیڈ اور دوسرے صوبوں میں ان کے ساتھی فاسر پر نکلتے تو عہد رفتہ کے مغل صوبے داروں کے لاؤ لشکر کا گمان ہو سکتا تھا۔ (یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اس سے حکومت جمین کر تریک و احتشام میں ان کی نقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ دائسراے کی شان و شوکت!) بنگال میں کشتیوں اور اسٹیمروں پر اور دوسرے صوبوں میں میل گاڑیوں اور اونٹوں پر لڑ کر سارا ساز و سامان میں ساتھ جاتا۔ بھاری فرنیچر، تصویریں، چاندی کے ظروف، ہر چیز تاکہ سلطنت کے نمائندے کا دبہ۔ جب جنگل اور دیہات میں بھی قائم رہے۔ لشکر میں کتے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سواری کے گھوڑے بہ شامل نہ ہوتا۔ بڑے صاحب کے خیمے قابلین تصویروں اور گلڈانوں سے سجائے جاتے۔ خورد و نوش کی باتیں کے ڈبوں میں بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹورز سے آتیں۔ کچھ فاصلے پر نیٹو افرادوں کے خیمے لگتے اور ماوالے آکر وہاں اپنا بازار لگاتے۔

سال نوپڑ ٹی کمنڈر کا دوبار لگتا۔ دوبار میں زمیندار ندریں ہرش کرتے، جن کو صاحب ماتھ لگا کر واپس آ۔ بڑے صاحب کے دوبار میں کرسی ملنا نیٹو جنٹلمین کے لئے بجد عزت کی بات تھی۔

کلکتے اور شملے میں قیصر کی جرمن ایمپائر کے سفیر رہتے۔ جرمنی اور برطانیہ کی تجارتی جنگ شروع ہو چکی۔ جرمن مصنوعات کی ہندوستانی بازاروں میں ریل پیل تھی لیکن نوآبادیوں سے فائدہ اٹھانے کی اس ریسک ۱۹۱۷ء کی جنگ کی صورت میں روٹا ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔

نیٹو سوسائٹی سے علیحدگی کی ایک فیصل اینگلو انڈیائی نے اپنے گرد کھڑی کر رکھی تھی، مگر خود اس فیصل کے طابزہ عیسیٰ شدید کلاس سسٹم نہیں تھی۔ انڈیا ایک آؤٹ پوسٹ تھا اور یہاں سب کو ایک دوسرے سے مرنا جینا تھا۔ زندگی زیادہ بے تکلف تھی۔ برطانیہ اپنے بہترین نوجوان یہاں حکومت کرنے کے لئے بکروہاں کے بدترین نمونوں کو یہاں قسمت آزمائی کے لئے بھیج دیا جاتا۔ عموماً اونچے خاندانوں کے یہ لڑکے، زیادہ ایڈونچرس ہوتے۔ ملک میں امن و امان، ترقی و خوش حالی کا درد دورہ تھا۔ اور ایک عام ہندو ملک ٹوریہ کو دیوی ماما سمجھنے لگا تھا۔ (مرنے سے پہلے وکٹوریہ نے لارڈ کرزن سے کہا تھا:۔

(BE KIND TO MY POOR INDIA)

اس ملک کی قدیم روایت تھی کہ بادشاہ پر جا کر درشن دیتا تھا۔ اور پر جا اس سے فریادی ہوتی تھی۔ بہ سے اکثر ہندوستانی امرا اپنا سارا اثاثہ فروخت کر کے، مصوبتیں اٹھا کر، اپنے مقدماتوں کی اپیل کے

لئے لندن جلتے تاکہ ملکہ سے خود فریادی ہوں۔ زیادہ تر نامراد لوہتے یا مغرب الوطنی کے عالم میں مرجاتے، ہ کے حکم کی اطاعت اور صاحبان اقدار کا خوف اس ملک کے عوام کی مرشست میں داخل ہے۔ لہذا کیا تعجب ہے کہ اہل ہند ہماری اطاعت گزار رعایا بن گئے اور ملکہ کو اپنی ماں سمجھنے لگے،

غدر کے بعد انٹرین سول سروس قائم ہوئی اور "کمپیٹیشن والا" اینگلو انڈین منظر پر نمودار ہوا۔ مغز خود پسند، سہلی بری کے بجائے اوس برنج کا تعلیم یافتہ، جو "باکس والا" یعنی اپنے ہم قوم تاجر کو بھی ذرا حقیر سمجھتا تھا۔ یہ نیا سولین خاص امپریلسٹ تھا غدر سے پہلے کی زیادہ روادار برطانوی روایات اور ہندو ستا کی اس دلکش نیٹو تہذیب سے بالکل ناواقف جو غدر کے بعد ہمیشہ کے لئے مت گئی۔ ڈیڈیہ نئے سولین تھے اور ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی کی نئی اور شدید کٹر کا مسٹ سٹم کے ایک فرد۔ دنیا کی سب سے بڑا سلطنت کے نمائندے اور دنیا کی ارفع ترین ملازمت کے رکھ، مغزور، خرد مارغ، لیکن جو حقیر لکڑا اردن کی جانیں بچانے کے لئے اطمینان سے لہمہ اجل بن گئے۔ انسانی فطرت کے۔ برطانوی کردار کے یہ تضاد —

چارلس بار لودریچ سے بٹ آیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

شملہ برطانوی دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اضلاع کے کلکٹر اور کمشنر عموماً اپنے اپنے صوبوں کے پہاڑوں پر جاتے تھے، دارجلنگ میں ہماری دلفریب کوٹھی، پہاڑ ہمیں اپنے وطن کے مناظر اپنے وطن کی خوشگوار سرسبز کی یاد دلاتے تھے۔ ہمارے حسب، اسٹیشن، ہمارا پیارا ہندوستان۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم، ہمارے ساری قوم اس ملک کے سحر سے نہیں بچ سکی۔ اس کی گرمی، غلاظت اور کینگی کے باوجود۔

ہماری یہ مخصوص دنیا۔ وطن واپس جلا کر بھی جس کی یاد ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ یہ مخصوص زبان، جو ہم نیشنوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، بندوبست، شاباش، سب برابر، کٹب ماوم ہائے۔ کپڑے اور یوسور۔ شاندار بوٹ اچھا۔ بڑا کھانا۔ بڑا تاشا۔ ایڈورڈ لیر کی نظیں —

بیک وقت نفرت و محبت کا یہ عجیب و غریب رشتہ۔ لارڈ مورے نے صحیح کہا تھا۔ میں مغربی ہوں۔ مشرقی نہیں۔ میں بہت زیادہ مشرقیت کبھی اختیار نہیں کرےکتا۔

یہ بھی واقعہ تھا کہ عموماً انگریز کیمیل جول میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ مہذب تھا۔ ہندوؤں کو ہمارے نرہمی سلوک قدرتی بات ہے کہ بہت برا معلوم ہوا۔

اوسکھڑ میں مسعود علی اور رانا ناتھن سے ہندو مسلم سوال پر کتنی لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ صبح سے تازہ اخبار آئے رکھیں۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ سرخیاں دیکھتے ہوئے آج ڈرک رہا ہے۔ برطانوی ہمت اور بہادری۔

وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ باپ جلیا، اب غسل کے لئے جانا چاہئے۔ مسعود آج کل پنجاب میں کلکٹر ہے۔ رانا ناتھن مراٹھا کنگری میں کہیں تویناٹ ہے۔ دونوں اپنی زبان میں ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی حکومت سے متنفر ہیں۔ اور دونوں کی شدید تمنا تھی کہ آئی سی ایو کے لئے لے جائیں۔ دونوں اس وقت اس برطانوی حکومت کے ارفع ترین ملازمت کے اراکین ہیں۔ اپنے وطنوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور زمین پر قدم نہیں دھرتے۔

آہ — ہندوستانی کردار —! ہندوستانی کردار! مگر وہ انقلابی جو اس حکومت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، مجھے وہ بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ اصلیت غالباً یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نوکر، بھشتی اور خدمت گار دیکھتے سلام کرتے، ہائی، مزید پروہتے، کسان اور جاہل اور قابل رحم ہندوستانی لچھے لگتے ہیں۔ پچھلے دو تین سو سال میں اس سے چین کب اہل مشرق کی پسماندگی اور جہالت کا بھرپور تجربہ کر چکے کے بعد ہم انہیں اپنے جیسا نہ سمجھنے کے لئے غالباً ابھی تیار نہیں۔

جب چارلس بارلو سول سروس میں شامل ہوا اس وقت دہشت پسند تحریک ایک بار پھر پڑھ چکی تھی۔ پچھلی صدی کے لبرل مصلحین کے مقابلے میں سامنے آنے والے جوشیلے قوم پرستوں کی "عوامی جہد" کی اسپن نچلے متوسط طبقے، اور بیکار نوجوانوں میں پھیل چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ یونیورسٹی قائم کیں؟ چارلس نے پاپ سلاگایا اور پھر درجے میں جا کھڑا ہوا۔ دہشت پسند قوم پرست اور ان قوم پرست اور یہ اور وہ۔ اس جوالا کھی پر قابو پا کر اسی سکون کے ساتھ اس برصغیر کا ایڈمنسٹریشن تے جانا سول سروس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اوسکھڑ سے تازہ تازہ آیا ہوا نوجوان چارلس بارلو انقلابیوں کے پرانے گڑھ باریسال میں جو اسٹریٹ تھا۔ یہ ان لوگوں کا بنگال ہے۔ یہ میرا بنگال بھی تو ہے۔ گریٹ ٹیڈ اور گریٹ ٹیڈ، ڈیڈ اور ما، میں اور آسٹ ماڈر بنگال، مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میں اسے نبیہا ہونے دوں گا وہ باریسال

کلب کے برآمدے میں دوہسکی پیتے ہوئے Broad کرتا۔ اس نے دہشت پسند تحریک کا مطالعہ کیا
انقلابیوں کے حالات سے تفصیلی واقفیت حاصل کی۔ ان کی لکھی ہوئی ورنائیوں کو لکھنے والوں کے
اقتباسات ترجمہ کروا کے پڑھے۔ (مثلاً بسمل شاہ پوری کی سوانح حیات جو انھوں نے پھانسی
سے تین روز قبل لکھ کر ختم کی تھی) اس نے دنیش چندر سرکار کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا، کہ اوکسفرڈ میں
اقتصادیات ہی اس کا مضمون تھا۔ مگر اس قدر مفید نہ، بالخصوص خیالات ان انقلابیوں کے خصوصاً
دنیش چندر سرکار کے تھے، اس نے ہندوستانی نفسیات پر عموماً اور بیگالی نفسیات پر خصوصیت کے سا
غور کیا کہ بیگالیوں کی شکست پوجا کا ان کی تخریب پسندی سے کتنا گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ درادڑوں
منگولوں اور آریوں سے قبل کے قدیم ترین وحشی قبائل کا خون ان کی رگوں میں جوش مار رہا ہے، تو کس
سے مار دھاڑ پراتر آتے ہیں۔ آدی واسی قبائل کی دیوی ماں کا عقیدہ اب تک ان کے دلوں میں رہا
ہے۔ اُسے ان کے سکھ بابو نے کس چالاک سے "مدراڈیا" سے مماثل کر دیا۔ ہندے ماترم۔ ہا
ماتا خون کی قربانی چاہتی ہے۔ مسلمان کا خون، انگریز کا خون، — ارے ان چالاک بابو
کی سائیکولوجی سے تو ہم واقف ہیں۔ ان کے فلسفی اپنی "روحانیت" اور "اصاطیری علامات"
بشعلق ہمیں کیا سمجھا ئیں گے۔

مگر ہماری قوم میں بھی احمقوں کی کمی نہیں۔ وہ ایلس جیسی خطی ایک مارگریٹ نوبل آئی
وہ کالی کی پرستار بن گئیں۔ ان کو سسر نوڈتا بنا کر ان ہندوؤں نے جھنڈے پر چڑھا دیا۔
عورتوں کی دراصل صحیح عمر میں شادی ہو جانی چاہئے۔
ویو یگانہ، سنا ہے بے حد وجہ تھا۔ سب یورپین اور امریکن عورتیں اس کی تقلید
آنکھوں پر عاشق ہوتی تھیں۔

اہل ہند سسر نوڈتا اور سنی بسنت کے کیا کیا گن نہیں گاتے۔ کہ دیکھو تمہارے جیسے سفید
نام بھی ہماری روحانی عظمت کے قائل ہو گئے۔ — ہا — بیچاروں کا احساس کمتری
اس احساس کمتری میں ہم نے انھیں مبتلا کیا۔ بڑھیا سے بڑھیا ہندوستانی انگریزیت دونا
کر لینا فخر سمجھتا ہے۔ ہائے کس سے مقابلہ رجم قوم ہے۔ کس فخر سے کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ چھری
سے کھاتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں۔ دنیا کا عظیم ترین، شمالی، کولونیل سماج !

اور پھر پچھلی صدی کے بہت سارے سفرے۔ ان کے بارہ سوئم اور پانچ سو۔ ان کی خواتین کی گاڈن نما ساریاں۔ ان کے جوڑے اور موزے۔ ان کے انگلستان کے سفر، ان عورتوں نے پردہ ترک کر کے زنانہ اور ہم کے رومان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

بے چارہ الف جیم۔

ٹیگور بھی ہماری نقالی تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ، اسی طرح آپس کے کشت و خون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔ آخر دیکھو انڈیا نشان وغیرہ ہے۔ ٹیگور نے شبلی اور کیش نہ پڑھا ہوتا تو ایسی شاعری نہ کرتا بے چارہ اوپری طبقہ کا ہندو۔ پہلے مسلمان حکمرانوں کی نقالی میں لگا رہا۔ اب ہماری تقلید ہے۔

رد و سری بات یہ ہے کہ سارے ہندوستانی لیا کار ہیں۔ شانتی شانتی رہتے ہیں مگر تشدد لگ گھتی میں چڑی ہے۔ مذہبی جنون اور ملکی سیاست کا اس ملک میں ہمیشہ سے گہرا تعلق ہے سے پہلے شیووں، شاکتوں، برہمنوں، بودھوں، جینیوں میں جنگیں بھجائیں، جس عہد کا جو ہوا اس کے حکمرانوں نے دوسرے فرقوں پر ظلم توڑے۔ اب مسلم پیریڈ پر آئے۔

”عبد الغفور —“

ایک منٹ میں عبد الغفور دروازے پر نمودار ہوئے۔

صاحب !

کچھ نہیں جاؤ !

عبد الغفور واپس چلے گئے۔

مسلم دور — ساری مسلم پیریڈ کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سارے مسلمان فخریہ غازی کہتے تھے اور بت شکن، کافروں کو مارو۔ مندر گزار مسجدیں بنادیں۔

مظانوی دور کو لیجئے — سیاسیوں اور مولویوں کی بغاوتیں، جہاد کے فتوے۔ اور حال میں لکے سوامی دیویکاشنڈ کے ساتھی اور چیلے چاہتے جو بنگال کے اولین و ہشت سینوں میں الفتالیوں کو اپنے دشمنوں میں پناہ دیتے، خود انڈیا گزاراؤ ٹڈ میں کام کرتے۔ اٹھارویں صدی کے

سینا سیوں کی معنوی اولاد — تاریخ کس طرح اس ہلاکت خیز ملک میں متواتر اپنے آپ کو دہرائی اور جو ہندوستانی ہم نہیں پھینکتے انہیں تقریریں کرنے کا مرض ہے۔ ساری قوم اس عالم میں مبتلا ہے کیننگ کو ۱۸۷۶ء میں پانیر نے الہ آباد سے غلاظت اور لعن اور بھیانک راتوں شہر کلکتے بھیجا۔ وہاں بابہ لوگ جنھیں ہم نے لوکل سیلف گورنمنٹ سونپ دی تھی۔ اپنے شہر صفائی کے بجائے تقریریں کر رہے تھے۔ میونسپل بورڈ اور بنگال لمپلیٹو کونسل کے نیٹو ممبروں دھماکہ تقریریں کر رہے تھے۔ نظریات کے بجائے ان حضرات کو کدال اور پھاوڑے منجھال کیننگ نے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ یہ بات آج تک صحیح ہے۔

تقریریں کرتے ہی اور بیدہن ہیں، اس لئے دماغ قانونی موٹسکافیوں میں بھی خوب چلنا کا کوری دیکھتی صرف دس نوجوانوں نے چٹی ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کمال ہے۔ اس مزہ میں کے دفاع میں موٹی لال نہرو کی جرح میں نے خود سنی تھی۔ پٹنہ اور الہ آباد کے یہ سارے ملہ قانون دان جو لندن سے قانون پڑھ کر آتے تھے اور اوکس برج کے تعلیمیافتہ لیٹروں کے مقصد رہے تھے۔ یہ ہماری بابرکت امپیریلزم کا نتیجہ ہوا۔

انقلابیوں کے گیت ————— ”بے گاہند سچھے کو بے گاہنڈان آگے۔“
کے طوفانی گانے، ڈرامے، عوامی ناٹک، گریٹڈ ڈیڈ اور ایڈورڈ بارلو کا بنگال ان آتشیں آواز سے گونج رہا ہے۔

یہ انقلابی واقعی بڑے جری ونگ تھے۔ اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف چھٹانک چاول اور ڈو چھٹانک چٹانک چٹانک کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتا تھا۔ اور حیرت انگیز اٹھا کر یہ ہم سے لڑ رہے تھے۔

اشلوک رتے اور نمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے۔
سوال یہ ہے۔ چارلس بارلو نے پائپ کا گراکش لگا کر سر چھپے لکایا کہ آرش با۔
بھی تو ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ان کو ہم اتنا مجرم نہیں سمجھتے، محض اس لئے کہ وہ گو۔
ستمبر ۱۹۲۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا کہ یورپ میں ہم ہٹلر کے مقاب
بالکل تنہا تھے اور ہندوستان میں ہمیں باغیوں اور مفسدوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ گریٹڈ

درخش ہوں گے کہ میں نے اپنی بساط بھرا اس قومی کرائس کے موقع پر اپنے فرائض ادا کئے
میں نے اپنے اصناف میں کیونسٹون کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ پل کینٹ ویل
ایک لیڈر ریجان احمد کو نہ پکڑ سکا اور اس کی سزایں اسے دور دراز رنگامانی تبدیل کر دیا گیا۔
کامریڈ ریجان کو میں بھی کبھی نہ پکڑ سکا۔ میں خوش ہوں کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ واقعہ
بھی ان لوگوں کو مجرموں کی طرح پکڑنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر فرض فرض ہے۔
خدا کرے ایسے خیریت سے ہو۔ گارڈ ہلز میں ہمیشہ سے مشنوں کا اثر ہے۔ مگر کمیونسٹ وہاں
پکڑ چکے ہیں۔ اور وہاں کے جنگلی کمیونسٹ اور سوشلسٹ کے باریک فرق کو نہ سمجھ
سکے۔

بلیا میں باغیوں نے آزاد سرکار قائم کر لی۔ یو۔ پی کی سطحوں پر لڑنے کے "ہمارا بادشاہ کون۔۔۔"؛
م آزاد!" کے نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آسام میں گویوں کی بارش ہو رہی ہے۔ سچا شچند
نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار پر جا کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر اکر دم
۔۔۔

جیزس کرائسٹ!

چارلس بارلو نے زور سے انگریزی لی۔ بہت جلد کیا میں بھی کر لی بلیمپ کی طرح، ایک کردار،
نپ میں تبدیل ہو جاؤں گا؟
اؤکسفرڈ میں ایسے ہی ایک اتوار کی خاموش صبح دریا کے کنارے ٹہلنے ہوئے جب معمول انڈر
نا بکٹ ہو رہی ہے۔ میں ٹوری نوجوان ہوں، فریڈ کارٹر بالشویک ہے۔ مسعود علی اور
نا ہندوستانی قوم پرست۔

"ہماری قدیم تہذیب۔۔۔ رانا تھن گرج رہا ہے۔

"سر۔۔۔" آپ کی قدیم تہذیب؛ وہ بھی حکمران طبقے اور پروہتوں تک محدود تھی۔ اور اشوک
لچر یا شاہجہاں کے عہد کی کلچر کی طرح آج کی برٹش یا مغربی کلچر بھی آپ کے مٹھی بھر طبقے تک ہی
۔۔۔ میں جواب دیتا ہوں۔

"یاد پ میں تسلیم عام ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد تھا۔ ہم غلام تھے۔ اس لئے جاہل اور سماندہ رہ گئے۔"

مسعود علی کہتا ہے۔

”خوب! آپ کا مغل دور تو آزادی کا دور تھا۔ اس وقت اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں تھے کہ جب گریڈ ڈیڈ اڑیسہ پہلی بار گئے اس وقت وہاں ایک چھپی ہوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ سے سو۔ سامے صوبے میں ایک چھپی ہوئی کاغذ کی کتاب موجود نہ تھی۔ پر وہ بت لوگ تار کے پتوں لکھ دیکھ لیا کرتے تھے۔“

”یہ جہالت فیوڈلزم کی کارستانی تھی! بائیسویں فریڈ جواب دیتا ہے۔

”بکواس۔“ میں بات جاری رکھتا ہوں۔ ”اور سنو۔ جب کلکتے میں ہم نے کتابیں چھپا کیں تو ایشیوں پر لہے ہوئے ہندو طلبہ چلا چلا کر ان کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ مکالمے نے کہا یورپ کی کسی لائبریری کا ایک شلیف ہند اور عربستان کے سارے نیٹولٹریجر پر حاوی ہے۔“ میری سنی ان سنی کر کے راماناٹھن اپنا وظیفہ شروع کر دیتا ہے۔ ”انیسویں صدی کے پہلے میں سات قحط پڑے جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیس، قحط پڑے، جن میں کروڑ انسان مرے۔ پھر سیاہ فام راماناٹھن بڑی شیرینی سے مسکر کر کھج سے پوچھتا ہے۔ ”ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا کیا ذکر تھا۔؟

”کبھی نائندہ اور کھسلا کا نام سنا ہے؟“ اور اس کے سفید دانت جھلملاتے ہیں۔

جیت لی۔

ہم تینوں ناؤ میں جا بیٹھے ہیں۔ مسعود علی پتوار سنبھالتا ہے۔

اب راماناٹھن کہہ رہا ہے۔ ”اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تب بھی ہندوستان مغربی علوم زر ہو جاتا۔ شیو سلطان شہید اور راجہ رام موہن رائے دونوں فرانس کے مداح تھے۔“ ”گاڈ آل ماسٹی۔ شیو صاحب تو سخت اینٹی ہندو تھا۔ اب ہمارے مقابلے پر ایک ہیرو سوس ہوئی، تم چالاک لوگوں نے لے اور سراج الدولہ کو ہیرو بنایا۔ دونوں اینٹی ہندو حاف کرنا مسعود۔ اولڈ چیپ۔“

”ہماری تاریخ تم لوگوں نے مسخ کی ہے۔ راماناٹھن غزات ہے۔“ ہم نے تمہیں انگریز کے ذریعے متحد کیا۔“ میں جواب دیتا ہوں۔ ”تم اور مسعود ایک دوسرے سے انگریزی میں بات

اس وقت میں سجدائیں انڈین ہو رہی ہوں۔

وائلیٹ۔

لاچار غصے سے پھر میرا خون کھول رہا ہے مجھے اس سے اتنی نفرت ہے۔ اتنا عشق ہے۔ یہ آ

تک معلوم نہ تھا۔

کجنت خط بھی نہیں لکھتی۔ شاید میں اس کے لئے مرجھا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ باغی

نے مجھے بھی قتل کر دیا ہوگا۔

ما۔ آنت میٹی

اُس نے آنت میٹلڈا کی تصویر پھر اپنے سامنے رکھی اور سر ہلانے لگا۔

آنت میٹی تم نے بھی اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا۔ مگر اُن کے ہاتھ میں ریشم ہے۔ ٹھیک ہے۔

قلم نہیں پکڑ سکتیں۔ آنت میٹی تم ایک زمانے میں کتنی خوب صورت تھیں۔ اپنی یہ پرانی تصویر دیکھو۔

وائلیٹ۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ نہ بھولو۔ تم نے آنت میٹی کو کسی ہوم میں ڈال د

تا کہ آزادی سے عیش کرو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں ہندو عقلمانی ہوں۔ میں سخت دل انگیز و

کی طرح کبھی بوڑھے ماں باپ اور رشتے داروں کو گھر سے نکال کر کسی ہوم میں پھینکنا برداشت نہیں

کر سکتا۔

اب اس کے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ اب تک وہ کتنی شراب چرٹھا چکا تھا۔

خداوند! اگر تو واقعی کہیں موجود ہے، وائلیٹ کو، ماما اور کیرن کو، آنت میٹی کو، ایلس کو، اور

سب کو اپنی حفاظت میں رکھ۔

اولڈ پیپلز ہوم۔

کسی دن شاید میں بھی، مجھے بھی نام اور اس کی بیوی گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں ڈال د

ے۔ بچا ہ بڑھا جو ہر وقت ہندوستان کے متعلق بڑبڑاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ (زرین آپس میں

کہیں گی)

تم آنت میٹی کی طرح مفلوج اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور تمہاری بہو تمہیں ہوم میں پھینک

دے گی۔

اسی برسات میں، میں نے وائلیٹ کے ساتھ اپنی لاپخ پر پدما کے کیسے روانی سفر کئے ہیں! اسٹیج پر ہم ہنسی مون کے لئے سندربن گئے تھے۔ اسٹیج پر کیا نام تھا۔؟ کنگ فشر۔

آج ہماری شادی کو پورے گیارہ سال ہو گئے۔ یادگ شائری تازہ دار دلور کی شروع شروع میں حیرت سے یہاں کی ہر چیز کو دیکھتی تھی۔

ساتھ ہماری شادی کا پہلا سال، بارہ سال میں، جہاں میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑ دیا۔

میری سروس کا سب سے نمایاں کارنامہ۔

سیاہ آنکھوں والا دیکش، میرا ہم عمر نوجوان، میرے سامنے کھڑے میں کھڑا تھا۔ ممکن تھا کہ

ء اوکسفرڈ میں میرا جم جماعت ہوتا۔ کشتی کھیلتے ہوئے مجھے بچپن میں کرتا۔ مگر وہ کال کو ٹھہری میں جانے سے

بل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بڑا جدید انٹلکچوئل ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

جس روز اس کی اپیل ہائی کورٹ سے مسترد ہوئی مجھے بے حد۔ کتنا۔ سید دکھ ہوا تھا۔

یوں؟ وہ بالآخر میری قوم کا جانی دشمن تھا۔ اگر میں نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا۔

مجھے اس کی اپیل مسترد ہونے کا بڑا رنج ہوا تھا۔

جس روز علی پور جیل میں اُسے پھانسی ہوئی، اسی روز ہمارے یہاں ٹام پیدا ہوا تھا۔

متوجہ آیا، وائلیٹ کی منہ چڑھی اس سے کہنے لگی۔ سیم صاحب۔ ہم ہندو لوگ آد اگون میں

لیو کرتا ہے۔ شکر ہے کہ دنیش بابو کی پھانسی کے دو گھنٹے پہلے ٹام بابا پیدا ہوا۔ اگر تھوڑا منٹ بعد

یہا ہوتا تو بیت سا ہندو لوگ بولتا کہ دنیش بابو نے بدل لینے کے لئے آپ کے گھر میں جنم لیا ہے۔

واٹ اے ہو رہل محوٹ۔ بے چاری وائلیٹ نے ذرا سا کانپ کر کہا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ آیا کی اسی عجیب و غریب بات کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اطمینان کا

مانس لیا تھا کہ ٹام دنیش سرکار کی پھانسی سے دو گھنٹے قبل پیدا ہوا۔ کرائسٹ ماس دیوانے

ہی ملک میں رہ کر انسان خود دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو

اور ایک اور عجیبانک خیال :-

جف گگ کی تائی ہوئی خیر تانہ ترین خیر ہے وہ تو کل ہی لندن سے یہاں پہنچا ہے۔ اکنہ

یہ کن افسر سے ملاقات بھی کی ہے۔

نمبر ۱۳۔ اینڈریوز کرسینٹ میں ایک امریکن کرنل BILLET کو دیا گیا ہے۔ اس میں دیکھو

ایک قصہ ؟

اس امریکن کا نام کرنل ڈونلڈ جو سیلی ہے۔ بہت خوب صورت طرہ دار جوان ہے۔ میں طرہ دار کم ہوں۔ نونا بھدا، اتنی موٹی ناک، وائلیٹ میری جان، یہی ہرگز تمہارا سستی نہیں تھا۔ مگر تم نے بھی تو بڑے عہدے سے شادی کی تھی۔

مارچ ۳۹ء اس پر اس دنیا میں ہم آخر بار برطانیہ گئے تھے۔ کاش وہ بچوں کا داخلہ کرنا بعد میرے ساتھ ہی واپس آگئی ہوتی۔

اب میں پھر الف جیم کی تلاوت کرتا ہوں۔

وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ صدمے، رنج، پچھتاوے، بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انسان کو اتنی مہلت ملے کہ وہ ایک سنوٹی سے اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے، اپنے اندر جھانکے۔

اب اُسے نیند سی آر ہی تھی۔ مابھی محفوظ ہے۔ یادوں کا قبرستان محفوظ ہے۔ اس نے کاکا سے نعمات ہندا اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹا رہا۔ نسیم وا آنکھیں رذرا سی کھول کر ادنگتے ادنگتے کتاب کے آخر میں دوسری کتب کے اشتہاروں پر نظر ڈالی۔ ایک تفتیق تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھرنے لگا۔

"نیل کی کاشت — ایک پلانٹر کی زندگی کا دلچسپ مرقع"

"پرانے کلکتے کی آوازیں بازگشت" از ڈاکٹر بسید۔ سرورق پریک ہول کی تصویر۔

فہرست مضامین :- فلپ فرانسس کا دور، ن کو مار، فرانس اور سیشننگز کا ڈوسٹین،

دغیر وغیرہ۔

"انگلش ایٹیکٹ فار انڈین جنٹلمین۔ سوشل اینڈ انیشل" از ڈبلو ٹریگوریو۔

بنگال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ۔

"بہار کی پرانی یادیں" ایک پرانے پلانٹر کے قلم سے۔

”جسٹس اونوکول چندر مکرجی آنجھانی۔“ از۔ ایم مکرجی۔ انڈین انگلش یا باوا انگلش کا درزی اور نمونہ۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس جینٹلمین کی سوانح حیات جو ان کے بھتیجے نے لکھی ہے، ضرور پڑھ کر تشریح حاصل کریں۔

”آسام میں ایک نئی پلانٹری زندگی“ از جارج بارکر۔

”انڈین ریسننگ کی چند یادیں۔“

”گھوڑے، آدمی اور اسپورٹس“

”سیونی“ سرت پڑھ پہاڑیوں میں کیمپ لائف۔

”بنگلے کے چھپے۔“ از ”ایسا“ مزاحیہ کتاب۔

الباب: بولنے کو ملازم رکھنا، ڈوگ بوائے، مشعلچی، اجمال، ہری درزی، بٹلر۔

عبدالغفور۔۔۔ ابھی بنگلے کے چھپے میرا بٹلر عبدل زندہ ہے۔ میں محفوظ ہوں، چارگس

باولونے اور گھنٹا شروع کر دیا اور پھر کسی کے ہتھے پر سر رکھ کر سو گیا۔

خاصی پوسیدہ چھتری لگائے، بارش میں بھیکتے حواس باختہ ریورنڈ بنرجی ڈور بھاٹک میں داخل

ہو رہے تھے، اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا اور ڈی ایمزدوس کے برآمدے کے ایک در میں

کھڑے عبد الغفور سید چیرا سی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

”صاحب چھوٹا حاضر کی بعد سے دروازے بند کئے اسٹڈی میں بیٹھا ہے۔ میریہ ہیر

پے چلا جا رہا ہے۔ اللہ جانے کیا معاملہ ہے۔ شاید ولایت سے میم صاحب کی کوئی خیر خبر نہیں

آئی۔“

چیرا سی نے متانت سے سہلایا، اتنے میں اس کی نظر بادری صاحب پر پڑی جو برساتی میں

پنچ چپکے تھے۔

پادری بجزی نے میری صیالی چڑھ کر جلدی جلدی پائیدان پر جوتے گڑے، اور برآمد

ہیں آئے، چھتری بند کی تو اس میں سے پانی کی بوندیں فرسٹ پر گریں۔ شفاف فرسٹ خراب ہو گیا۔ اور وہ اور زیادہ گھبرائے۔ اور دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عبدالغفور نے پک کر چھتری ان کے ماتھے سے لی، بیٹھ میک کے کونے میں لٹکا دی اور سلام کیا۔

”صاحب کہاں ہے؟“ پادری ہنرچی نے ہیبت زدہ آواز میں دریافت کیا۔ عبدالغفور ان کی اس حالت پر متعجب ہوئے۔

”صاحب کتاب والے کمرے میں ہے پادری صاحب۔“

”صاحب کو بلو، مہربانی ہوگی، ایک دم ضروری بات کرنا ہے۔ مہربانی ہوگی۔“

عبدالغفور نے سر ہٹایا اور ناند گئے، لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھٹ کھٹایا اور کواڑ آہستہ سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ آرام کرسی کے پاس جا کر ذرا سا کھنکارے۔

چارلس بارلو نے آنکھیں کھولیں۔

”صاحب۔ کالا پادری آیا ہے۔“

”کون؟“ چارلس نے ذرا چونک کر آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

”کالا پادری۔ ہنرچی بابو۔“

”اوہ۔ کیا کام ہے؟“

”صاحب۔ وہ ایک دم ضروری بات کرنا مانگتا ہے۔ گول کمرے میں بٹھا دوں؟ بے چارہ

بہت گھبرایا ہوا دکھتا ہے۔۔۔“

چارلس نے سراونچا کیا۔ ”اِس۔؟ کیا۔؟ نہیں، ادھر ہی بھجرو۔“

”ادھر صاحب؟“ لائبریری صاحب، کابینہ ذاتی کھوٹھا۔

”یس، یس، یو ایڈیٹ۔“ چارلس نے گرج کر کہا۔ عبدالغفور کان دبا کر غائب ہو گئے۔

چارلس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد، خیالات میں انتشار، دل میں دکھ، کیا کریں اب اس کالے پادری کی فریادیں سنوں۔ میں کہ ہندوستانیوں کا بائی باپ ہوں، مانی باپ، غریب یرور۔

جب اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں، پادری بنرجی سولا ہیٹ دونوں ہاتھوں میں لئے سسکی سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خوش خلقی سے مسکرایا اور مہانچے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔
”گڈ آفٹرنون مسٹر بارلو۔“

”ہلو۔ پادری۔ گڈ آفٹرنون۔ گڈ ہیونز۔ کیا دوپہر سو گئی؟“
پادری بنرجی نجابت سے مسکرائے، مگر مسکراہٹ نے فوراً ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ پھر ہیٹ زدہ نظر آرہے تھے۔

”کیا بات ہے پادری آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈو یو ول ڈرنک، ادہ پوڈونٹ ڈرنک، ڈو ہیٹ ڈاؤن پادری۔“

”نو، یس، مسٹر بارلو۔ پادری بنرجی ہکلائے اور ایک کرسی پر ٹنگ گئے۔ ہیٹ گود میں رکھ لی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چارس نے مگ میں بیرانڈیٹی، مگ اٹھا کر کہا ”ٹو وکٹری۔“

پادری بنرجی نے اسی بھونچکے انداز میں سر ہلایا۔ چارس پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ساری چیزیں دھندلی دھندلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ آئی ایم ڈرنک، ہتھوے۔ سامنے کالا پادری بیٹھا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ حیرت رہی ہے کہ انسان اپنا آبائی مذہب کیسے بدل لیتا ہے۔ اپنی کھال اتار کر دوسری کھال کیسے منڈھ لیتا ہے (مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہو جاؤں۔ ماہا ما) سیاہ سوٹ پہنے، سفید کالر لگائے پالی میتھو: بنرجی بھی مصحکہ خیز ہے۔ جس طرح ایڈورڈ بارلو مصحکہ خیز تھے۔ ریجان الدین احمد مصحکہ خیز ہے۔ میں مصحکہ خیز ہوں، سارا ہندوستان، ساری دنیا، ساری انسانیت ساری زندگی اتنی مصحکہ خیز ہے کہ اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔

”مسٹر بارلو۔“

وہ چونکا۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ نیٹو پادری، فریاد لے کر آیا ہے۔ عدل چاہتا

ہے۔ ل ل ل

”مسٹر بارلو۔“

”اوه جسٹ دن منٹ پادرے“ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بھاری بھاری، اونچا اونچا، جھکا جھکا سا کمرہ عبور کر کے ریڈیو کے پاس گیا اور دم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ریڈیو کی سیڑھی گھمانے لگا۔

”دس ازنی، بی بی لندن۔“ ایک دم آواز گونجی۔

پادری ہنرچی چونک پڑے۔

ہزاروں میل پرے۔ ڈکنی کشتیوں سے معمور سمندروں، گرم صحراؤں میں پھٹتے بموں جلتے ہوئے یورپ کے اس پار، جلتی ہوئی آکسفورڈ اسٹریٹ کے ایک تہہ خانے میں بیٹھا ہوا ناڈ نسرٹائٹ اپر لپ کے ساتھ اپنے ہم قوم چارلس بارلو سے مخاطب تھا۔

دس منٹ تک وہ چارلس بارلو کو بتاتا رہا کہ اتحادی کہاں کہاں فتح مند رہے ہیں۔ اور برطانیہ میں کہاں کہاں بمباری ہوئی ہے۔ پھر نیشنل چرچل کے نانہ ہمت افزا بیان کے اقتباس کے بعد خبریں ختم ہوئیں گوڈ سیوری کراگ بجا۔ چارلس بارلو فوراً ٹینشن کھڑا ہو گیا۔ پادری ہنرچی بھی کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو بند کر کے دائیں چھنگلی پلکوں پر پھیرتے ہوئے چارلس بارلو واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا اب جا کر پادری ہنرچی نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار حیب سے نکالا۔ اخبار بھی بارش میں بھیک کھا تھا۔ انھوں نے اُسے ذرا احتیاط سے مسٹر بارلو کے سامنے پیش کیا۔ ایک نبرہ سرخ نشان لگا تھا۔ چارلس بارلو نے جھک کر خبر پڑھی، تیوری پر بل ڈالا۔ پادری کو دکھا۔ ہونٹ کٹے۔

”مجھے بڑا شمس ہے، پادرے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی لڑکی بھی۔“

”میں بالکل مجبور اور لاعلم تھا مسٹر بارلو۔“

”آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟“

”میری بچی۔ میری بچی۔ گراہ ہے۔ مسٹر بارلو۔ اُسے بچا لیجئے۔“ پادری نے اس

کے سامنے ہاتھ پھیلا دیئے

وہ جھنجھلا گیا۔ اب اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، وہ اپنی ذاتی اندرونی دنیا سے واپس آ کر اپنے فرض منصبی پرستار ہو چکا تھا۔ ”آپ کی لڑکی بالغ اور سمجھ دار ہے، جان بوجھ کر اس غنڈہ گردی میں شامل ہوئی ہے۔ بہت جلد اس روحان پرست سے اس کا جی بھر جائے گا یا ممکن ہے وہ

پادری عمر اسی میں لگی رہے۔ آئیڈیلزم، خدمتِ قوم، اور خدمتِ خدا کا جنوں انسان کو عجیب و
ریب طریقوں سے اپنی زندگی تجنّے اور تباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری بہن — اب اس نے
تھک پھیلانے۔ "میری بہن آئیس چمیس سال سے ناگا جنگلوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے اور غالباً
ہمت سرور ہے۔ آپ کی بیٹی بھی جیل میں خوشتر رہے گی۔ اور خود کو مجاہد سمجھے گی۔"

"سٹر بارلو —"

"پادری — چارلس نے دفعۃً سید چڑھ کر کہا: اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ روزی کے ہتھے
رہنے لسی کی جان لی ہے تو اسے عمر قید ہوگی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"
پادری بنجری کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈبڑبانے لگے۔ چارلس دوسری طرف دیکھنے لگا۔
ایسے اشارہ تھا کہ اب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مگر پادری بنجری ڈٹے رہے، ایک آخری کوشش اور۔
"سٹر بارلو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ سس بارلو آج کل کسی کام سے تپنے میں آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان کو
نکال کر دیں، کہ — کہ وہ جیل کے ہسپتال میں روزی کو جا کر دیکھ لیں۔ اور — اور — میں یہ
طبعی ان کو — انہوں نے جیب سے ایک خط نکال کر چارلس کو بھجوا دیا، اور ملتی اور پرامید نگاہوں سے اسے
دیکھنے لگے۔"

چارلس نے پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیر سسٹر ان کر اٹس۔"

اس مصیبت کے وقت میں —

چراسی کرے میں داخل ہوا۔

"یس۔؟" بارلو نے پرچہ پڑھتے پڑھتے سراٹھا کر پوچھا۔ سنہری اور سرخ دردی والے چراسی کے
تقدیم چاندی کی پلیٹ تھی جس میں ایک پیلا فادر رکھا تھا۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چراسیوں اور سائیسوں کی دردیاں، پگڑیاں اور ٹوپیاں بھلا فوی
لومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امرا و شرفا کی ملبوسات کے نمونے کی ترقی تھیں۔ گویا
تہ ہوں، دیکھو، جو تمہارا لباس ہے، وہ ہم اپنے نوکروں کو پہنائیں گے۔

چراسی نے پلیٹ چارلس بارلو کو پیش کی۔ چارلس نے کیبل گرام کھولا۔ اسے بڑھا! اس کا رنگ سفید

پڑ گیا۔ ہونٹ ذرا سے لرزے۔ وہ چند لمحوں تک بالکل سانسٹ بیٹھا رہا۔ پھر کندھے سیدھے کرنے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبل گرام جیب میں رکھا، ابرو کے اشارے سے چپراسی سے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لمبا، گہرا سانس لے کر کھوکھلی لیکن مضبوط آواز میں پادری سے مخاطب ہوا۔ "اک کیوز می پادری۔ میں ابھی آتا ہوں۔" اور جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پادری بزمی حیران پریشان بیٹھے رہے۔ اس ایس بارو کے نام خط تالین پر گر پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھا اور صبر سے چپکے میٹھ گئے۔
پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پینتالیس منٹ، ایک گھنٹہ۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا۔ تب پادری بزمی لائبریری سے باہر نکلے۔ کوٹھی پر ایک دم ہموکا عالم طاف تھا۔ وہ سیرھیان اتر کر شاگرد پیشے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے نزدیک ساسے ملازم ایک عجوبہ کی صورت میں جمع آپس میں کھٹکھٹ کر رہے تھے، عبدالغفور ان کی طرف آئے۔
"کیا بات ہے عبدل۔؟"

"صاحب! " عبدالغفور نے دھیرے سے کہا اور ان کو ساتھ لے کر باغ کی روش پر آگئے۔ خوب صورت ڈک پونڈ میں بطخیں بڑے سکون سے تیر رہی تھیں۔ دور مرغی خانے میں ایک مرغی کٹ کٹانے جا رہی تھی۔ باورچی خانے کی چینی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"صاحب۔" عبدالغفور نے کہا۔ "میم صاحب گزر گئیں۔"
"گوڈ میورنی۔ کیسے عبدل؟"

"صاحب سید دم میں بت بنا بیٹھا ہے۔ ابھی اس نے مجھے آواز دی تھی۔ میں اندر گیا تو آپہنٹے سے بولا۔ عبدل۔ ہمارا میم صاحب گند گیا۔ ولایت سے نار آیا ہے۔ جرمس وانا لیم گرا رہا تھا۔ راکٹ بولتے ہیں۔ کیا بولتے ہیں۔"

”وی ٹورا کٹ“

”جی پادری صاحب، وہ بدھ کی رات کو صاحب کے مکان پر گرا۔ مکان جل کے راکھ ہو گیا۔

صاحب اندر سو رہی تھی، وہ بھی —“

”مگر ادھر تو عبدل ایر ریڈ کا بھونچو بچتا ہے۔ سب لوگ تہ خانوں میں چلا جاتا ہے۔“

”معلوم نہیں، صاحب نے اتنا ہی بولا۔ اور بولا کہ بابا لوگ سے باہر اسکول کے پورڈنگ

ہے، اس وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور میٹی مس صاحب بھی بچ گئی۔ اس کو میم صاحب نے پڑھا لوگ

یوم میں ڈال دیا تھا۔“

”شکر ہے۔“

”صاحب نے بولا ہے پادری صاحب سے کہو ہم ابھی آتے ہیں۔“

”اچھا۔ تھینک یو عبدل۔“

عبد الغفور واپس چلے گئے۔ پادری بنرجی واپس آکر لا بُریری کے سامنے والے برآمدے میں

سننے لگے۔

بوٹ کی چاپ سنائی دی۔ چارلس بارلو برآمدے میں نمودار ہوا۔ پادری بنرجی کی طرف بڑھے۔

”مسٹر بارلو۔“

”پلوسے بدھ کی رات کو مسٹر بارلو کا ایر ریڈ میں انتقال ہو گیا۔“

”اس کی معنی پوری ہو۔“

”آئیے بیٹھے۔“ اُس نے پھولدار گدیوں والی بید کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود

دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ باغ میں چڑیاں چھپا۔ ہی تھیں۔ فطرت اسی بے نیازی سے

ندہ رہتی ہے۔

”غم نہ کیجئے مسٹر بارلو، مسٹر بارلو ایک بہت بہتر جگہ چلی گئیں۔“

”بہتر جگہ —؟ آپ کو کیسے معلوم۔ اس دُفوق سے کس طرح کہتے ہیں؟“ چارلس نے ہنچلا

رکھا۔ ”بہتر جگہ صرف یہ دنیا ہے۔ باقی آپ لوگوں کی خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔“

پادری بنرجی خاموش رہے

چارلس بارلو تلمی سے ہنسا۔ "THE LORD HIS INFINITE MERCY"

پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا "خدا واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرے بیٹے"

"ہا ہا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیرکانوار بنا دیا۔ یہ

اور معصوم بچھو بھی کو چیٹیوں سے RAPE کروا کے قتل کر دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کے جز

اندھیرے آسمانوں پر برفچے اڑا دیے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں

طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی جگہ میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ

کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر کرتا ہے۔ او یا دوسرے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا نفعی بچو

اپنا بیچ اور اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ سوری پادری سے

پادری بنرجی ذاتی کراسس کے مواقع پر اسرار ربانی تلامع فانی انسانوں کے منہ سے

کے کلمات کفر سننے کے عادی تھے۔ انہوں نے جیب سے بائبل نکالی اور تیسواں مکن پڑھنا شروع کیا

تیسواں مکن جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خداوند خدا میرا گڈریہ ہے، مجھے کوئی ڈر نہیں وہ مجھے ہری

چراگا ہوں میں آرام کرتا ہے، وہ مجھے خاموش پانیوں کے کنارے

کنارے سے بھاتا ہے۔

پادری بنرجی نے کتاب گود میں رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

اور گویا موت کے سائے کی وادی میں چل رہا ہوں

لیکن ان کے ساتھ ساتھ مکن کی تلاوت کرنے کے بجائے چارلس تیموری پر بن ڈالے سر پلائے

رہا تھا اور اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ پادری بنرجی نے مکن ختم کر کے بائبل کے ورق گردانی شروع کی

کوئی اور سکون بخش حصر پڑھ کر سنائیں۔ مگر عجیب بات تھی کہ ہر صفحے پر ان کی نظریں بڑی پریشان

سطروں پر ہی جا پڑتی تھیں۔

اے یعقوب! تم اپنی ان مصیبتوں پر جو آنے والی ہیں رُو اور داویلا کرو،

تمہارا مال بگڑ گیا، تمہاری پوشاکیں کو کھیرا کھا گیا، دیکھو! جن مزدوروں نے

تہا بے کھیت کاٹے ان کی وہ مزدوری جو تم نے دغا کر کے ضبط کر لی تھی چلائی ہے۔ اور فصل کاٹنے والوں کی فریاد رب الانواج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ دیکھو منصف دروازے پر کھڑا ہے۔

پادری بنجری نے گردن آگے بڑھا کر ورق پٹے۔ یوحنا کا مکاشفہ
خدا کا بیٹا جس کی آنکھیں آگ کے شعلے کے مانند اور پاؤں
خالص پتیل کے مانند ہیں فرماتا ہے کہ تیرے کاموں اور محنت اور ایمان
اور خدمت اور صبر کو تو جانتا ہوں اور یہ بھی
اور آگے

اور جب اس نے چھٹی مہر کھولی تو میں نے دیکھا کہ سورج کیمبل کی مانند کالا اور سارا جہنم جوں جوں اور ستارے انجیر کے درختوں کے کچے پھلوں کی طرح گر پڑے۔ آسمان اس طرح مہر کی جبرط سے بے ملکوت پٹنے سے مرک جاتا ہے۔

پھر آسمانوں پر لڑائی ہوئی اور

پھر میں نے شیشے کا سا ایک سمندر دیکھا جس میں آگ ملی ہوئی تھی
شہر بابل گر پڑا۔ زمیں کے بادشاہ جب اس کے جلنے کا دھواں دیکھیں گے تو اس کے لئے
اپنے سروں پر خاک ڈالیں گے کہ افسوس افسوس وہ بڑا شہر جس کی دولت سے سمندر کے جہانوں نے دہمتہ ہوئے۔
پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا۔ اور کیا دیکھتا ہوں ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے
وہ خون آلود پوشاک پہنے ہے اور قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے۔ اور
پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑا دیکھا اور اس نے بڑی آواز میں چلا کر آسمان میں اڑنے والے
سب پرندوں سے کہا کہ خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت
اور فوجی سرداروں کا گوشت اور گھوڑوں اور ان کے سواروں کا گوشت کھاؤ۔

پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا۔ کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی

اور روح اور دہن ہیں، اور سننے والا بھی کیسے آدرجوبیاسا ہو وہ آئے ادرآب حیات لے۔
پادری بزمی نے گبر سانس نے کرنا عہدنا مر بند کر دیا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

تب چارلس کی بھاری آواز نے انہیں چونکا دیا۔

’پادرے! مجھے ایوبؑ کی گریہ دزاری سناؤ۔‘

’بہت اچھا۔ اور آپ جی صبر ایوبؑ سے سبق لیجئے۔ مسٹر بارلو۔‘

’سبق بعد میں لوں گا۔ تم مجھے پہلے اس عبرانی بدھ سے کی گریہ دزاری۔‘

’خاموش مسٹر بارلو۔ پادری نے دفعۃً ڈانٹ کر کہا۔۔۔۔۔۔‘ بہت بے ادبی کر لی۔ اب خاموش
’سواری پادرے۔‘

پادری نے دوبارہ عینک کا کیس کھولا، عینک تبدیل کی، اور حید سے مداری کی طرح پڑانا
عہد نامہ نکالا۔

’جستہ جستہ پڑھ کر سناؤں گا، بہت طویل باب ہے۔‘

’اور پھر ایوبؑ راکھ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے تین درست پڑ سے کو آئے۔ اور انہوں نے خاک مروں

پر ڈائی اور اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ رہے۔ اور سات دن اور سات رات زمین پر بیٹھے رہے۔ اور ایوبؑ

نے کہا، لعنت ہو اس دن پر جب میں پیدا ہوا تھا، میرے جسم پر کیرے رینگ رہے ہیں، میری کھال اٹھ

گئی، میرے دن جولا ہے، کئی کلیفوں کی مانند تیز رفتار ہیں۔ میری زندگی ہوا بن گئی۔‘

’خدا بے گناہوں کے مصائب پر ہنستا ہے اس نے زمین کو ظالموں کے حوالے کر دیا۔ منصفوں کے چہرے

چھپا دیئے۔ میری زندگی تیز رفتار جہاز کی مانند زور رہی ہے۔ مجھے اپنے غموں سے ڈر لگتا ہے۔‘

’میں خدا سے کہوں گا تجھے زب دیتا ہے خداوند اگر اپنے بند سے متنفرد ہو اور ظالموں کا ساتھ

دے، کیا تو بھی انسان ہے؟ ڈاکو عیش کر رہے ہیں اور خدا ان کو بڑھاد دیتا ہے وہ قوموں کو ترقی دیتا ہے

اور تباہ کرتا ہے اور پھر ترقی دیتا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کانوں نے سنا۔ اور عقل نے سمجھا۔

ادراب میں خدا سے ذرا منطقی جرح کرنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔۔‘

’ابن حوا کی مختصر زندگی کھفتوں سے پڑ ہے۔ وہ بھول کی طرح کھلتا ہے اور کٹ کر گر جاتا ہے۔

سلے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کی خوشبو کے درخت کو از سر نو زندگی بخشتی ہے۔ مگر ابن آدم ایک مرتبہ

د جا بے پھر نہیں اٹھتا۔ لے کر تو، جب تک حیراطیش نائل نہ ہو، مجھے قبر میں چھپائے گا۔ میں اپنے وقت منتظر ہوں۔

”پانی پتھروں کو بہلے جاتا ہے، تو انسان کی امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔ تو اس کی شکل بدل لیا ہے۔ تو نے مجھے ملکان، پاش پاش کر دیا۔ میرے چہرے پر حقیریاں ڈال دیں۔ مجھے جا بردلنے کے حوالے دیا۔ میری باگیں توڑ ڈالیں۔ میرا چہرہ روتے روتے بد ہتیت ہو چکا ہے۔ میری پٹلوں پر موت کا سایہ لڑا، لے لے زمین میرا خون نہ چھپا۔ میری شنوائی نہ کر، میری قبریں میرے لیے تیار ہیں۔ میری آنکھیں دفن و غم، دھندلا گئیں۔ مجھے تم سب میں ایک دانشمند نظر نہیں آتا۔ میرے مقاصد کا خاتمہ ہوا۔ میرے خیالات ٹوٹ کر بکھر گئے۔ قبر میرا مکان ہے۔ میں نے اپنا بستر امدھیرے میں بچھایا ہے۔ میں نے جسم کی کلن سے ا۔ تم میرے باپ ہو، کیڑوں سے کہا تم میری ماں اور بہنیں۔“

”جانو کہ خدا نے مجھے اپنے حال میں گرفتار کیا۔ میری راہ میں روڑے اٹکائے، ادا را ندیہرا پھیلا یا۔ اس کے لشکر نے میرے معبد کو گھیر لیا۔ میرے بھائی اور میرے عزیز اور میرے دوست مجھے بھول گئے۔ میں نبی نبی کے لئے ابھی ہوں، دوستو مجھ پر ترس کھاؤ کہ اس قہار و جبار کے ہاتھ نے مجھے چھو لیا ہے۔“

”میں انسان کا شاکا نہیں۔ لیکن اشقیاء بر لبط ادا را غنون جاتے ہیں۔ جبکہ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے را نہیں ملتا، پیچھے دیکھتا ہوں تو بھی نظر نہیں آتا۔ میں اس حاضر ناظر کی موجودگی سے مضطرب ہوں، مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے میرا دل گلاز کر دیا ہے۔“

”اہل ثروت حاجت مندوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ مفلس مہردی میں ٹھہرتے ہیں۔ کوستا فی رش میں کانپ رہے ہیں۔ چٹانوں میں پناہ گزیں ہیں۔ اماران بھوکوں کا اناج چھینتے ہیں، جنہوں نے ان کے بے کولہو چلائے۔ جو ان کے لئے شراب کشید کر کے خود پیاسے رہتے ہیں۔ جو شہر پناہ سے باہر کھتے ہیں۔“

”میں نے غیر کی آرزو کی اور مجھے شرط۔ روشنی کا منتظر رہا اور تار کی پائی۔“

”جب وہ رب کریم میرے شمالی حال تھا اور میری اولاد میرے ساتھ تھی، جب میں اپنی سیڑھیاں کھن سے دھوتا تھا۔ میں شہر میں نکلتا تھا تو نوجوان مجھے دیکھ کر چھپ جاتے۔ بوڑھے تنگناٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ شہزادے بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے۔ کیونکہ میں غریب، کا حامی و نگہبان تھا۔ میری جڑوں ندی لگا سے پھیلی تھیں۔ میری شاخ پر شبنم گرتی تھی۔ میری عظمت و شوکت تروتازہ تھی۔ لیکن اب نوجوان جن

کے باپوں کو میں اپنے گلے کے کتوں کے ساتھ بھی نہ بٹھاتا، میری تشویش کرتے ہیں۔ اور آندھی کی مانند مجھ پر حملہ آور ہیں۔ اور تب میں نے اٹھ کر صبح سے کہا۔ میں آندھے کا بھائی اور نویم کا ساتھی ہوں میری کھال جل گئی۔ میرا برساتا رو رہا ہے۔ کیا خدا میری حالت نہیں دیکھتا۔ کاش وہ میری فریاد سنے، کاش میرے دشمن ایک کتاب لکھیں جسے میں اپنے کندھوں پر رکھوں اور تاج کی طرح پہنوں، اگر میری زمینیں میری وجہ سے نگرگناں ہیں، تو کاش گیہوں کے بجائے گوکھر دارو جو کے بجائے گھاس پھوس ان پر لکیں۔ ایوبؑ کے الفاظ ختم ہوئے۔

”تب جو لے میں سے خداوند عالم نے ایوبؑ کو جواب دیا۔۔۔“

پادری نے بائبل بند کر دی، چارلس کرسی کی پشت سے سڑنکائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر پادری دیکھا۔

”ان تینوں دانش مند دستوں کے نام کیا تھے جو ایوبؑ کو سمجھنے آئے تھے؟“

”ایلی ہو، بل داد اور ایلی ناز۔“ پادری نے جواب دیا۔

”ایلی ہو، بل داد اور ایلی ناز۔“ چارلس نے ذرا کٹائی ہوئی آواز میں دہرایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا

ذہن کیسے ادھر بھٹک رہا تھا کیونکہ وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا۔۔۔ کرنل جوئیل جو مکان میں مقیم تھا وہ بھی اسی رات ان شعلوں میں بھسم ہوا، تم بھی اس کے ساتھ جل کر کوئلہ ہوئیں۔ تمہارا خوب صورت جسم کوئلہ بنا۔ تم مرتے وقت بھی مجھ سے بے وفا تھیں۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔

اس نے میز پر سے نیا عہد نامہ اٹھایا اور صفحے الٹے لگا۔ اُسے بھی ”یوحنا کے نکاشے“ نے متوجہ کیا اور سب سے پہلے اس کی نظر پڑی۔ ”اور پھر جب میں نے نگاہ کی تو آسمان کے برج میں ایک عقاب کواڑتے دکھیا اور بڑی آواز سے کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آوازوں کے سبب مجھ جی کا بھونکنا ابھی باقی ہے زمین کے رہنے والوں پر افسوس، افسوس، افسوس۔“

”اور ان سات فرشتوں میں سے جن کے پاس سات پیلے تھے، ایک نے مجھ سے کہا آئیں تجھے اس بڑی کسی کی سزا دکھاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہے۔“

چارلس بارلو نے زور سے کتاب بند کر لی۔ یہ سطور بائبل کے متعلق ہیں۔ لندن کے متعلق نہیں۔

وائیٹ بارلو۔۔۔ مرحومہ۔۔۔ کے متعلق بھی نہیں۔ بائبل۔۔۔ بائبل۔۔۔ بائبل۔۔۔

اب میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ اب مجھے حاضری کمانا چاہیے۔ اب مجھے۔

کاؤری کے کنارے اجاڑ بنگلہ — پدیا کے کنارے اجاڑ بنگلہ — اجاڑ —
 " اس نے زور سے آواز دی۔

عبدالغفور اچانک سامنے آن موجود ہوئے۔ وہ بید طول اور پریشان نظر آ رہے تھے۔ "صاحب
 ڈراما سا حاضری کھا لیجئے۔ اب تین بج رہا ہے۔"

چارلس بارو نے انتہائی مشکور نگاہوں سے اولڈ عبدل کو دیکھا۔ "اچھا۔ تھینک یو عبدل
 — پادری میرے ساتھ بیچ کھا کر جاؤ۔"

"تھینک یو، مسٹر بارو۔"

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز پر بیٹھ کر پادری نے گریس پر بھی سوپ کے بعد عبدالغفور
 اور س خاموشی سے سرو کئے۔ اسی خاموشی سے کھا نا ختم کر کے چارلس اور پادری باہر نکلے۔
 "پادری۔ میں ایس کو آج ہی جینز ٹرنک کال کر دوں گا کہ وہ روزی کی غیرت معلوم کر لیں،
 س ہے کہ میں رہائی کی کوشش نہیں کر سکتا۔ ماں اگر وہ معافی مانگے لے۔"

"وہ معافی نہیں مانگے گی۔"

"تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا، پادری۔ چارلس نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

ما حفظ پادری سے۔"

"خدا حافظ! گوڈ بلیس یو، مسٹر بارو۔"

چارلس بارو اندر چلا گیا۔ پادری ہنرچی نے ہیٹ ریک میں سے چھتری اٹھائی۔ اب ان کے
 من بھر کے ہو چکے تھے۔ اب ان کو معلوم تھا کہ روزی کی قسمت میں بہت طویل قید ہے۔

مر قید —

وہ مہر جھکائے جوں کی چال چلتے برسائی سے باہر نکلے اور پھاٹک تک اس طرح پہنچے جیسے کسی
 کے ساتھ جا رہے ہوں۔ پھاٹک پر کھڑے ہو کر انہوں نے آسمان کو دیکھا۔ پھر سوچا اب
 باؤں بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی تھی۔ وہ پھاٹک سے باہر آ کر ایک طرف کو چند قدم چلے،
 بذب کے عالم میں ہٹھک گئے، پھر چلنے لگے۔

نواب قمر الزماں چودھری

نواب قمر الزماں چودھری پھل سیٹ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھتے چنڑی کی لقری موٹھ پر اپنا اپنی سیاہ بیوک میں ارجمند منزل کی طرف چارپے تھے۔ جو ڈھی ایگزادس سے چند فرلانگ پر واقع تھی۔ وہ گھر کے قریب پہنچ چکے تھے، جب ان کو پادری بنرجی کچھوے کی چال چلتے منہ اٹھائے ایک طرف کوچہ نظر آئے۔ ان کے چہرے کی حالت دیکھ کر نواب صاحب کا دل دہل گیا۔ انہوں نے سوٹرز کو انی ادارت پادری کے پاس پہنچے۔

پادری نے ان کو دیکھا اور یک لمخت اطمینان کی سانس لی۔ نواب قمر الزماں اس وقت ڈوبنے کو تنکے کا سہارا معلوم ہو رہے تھے یا فرشتہ رحمت۔ نواب صاحب نے خاموشی سے ان کو اپنے برابر کار میں بٹھایا۔ صبح کا اخبار پڑھ چکے تھے۔

ارجمند منزل پہنچ کر وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر بیٹھ گئے۔ پادری کو بٹھایا اور چائے منگوا کر سامنے لان پر آلا بنر الزماں کے نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے ٹھہل رہی تھی۔ اندر ریڈیو بج رہا تھا۔ پادری بنرجی نے جیب سے اخبار نکال کر نواب صاحب کے سامنے پیش کیا۔

”میں پڑھ چکا ہوں۔ نکلا اخبارات میں زیادہ مفصل خبریں ہیں۔“ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ لیشیر جا۔ لے کر آیا۔

”میں ابھی ڈی ایم کے پاس گیا تھا۔ اس نے کوئی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔“ نواب صاحب نے چائے بنائی۔

”ڈی ایم کی بیوی لندن کی بیاری ہیں ماری گئی اور آبائی مکان بھی جل گیا۔“

نواب صاحب نے آنکھیں پھیلا کر پادری کو دیکھا۔ پادری اس وقت ایک سیاہ لپوش پینا میر نظر آ رہا تھا۔ جس کے پاس بری خبروں کے عبادہ اور کچھ نہ تھا۔

”اللہ رحم کرے۔“ نواب صاحب نے آہستہ سے کہا۔

اچانک پادری کھڑا ہو گیا۔ ”نواب صاحب میں ڈاکٹر سرکار سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت نوٹہ صدے کی وجہ سے پادری لوکھنا گیا ہے۔ بے چاند۔ بے چارہ۔“

”آپ بیٹھے پادری صاحب۔ میں بخوتے بابو کو ابھی بلواتا ہوں۔ کیا وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں گے؟“

”میں ڈاکٹر سرکار سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“ پادری نے دہرایا۔

نواب نے نالی بیانی۔ شہلئی ہوئی مالا قریب آئی۔

”ڈرائیور کو بلاؤ۔“

ڈرائیور حاضر ہوا۔

”نوٹے بابو کو فوراً ساتھ لے آؤ۔ کہنا ہے حد ضروری کام ہے۔“

پادری اور نواب چپ بیٹھے رہے۔

کچھ دیر بعد موٹر دوبارہ برساتی میں داخل ہوئی۔ چادر لپیٹے ہوئے بابو دقار سے سیڑھیاں سے نواب نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور قریب کی کرسی پر بٹھایا۔ نوٹے بابو نے پادری کو دستکار

در نواب سے پوچھا۔ ”میں انجینی بھی فریڈ پور سے واپس آیا ہوں۔ ہمارا سفر کے کپڑے بھی نہیں بدلے

کیا بات ہے خیریت؟“

”خیریت؟“ پادری ایک دم برس پڑا۔ ”میں آپ کو بتانا چاہتا تھا، یہ سب کچھ آپ کی نظر کی وجہ

ہوا۔ سب کچھ۔“

نوٹے بابو نے خیریت سے پہلے پادری کو دیکھا اور پھر نواب کو۔

”تمہیں نہیں معلوم ہوئے۔“ نواب نے آہستہ آہستہ کہا۔ ”روزی کئی صبح اشترڈی کی بغادت میں

جو کی پرچو کرتی ہوئی قید کرنی گئی۔ پولس فائرنگ سے کئی حملہ آور مارے گئے۔ روزی کے سخت زخمی ہونے

ملاع خرمیں شامل ہے۔ یہ کل رات کی خبر ہے۔ یہ شاید کل صبح کے اخباروں سے معلوم ہوئے کہ اس کا کیا

ہے اور کس جہں میں بھیجا گیا ہے۔ زخمی قیدیوں کو تو شاید جہلی کے اسپتال میں رکھا جاتا ہے۔“

اندر کسی کمرے میں۔ نیز الزماں گراموفون بجا رہے تھے۔ اچانک تدرال کارینار ڈیجنا شروع

توڑو۔ بھوڑو۔ مارو۔ آگ لگا دو۔ آندھی طوفان بن جاؤ۔ میں سرکش ہوں۔ اصولی شکن۔

بربادی کا دلیوتا۔ باغی۔ میں ہمیشہ سربلند رہوں گا۔

”لا حول ولا قوۃ۔ اسٹاپ اٹ“ نواب نے بے حد آزر دگی کے ساتھ زور سے آواز دی۔

گیت ختم ہو گیا۔

پادری نے سراٹھا کر بنوے بابو پر نظر ڈالی۔ اتنی دیر میں شاید وہ اپنے غصہ پر قابو پا چکے تھے۔ انہوں نے سپاٹ آواز میں کہا: ”بنوے بابو میری فرمائش پر کبھی کوئی سپاٹ آواز نہ آئی۔ اس راستہ پر لگایا۔ اسے دیپا کی صحبت نے برباد کیا۔ بس میں آپ سے اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں اور یہ بھی کہ آپ کی حیثیت سے آپ کا فرض تھا کہ آپ دیپا کی گرفتوں کی سنگت سے روکتے۔ میں نے اپنے بھرپوری کوشش کی، اپنی سچی کوشش کی۔ مگر اس کے دماغ میں زہر بہت اچھی طرح بھرا جا چکا تھا۔“

”آپ لوگ سب غالباً مجھے ایک رجعت پسند مسلمان زمیندار سمجھتے ہیں۔ مگر لڑکیوں کی آزادی کے یہی سب نتائج ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنی لڑکیوں کو اجازت نہیں دی کہ گھر سے قدم نکالیں۔“ نواب نے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں کہ دیپا کی کس حد تک سیاسی مشاغل میں حصہ لیتی ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹرمنسٹ تحریک میں شامل نہ ہوگی۔ اور میں نے اس کے قول کا اعتبار کیا ہے۔ علاوہ ازیں اگر وہ مجھ سے چھپا کر کسی سیاسی تحریک میں شامل ہے تو تب بھی میں کچھ نہیں کر سکتا تھا نہ اسے منع کر سکتا ہوں۔ ہر نئی نسل اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ آپ نے بھی اور میں نے بھی اپنے اپنے طریقے سے اپنے لئے نئے راستے تلاش کئے تھے۔ منموہن بابو آئیے خدا سے امید کریں کہ روزی خیرت سے ہو۔ آپ پر اس وقت جو سمیت رہی ہے وہ میں سمجھ سکتا ہوں۔ دینش بھی۔“ پھر وہ چپ ہو گئے۔

طارم نے سچوان لاکر نواب کے پاس رکھا۔ پادری نے سراٹھا کر دفعتاً نواب کو مخاطب کیا۔ اور آپ بھی۔ آپ کا انگریز کے چلے جانے سے کیا فائدہ ہوگا، نہرو نے دسیوں بار کہا ہے، رجواڑے ختم کر دیئے جلاؤ گے۔“

نواب حقہ لڑھکاتا رہا۔ سیاست حد سے زیادہ ٹھنک ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر۔ یہ خستہ حال کالا پارک اور خستہ حال ڈاکٹر۔ ان دونوں کو غالباً آزادی سے فائدہ ہوگا۔ مگر واقعی مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ ریاست البنہ چلی جائے گی۔ میں نے اقتصادی پہلوؤں پر زیادہ غور نہیں کیا۔ مگر اقتصادی مسائل پر غور کر کے دیکھنے ہی

فت پجار کھی ہے۔

دو تو کے خیال نے انہیں یک نخت بید مضطرب اور طول کر دیا۔ وہ سچوان گڑ گڑایا کئے۔ پھر انہوں نے پادری سے کہا۔ ”منوموہن بابو۔ میں بھی سمجھ سکتا ہوں، آپ کے دل پر کیا گور رہی ہوگی۔ اپنے لادے بھانجے کا خیال آتا ہے تو میرا دل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس نے کس طرح ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تم نئی نسل کی بات کرتے ہو بنوے۔ یہ بڑی احسان فراموشی، ام نئی نسل ہے۔ پچھلے سال تمہاری سچی مجھ سے بحث کرنے لگی۔ قربانی اور تیاگ۔ یہ اورہ۔ سچی سے کیا کہتا کہ سیاست کی قربان گاہ پر میں اپنی مسرتوں کی قربانی دے چکا ہوں۔ میرے ہونہار کو سیاست ہٹ رہی گئی۔“

”تمہارا کون بھانجا کو مر میاں؟“ بنوے بابو نے پوچھا۔

”تم سے بنوے برسوں میری ملاقات نہیں ہوتی۔ تم میرے حالات سے اجنبی ہو چکے ہو۔ اس قصہ کو بھلائے رکھنا ہی میرے لئے بہتر ہے۔ میں اپنی اس ٹریجڈی اور اپنی بیٹی کی قصہ کی پردہ پوشی ہی میں ماییت سمجھتا ہوں۔ رہنے دو یوں ہی بات سے بات نکل آئی۔“

”سوری کو مر میاں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔“

مگر اب نواب آہستہ آہستہ سچوان گڑ گڑاتا اور کہتا رہا۔ ”میری آنکھوں کا تارا۔ میری مرحومہ شانی۔ میرا لڈلا۔ جس پر فخر کرتے کرتے میں پھولانہ سماتا تھا۔ جس کی میں نے زندگی بنا دی۔ اور میرے ساتھ۔ میری لڑ۔ میرے ساتھ کیا کیا؟۔ یہی۔ منوموہن بابو۔ یہی۔

ہوڑو، آگ لگا دو، اینٹ سے اینٹ بجا رو۔ منوموہن بابو۔ آپ اور میں اور بنوے ہم سب میں سوار ہیں۔ روٹو۔ روزی۔ دیپالی۔ یہ سب مل کر ہم کو اس چیز کی سزا دے رہے ہیں کہ ہم نے یہ ایک محفوظ دنیا تخلیق کی تھی۔ یہ لوگ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ اس محفوظ اور مومن دنیا میں کو نیست و نابود کر دیں۔“

”مگر کس لئے۔؟“ پادری نے پوچھا۔ ”ہیں نیست و نابود کرنے کے بعد یہ کس قسم کی دنیا

؟“

اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔ نواب نے افسردگی سے کہا۔

بنوئے بابو صوفے سے اٹھے، پادری صاحب بھی اٹھے، ”مجھے معاف کر دینا بنوئے بابو، میں ہوں
 داس کھو بیٹھا ہوں۔“ بنوئے بابو نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 نواب صاحب کرسی ہٹا کر پادری کے نزدیک آئے۔
 ”منموہن بابو۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ دعا کرتے رہئے۔ روزی یقیناً خیریت سے بہت
 بھر لوٹے گی۔“

پادری نے بے یقینی سے اقرار میں سر ہلایا۔ نواب نے نیچے اتر کر میوک کا دروازہ کھولا۔ پادری
 ڈاکٹر چھپے بیٹھ گئے۔ ڈرائیور لپک کر آیا۔ موٹر میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ موٹر آگے بڑھ گئی۔
 رات کو راجندر منزل میں نواب کی پہلو ٹھی کے پوتے منوہر الزماں کے حقیقے کے سلسلے میں بڑا بھار
 تھا۔ آٹھ بجے مہمان آنے شروع ہو جائیں گے۔

_____ بابریہ عیش کوشش _____ ؟

نواب برساتی سے نکل کر پائیں باغ کی سمت چلے گئے۔

ہم تینوں۔ ریس۔ سرکار اور نیرجی۔ ہم تین بنگالی، تین مختلف راستوں پر کھڑے ہیں۔ میں اور
 دوا ایسے کعبے میں جن کو گھن لگ چکا ہے۔ مگر پال میٹھیو نیرجی بے چارہ یہ بات سمجھ نہیں سکتا، اور
 کر بھی کیا کر لے گا۔

پچھلے لان پر بیچ کر ان کو بار لو کی میم کا خیال آیا۔ پادری نے بتایا تھا کہ سناؤنی سن کر بار لو نے
 بہادری اور ضبط سے کام لیا۔ خالص اسٹف اپریٹ۔ بھی اگر ایسی ہمیں۔ ہوتیں تو ساری دنیا پر حکومت
 کرتے۔ نواب لان پر ٹہلنے لگے۔ کل سارے عمارتیں شہر تلمزیت کے لئے جائیں گے۔ مجھے بھی جانا ہو گا۔ وا
 بار لو جنگل کی یورپین سوسائٹی میں کافی دل پھینک مشہور تھی۔ خاصی آوارہ۔ مچھلی کی طرح پیتی تھی۔ جو
 مرگئی غریب۔ بار لو اس کی وجہ سے بہت دکھی رہتا تھا۔ اب روزی کے لئے کیا کیا جائے۔ کچھ
 ہو سکتا۔ روزی کی ماں پندرہ سالہ گری بالا اسی تالاب کے کنارے بیٹھ کر برتن مانجھا کرتی
 اور میں اس درخت کے پچھے پچھے چھپ کر اسے طرح طرح سے پھینڈنے کی کوشش کرتا تھا۔ وقت کسٹ
 ہے، کس طرح بدلتا ہے، اللہ غنی،

”نواب صاحب _____ ایک کلرک نما نوجوان باغ کی سڑک پر بیچ کر سائیکل سے اتر

نزدیک آکر سلام کیا۔ ”کل شام آفس میں یہ فون آیا تھا۔ یہ پیغام ہے۔“ اس نے جیب سے ایک کاغذ لے پیش کیا۔ میں نے آپ سے ملاقات کا وقت آج ساڑھے پانچ کا دے دیا ہے۔ کیوں کہ آپ کو اسی

_____“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ نواب کارنگ پرچہ پر لکھا نام پڑھ کر سپلاٹڑ چکا تھا۔

”تم جاؤ۔ اندرجاؤ۔ متعلقہ کاغذات میز پر لگا دو۔“ انھوں نے خالی خالی آواز میں کہا۔

”بہت اچھا۔“ نوجوان سائیکل سنبھال کر کتب خانہ کی طرف بڑھ گیا۔

نواب چند لمحوں تک گھاس پھٹھکے کھڑے رہے۔ پھر نظریں اٹھا کر اوپر کی منزل کو دیکھا، اڑانے کرے کی نیلے شیشوں والی کھڑکی ہوا کے جھونکے نے کھٹ سے بند کر دی۔ وہ اس کھڑکی کو چند تاہک مہیوت تکتے رہے۔ پھر اپنی رسٹ واپس پر نظر ڈالی، اور سر جھکائے آہستہ آہستہ کتب خانے سے روانہ ہو گئے۔

۲۶

ریحان الدین احمد

اس صبح جس وقت چارلس بارلو چھوٹا حاضری کے بعد اپنی اسٹڈی میں جا کر ”نغماتِ ہند“ کے میں مصروف تھا۔ ڈی ایمز اس سے کچھ فاصلے پر ووڈ لینڈز میں کریم خانہ نے بریک فاسٹ سب معمول تازہ پتیر لگا کر رکھا۔ اور چائے دانی لینے کے لئے اندھ چلا گیا۔ او مارے نے ٹوسٹ کاتے لگاتے اخبار کی سرخیوں پر نظر ڈالی۔ درق لٹے اندر کے صفحے پر ایک سرخی نے ان کو متوجہ کرنے لگا۔

”ریحان _____ جلدی آؤ۔“

بریک فاسٹ کی میز پر ڈی لینڈز کے پہلو کے برآمدے میں لگی تھی۔ گیسٹ روم کا دروازہ برآمدے کے ملتا تھا۔ شیو کے صابن کا جھاگ تولیہ سے صاف کرتا ریحان الدین احمد کمرے سے نمودار ہوا۔

کیا ہوا _____ ۹

”یہ دیکھو۔ سنسنی خیز گرفتاری۔ اوما بی نے سر اٹھا کر اخبار اس کی طرف سرکادیا۔
کے قریب جھک کر اس نے اچھٹی نظروں سے پورے کالم کا جائزہ لیا۔

”کماری روزی ہنرچی، کماری سندھیا گھوش اور۔۔۔۔۔۔“ وہ تیوری پریل
بیٹھا اور خبر کو دوبارہ غور سے پڑھنا شروع کیا۔

بیرو چائے دانی لے کر حاضر ہوا۔ امانے ریجان کے لئے چائے بنائی۔

”لو چائے تو پی لو۔“

”پی لوں گا۔۔۔ غضب ہو گیا۔ اوما۔ محمود الحق اور حیوتی دونوں شہید ہو گئے۔ رڈز
کتی بڑی طرح زخمی ہوئی ہوگی۔ اس خبر کا کیا، کیا بھروسہ ہے۔“
”پور کر۔“

”محمود اور حیوتی دونوں۔۔۔ ریجان نے اخبار پر سے سر کاٹ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔
منٹ تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ امانے مضرب ہونے کے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رد ہوا تھا۔

”اوہ ریجان۔۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔۔“ اومانے اس کے بازو پر زخمی سے
”سوشلسٹ فرنٹ! ابھی جانے اور کتنے مارے جائیں گے۔ اوہ گاڈ۔۔۔ ابھی اوما
حیوتی نے کس جوش و خروش سے مجھ سے بحث کی تھی۔ اودادی، جے پی، لوہیا انڈر گراؤنڈ
پرکھیں کہ جن انڈولن کوڈا کرکٹ کر رہے ہیں، اور آپ ریجان دار۔ اگر میزوں کے پتھو بن گئے۔۔۔
نو۔۔۔ نوٹ حیوتی۔ نوٹ۔“

”اتنا غم نہ کرو ریجان۔ انڈولن میں اسی طرح جائیں جاتی ہیں۔ سال بھر پہلے تم بھی کسی
مارے جاسکتے تھے۔۔۔ لو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔۔۔“

”اوما۔۔۔ ریجان نے غصہ سے کہا۔

”سوری اولڈ ٹیپ۔۔۔ تم ہمیشہ یوں ہی مارے مارے پھرتے ہو۔ نہ کھانے کی سکر
لے چائے ملتی ہوگی۔ چند روز کے لئے میرے یہاں ہو تو اپنی صحت کا خیال رکھو۔“

”اوہ۔ سوری اوما۔ لاؤ۔ میں بہت upset ہوں۔“

”میں کیا upset نہیں ہوں۔ تم املیٹ کھاؤ گے نا۔“

”ہاں۔ دیدو۔“

”اب کچھ دیر کے لئے یہ تکلف وہ حالات بھول جاؤ۔ آرام سے ناشتہ کرو۔ آج پھر تم کو دن بھر روڑ دھوپ کرنی ہے۔ آتے ہی فریدپور بھاگ گئے۔“ انھوں نے ٹوسٹ دو حصوں میں کاٹ کر ریمان کے سامنے رکھا۔ آلیٹ پر کالی مرچ ننگ چھڑکا۔ اور بچوں کی طرح چھری کا نسا اٹھا کر اس کے ماتھے میں پکڑوایا۔

ہسکرا دیا۔

”ناؤ بی لے گڈ لو اے، اینڈ ریٹ۔“

وہ سر جھکا کر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ آدھا اس کو دیکھتی رہی۔

”تمہارے ابا کیسے تھے، خیریت سے تھے؟“

”کون۔۔۔؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”تم اپنے گاؤں گئے تھے نا۔ شونا پور۔ مجھ سے تو یہی کہہ گئے تھے۔“

”اوہ۔۔۔ ہاں۔ نہیں۔ ہاں بالکل اچھے میں۔ یقیناً یو۔“ اس نے ایک لمحہ نکل کر بھر اخبار کی

ت ماتھے بڑھایا۔ آدھا نے جھپٹ کر اخبار اٹھا لیا۔

”نہیں بلے گا۔ فٹس بوزر ریڈ اسٹ فوسٹ۔“

وہ پھر نیٹ پر جھک گیا۔

”رات تم بہت دیر سے آئے۔ کیا پارٹی انفس میں اتنی دیر لگ گئی؟“

”رات۔۔۔ اوہ۔۔۔ ہاں۔ نہیں۔ رات میں دیپالی کے ہاں جلا گیا تھا۔“ دیپالی۔۔۔؟“

”ہاں۔ کیا بھول گئیں اُسے؟ دیپالی سرکار۔“

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ“ نور الرحمن میاں“ کے زمانے کے بعد بھی تمہاری ماس سے جان پہچان ہے۔“

”ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کا تم سے ذکر کرتا۔ دراصل وہ بھی کلی ہی فریدپور سے لوٹی ہے۔“

”را اس سے اتفاقہ ملاقات ہو گئی۔“

”اوہ۔ آئی سی۔“ آدھا نے زور سے چھری کا نسا اپنی پلیٹ پر پٹخا اور غصہ سے میرے کو آواز دی۔

”کریم خاں۔۔۔۔۔“

بیرہ مہرعت سے نمودار ہوا۔

”کریم خاں۔ روز مینا کرتی ہوں کہ اندامات بائبل مت کرو۔“ غصے سے ایک دم ان کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

”اوہ آوہ۔ دوسرا انداز بنالو۔ ایسی بھی کیا قیامت آگئی۔“

”نہیں۔ تم جانتے نہیں۔ ممی گھر پر نہ ہوں تو یہ لوگ بالکل بیگار مارتے ہیں۔ ڈیم۔“

بیرد غائب ہو چکا تھا۔

”کم آن۔ آوہ۔“ ریحان نے ہنس کر کہا۔ ”کوئی کانگریس سوشلسٹ سنے گا تو کہے گا کیونٹ

یڈراس طرح اپنے نوکروں کو ڈانٹتے ہیں یہ

”اوہ شٹ آپ“

”آوہ۔ تمہارا غصہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ آملیٹ ختم کرنے میں مہر دہ ہو گیا۔

سیزر ریشیاں پھلانگتا برآمدے میں آیا اور اپنی مالکن کے قدموں کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ آوہ۔

ناگواری سے اس پر نظر ڈالی۔

بیرے نے دوسرا انداز لاکر آوہ کے سامنے رکھا۔ ریحان نے نظر بچا کر شرارت سے کریم خاں کو آ

ماری۔ لہڑوہا بیرہ بید خفیف سے مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹ پچکا کر پچھے بٹا اور جا کر میز سے کچھ فاصلے

پر اپنی ڈیوٹی پر کھڑا ہو گیا۔

چند لمحوں کے بعد یہ جان کر کہ آوہ اپنی کاغصا بٹھنڈا ہو گیا ہوگا، ریحان نے کہا۔ آوہ۔

”یہ تم کو ایک ہرزوری بات بتانا چاہتا تھا۔“

”کریم خاں۔۔۔ دھوبی سے پوچھو میری ساریاں استری کر دیں۔“

کریم خاں اشارہ سمجھ کر غائب ہو گیا۔

”بل بتا دیا یا ت ہے۔“

”میں دیپالی سے شادی کر رہا ہوں۔“

اندھے کا چمچہ سنبھالے آوہ اپنی کا ہاتھ ہوا میں معتن ہو کر رہ گیا۔

”اس کے بغیر اگر میں جیتے ہی مر گیا تو مود منٹ نقصان ہوگا۔“ ریحان نے مصنوعی سنجیدگی

بیوضاحت کی۔

آدا اب عینک اتار کر بھونکی سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

”کیوں آدا؟“

”تم۔ تم ریمان۔ جب سے ہم کالج میں داخل ہوئے۔ لندن میں رہے ایک ساتھ سیاسی کام۔ تم نے آج تک مجھ سے اپنا کوئی ذاتی راز نہیں چھپایا تھا۔ پھر اتنی بڑی بات مجھ سے کیوں پوشیدہ

ہی؟“

ریمان فدا سُرخ ہو گیا۔ عورتیں۔ ”آدا۔“ اس نے متانت سے کہا۔ ”ماتا ہوں تم میری دوست، سفی اور گائیڈ ہو۔ مگر یہ میرا بہت ہی۔ بہت ہی ذاتی معاملہ تھا اور میرا خیال تھا کہ ایک عورت دوسری دست کے سلسلے میں کبھی غیر جانبدارانہ رائے نہیں دے سکتی۔“

”یہ تم میسر لے کر رہے ہو، میں جو تم کو اپنا۔ اپنا۔“

”اوہ۔ کم آن آدا۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو میری اس رازداری سے دکھ پہنچا۔“

”کیوں۔“ آدا نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ”اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ تم سے پسند کرتے ہو تو پہلے سے دوگنا اس کا خیال کرتی۔ مجھے خود وہ لڑکی بہت پسند ہے۔“

”تمہیں بھی پسند ہے آدا؟“ ریمان کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ”وہ نڈفل۔ تو تم میرے غائب کو مانتی ہو؟“

”مجھے بہت پسند ہے۔ میں ہی اسے مودمنٹ میں لائی ہوں۔ تم بھولتے ہو کہ ایک لحاظ سے ری ہی وساطت سے اس سے تمہاری ملاقات ہوئی۔“

”یہ تو غلط ہے آدا۔ اس پر تو میں بہت پہلے زہر کھا چکا تھا۔ ٹو ایٹ فرسٹ سائٹ دیکھو۔“

”نیرہ۔“

”تم جذباتی طور پر ابھی تک بیڈ اسپور ہو۔“
”ابھی تو تم میرے انتخاب کی تعریف کر رہی تھیں، پھر میں اسپور کیسے ہوا، آدا اپنا ہارڈ ٹو پائلڈ
را تو کھاؤ۔ تم کو اس اطلاع سے ایسا۔ ایسی حیرت ہوئی ہے کہ بے چارے محمود اور حیوتی کی
ہمدات کا بھی ایسا ری ایکشن نہیں ہوا تھا۔ کمال ہے۔“

آدا چہرہ سخت کر کے چاندی کے ننھے چمچے سے انڈے پر کھٹ کھٹ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ریحان کہنیاں میز پر رکھے انہیں دیکھتا رہا۔ یہ شاید میری زیادتی ہے۔ ایسی مخلص دوست کے
 میں ایسی سخت باتیں کر رہا ہوں۔ "سوری اوما۔ واقعی مجھے بہت پہلے تم کو اپنا ہمارا بنا چاہئے تا
 مگر حالات بھی تو کیسے ہمارے تھے۔ مستقل انڈر گراؤنڈ، مسلسل احتیاط، اور پھر وہ اتحق بھی نہ
 کیوں مجھ سے خفا ہو گئی تھی، نہایت محنت سے اب جا کر اسے ذرا راہ راست پر لایا ہوں۔ انہی
 کرنا بھی خاصی مشفق ہے۔ تم تو کبھی اس چکر میں پڑی نہیں، تمہیں کیا معلوم۔"

اوما چپ چاپ اٹھا کھانے میں مہرور رہی۔

"لو۔ اب تم خفا ہو گئیں۔ یہ کیا مصیبت ہے یار" پھر اس نے دفعتاً بڑی گھبر آواز میں کہا:
 "اوما۔ تم جانتی ہو، میں مدتوں گاؤں جا کر اپنی بہن سے نہیں مل پاتا۔ ڈھاکے میں اپنے نوار
 رشتہ داروں سے ملنے کا مجھے کوئی شوق نہیں۔ صرف تم ہی میرے لئے سب کچھ ہو۔ تمہارے خلوص کی
 سے یہ گھر تک مجھے اپنا گھر معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ۔" وہ مسخرا ہنسا۔ "ووڈ لینڈ کو اپنا گھر سمجھتا
 ہے مگر ہر حال اتفاق سے تم اسی محل میں پیدا ہو گئیں۔ کیا کیا جائے۔ تم جہاں رہو گی وہی میرا گھر
 اومانے بلکیں چھپکائیں۔ ان کی عینک کا شیشہ دھندلا ہو چکا تھا۔ ریحان جھینپ کر دوسری
 دیکھنے لگا۔ وہ جذباتیت سے بے انتہا گھبراتا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی خاصا جذباتی ہو رہا
 ہے۔ وہ جلدی سے کرسی چھپے سر کا کر اٹھا۔ اور پیک کر اپنے کمرے سے سگریٹ اور ماچس اٹھا لایا
 سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھنے ہوئے لبشاش آواز میں اس نے کہا "لاؤ گرام گرم چائے تو بنا کر دو۔"

اومانے آہستہ سے ٹی کوزی اٹھا کر چائے اس کی پیالی میں انڈیلی۔

"میں۔ میں تو اب چلا جاؤں گا واپس بیٹی۔ دینیائی تمہارے حوالے۔ تم میری غیر موجودگی میں اس
 خیال رکھنا۔ وہ ذرا بے وقوف سی لڑکی ہے۔ اگر کبھی کوئی حماقت کی بات کرے تو میری خاطر اسے معاف
 دینا۔ وعدہ۔"

"وعدہ"

"گڈ نائٹ اوما۔" وہ اطمینان سے چلے پینے میں جٹ گیا۔

"تمہارا خیال ہے بنوئے بلو اس شادی کی اجازت دے دیں گے؟"

"کوشش تو میں ہی کروں گا۔"

”چندر کنج جا کر میری سفارش کر دو۔ جھٹ پٹ۔“

”میں — —“

”دیپالی کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر کو رپہلی ملاقات ہی میں تم سے بے حد متاثر ہو گئے تھے۔ جب
”کھٹوم آیا“ کی سازش کے سلسلے میں اسے اپنے ساتھ فرضی طور پر کو میلا لے گئی تھیں۔ یوں اسے اگر اپنی
کے ہاں دیر لگ جائے تو وہ پریشان ہو جاتے ہیں۔“

”دیپالی کیا کہہ رہی تھی؟“

”کیا — — تمہارے متعلق — —؟“ اس نے ہنس کر جواب دیا۔ ”کہہ رہی تھی ایسا لگتا

”اوما دی نے بابا پر جادو کر دیا ہو۔“

”گڈ گاڈ۔“

”تسمیہ۔ اوما تم سچ مج جا کر زرا ان کے خیالات کا اندازہ تو لگاؤ۔“

”مجھے ڈل کلاس ہندو بنگالیوں کے خیالات کا اچھی طرح اندازہ ہے۔ بھدرا لوگ۔“

”مجھے بھی اندازہ ہے۔ مگر میں ہندو بنگالی بوئڈہ دانہ بھدرا لوگ کی نظروں میں کم از کم ”اشترا

توں ہوں۔ ذرا غور کرو۔“ وہ پھر ہنسا۔ ”ہمارے بنگال کی ہندو بوئڈہ دانہ بھدرا لوگ کو کس سر

انمازمیں ”اشترات“ کہہ کر گویا tolerate کرتی ہے۔!“

”اگر کوئی تمہارے اس لہجے کو سنے تو سمجھے کہ شاید تم بھی کیوں نہ ہو۔ سچے دل سے کیوں

ہیں۔“ اقدانے ہنس کر جواب دیا۔

”ریجان بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔“ ”بہر کیف تم اب اپنے دوسرے مشن پر چندر کنج

”کوئی ہندو یا مسلمان باپ چاہے وہ کتنا ہی روشن خیال کیوں نہ ہو اپنی لڑکی کو دوسرے

میں شادی کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔“

”تمہارے ڈیڈی بھی؟“

”میرے ڈیڈی کا یہاں کیا ذکر ہے۔“

”کیوں؟“ وہ ہنستا رہا۔ ”فرض کرو تم کسی ”اشترات“ سے بیاہ کرنا چاہو، یا عیسائی

انگریز سے یا چینی، جاپانی، روسی سے، تو سر پر تو ش اجازت نہ دیں گے، وہ تو بیدار ذہن خیال

”میسر سیاہ کا کیا ذکر ہے۔“

”ادکے، اوکے آدما۔ پختیوں کی طرح مشراؤ نہیں۔ ہے کوئی مرغانظر میں؛ چلو میں سرسری تو سن ری وکالت کردوں گا۔ تم ہوئے بابو سے میرا پردہ پیگنڈہ کرو۔ لاؤ ملاؤ ملاؤ۔“ اس نے دستاؤ سے آدما کا ہاتھ کھینچ کر زور سے مہافو کیا۔ آدما نے غصے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ ”ریحان۔ تمہارا رپن کب جائے گا؟“

”اسی لوڈ ہارن کو ختم کرنے کے لئے تو اب گھر لسانے کا ارادہ ہے ہمارا۔“

”کل شام کیا پروپوز۔؟“

”نہیں۔“

”ابھی تک کوئی بات ہی نہیں کی؟“

”یوں ہی۔ ذرا شاعری داعری بگھاتا رہتا ہوں۔ اس سے کہا تو ہے کہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ عدہ سنجیدگی سے۔ ایسا کہتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ اگر وہ اپنی یار دوست اور کامریقہ ہوتی، ٹکی ہوتی تو دوسری بات تھی۔ اب عجیب مسخرہ پن سا لگتا ہے۔ تم۔ تم میرا مطلب سمجھ نہیں سکتیں۔ سے formal طور پر کیا کہوں؟ بس ایک روز بھنگا کر لے جاؤں گا۔ بھنگا نے کالہی میٹم اسے البتہ لے لے۔“

”تم بالکل دیوانے ہو رہو تو۔“

”ہوں تو سہی۔“

اب ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ پہلو کا باغ سید تر تومازہ اور دلفریب معلوم ہو چکا تھا۔ ”اچانک آدما نے کہا۔۔۔“ تم بے چاری جیساں آرار کو اتنی جلدی بھول گئے۔“

وہ ایک دم اس غیر متوقع تذکرے سے ششدر سا رہ گیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہہ سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ ”اتنی جلدی تو نہیں، کافی عرصہ ہو گیا۔“

”او۔۔۔ یومین (MEN)۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ سیزر اب آدما ہی کے قدموں سے اٹھ کر گرا باری سے چلتا ہوا کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ لے دیکھی رہیں۔ پھر انہوں نے دوسرا سوال کیا۔۔۔ ”دیپاتی کو معلوم ہے؟“

”نہیں۔“

”تم نے اُسے کچھ نہیں بتایا؟“

”بتانے کی کیا خاص بات تھی۔ جہاں آرا بے چاری کی میری موجودہ زندگی میں اب کیا ہے کہ میں خواہ مخواہ اس کا تذکرہ پھیرتا۔ اور بات بھی کیا تھی کہ جہاں آرا کے والد مجھے اپنا گھر داماد

چاہتے تھے۔ ایسا اکثر مسلمان گھرانوں میں ہوتا ہے۔“

”دیپالی جہاں آرا کی گہری دوست ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“

”تم ابھی کہہ رہے تھے کہ پچھلے دنوں وہ تم سے خفا ہو گئی تھی۔ ممکن ہے اُسے معلوم ہو گیا!

اس وجہ سے وہ تم سے _____“

وہ جھنجھلا گیا۔ ”اگر اس وجہ سے ناراض تھی تو مجھے باآسانی بتلا سکتی تھی۔ وہ بے

صاف دل اور منہ بھٹ لڑکی ہے۔“ وہ دفعتاً چپ ہو گیا۔ اور تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”پتہ

لاحول ولا قوۃ۔ عورتوں کے دماغ بھی عجیب انداز سے کام کرتے ہیں۔ اُسے مجھے بتانا تو چاہ

تھا۔ اگر یہی بات ہے _____ مگر تم کو یہ خیال کیسے آیا؟“

”میں بھی عورت ہوں۔“

”لائیک ہیں۔“ وہ ایک لمخت سید پریشان ہو کر پیالی میں چمچ بجانے لگا۔ ”ادائی؟“

ادائے تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی عجیب آفت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے پارٹی کی طرف سے ما

سے یہی بات چیت کرنی ہے۔ ارجمند منزل جا کر _____ ادہ ہیں۔“

”ارجمند منزل کب سے نہیں گئے؟“

”مدین گزر گئیں۔“

”کیوں نہیں جاتے، کیا احساسِ جرم ستاتا ہے؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”کبھی جہاں آرا یاد آتی ہے؟“

”اپنی پہلی محبت کو ہنسان کبھی نہیں بھول سکتا ہے؟“

”تم نے مجھے ایک بار لندن میں سرسری سا بتایا تھا۔ وہ تمہاری فرسٹ کزن ہے نا؟“

”سکند۔ اب چھوڑو اس قصہ کو۔ گڑے مڑے اکھڑنے بیٹھ گئیں۔“

”بے چاری لڑکی۔“

”یو آر لے ڈیم گروک اوما“

وہ ہنسنے لگیں۔

”اور میں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے جس کے کنفیشن کی ضرورت ہے؟“

”سہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے متعلق تمہیں دیپالی کو اندھیرے میں نہ رکھنا چاہئے۔“

”ریٹ — آئی ایم افریڈ — از مائی اون بزنس۔“

اومانے تازہ چائے کے لئے گھنٹی بجائی۔ وہ اس جذباتی چھوکرے کو سینڈل کرنا خوب جانتی تھی

سراکرا ہنوں نے چند لمحوں بعد موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا — ”بے چارے محمود اور

— ہم اپنی باتوں میں مان دو فوں کو بالکل بھول ہی گئے۔“

ریحان نے پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ ”خدا کے لئے چپ رہو اوما۔“

وہ بھی خاموش ہو کر مارش کو دیکھنے لگیں۔ خدمت گار برآمدے میں آیا۔ اومانے چائے دانی کی

اشارہ کیا۔ — ”دہ چائے دانی اٹھا کر اندر چلا گیا۔ اومانے آہستہ

”مجھے اس وقت گرز ڈیڈ آ رہی ہے۔ کس طرح گویوں سے چھپنی ہو کر مری بے چاری۔ اسپین سے اتنے

بعد میں اطلاع ملی تھی۔ یاد ہے؟“

ریحان نے الم سے سر ملایا۔

”اور مجھے یاد ہے جب تمہاری امی کے انتقال کی خبر آئی تو تم نے کہا تھا ایک طرح سے اچھا

ا۔ اگر میں بھی گرز کی طرح کہیں موت کے گھاٹ اتروں تو اچھی زندہ نہ رہ سکتیں؛ اس وقت نہ

بے چارے محمود کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ حیوتی کے ماں باپ تو غالباً اس کے بچپن ہی میں مر

ریحان اب یہ غمناک تذکرہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بے صبری سے پہلو بدلا۔ اوما نکھیں بند کر

لیکن اب اتنے عرصہ بعد اچانک اس کی امی اس کے تصور میں آن موجد ہوئیں۔ میری امی — میری

اتنی۔ اُس نے دفعتاً سسر ہاتھوں میں چھپا کر میز پر رکھا دیا۔

”رُونو۔۔۔“

صرف اس کی اتنی اتنے پیار سے لے رُونو پکارتی تھیں۔ رُونو لو چائے آگئی۔ اٹھو۔
”رُونو۔ لو چائے آگئی۔ اٹھو۔“ اوما کہہ رہی تھیں۔

اُس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ اور چوروں کی طرح اوما پر نظر ڈالی۔ مائی لٹل مدر۔
اوما چائے گھولنے میں مصروف رہیں۔ وہ چپ چاپ اپنی پیالی کا انتظار کرنے لگا۔

”ایک بات سنو۔ مذاق بظرف۔“ اوما نے اسے پیالی دے کر کہا۔ ”تم نے اپنی غیر موجودگی؛
دیپالی میرے حوالے کی ہے۔ فرض کرو وہ تمہارے اس قصے کے بارے میں مجھ سے پوچھے تو میں اُسے
کیا بتاؤں۔“

”کوئی ایسی بات نہیں ہے، ہم خواہ مخواہ اتنی دیر سے لمبا چوڑا میلو ڈرامہ بنا رہی ہو۔“ راجا
پھر جھجھکا کر کہا۔

”مگر مجھے پوری تفصیل تو معلوم ہونی چاہئے۔ فرض کرو جہاں آرا اس سے کچھ کہے تو خود آرا
کی پوزیشن کتنی نازک اور awkward ہوگی اور وہ تمہارے متعلق کیا سوچے گی کہ تم نے دوا
کو ختم دیا۔ پہلے جہاں آرا کو دغا دی اور پھر اسے دھوکے میں رکھا۔ جبکہ وہ جہاں آرا کی اتنی بگ
دوست ہے۔۔۔ مجھے یقین ہے وہ اسی وجہ سے تم سے بے ک گئی تھی۔ نواب صاحب تم
گھر داماد بنانا چاہتے تھے۔ مگر تم کو جہاں آرا سے خود کوئی دلچسپی نہ تھی؛ تم بالکل بے قصور ہو۔“
”کیا میرا ٹرائل ہو رہا ہے؛ تم کو تو واقعی ہیر سٹر ہونا چاہئے تھا۔“

”تمہاری اتنی نواب تمہارے سبکی چٹا غدا بہن تھیں۔“

میری اتنی۔ میری اتنی۔

بادش کی لطیف دھند باغ پر منڈلاتی رہی۔ مہا میں پھولوں کی خوشبو سی ہوئی تھی۔

”پھر تمہیں جانکاد میں حصہ کیوں نہیں ملا؟“

”ادہ اوما۔۔۔ اوما۔۔۔ ڈونٹ بی سچ لے بور۔ تم کو تیرا چکا ہوں۔“ راجا

الٹا کر چھٹی لیتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم ساری الفٹ لیسٹ لے جانے کیوں پھر سننا چاہتی ہو۔ آل رائٹ

جانماد میں حصہ نہیں ملا۔ جس کی مجھے مطلق پرواہ نہیں۔ میرے نانا نانا بڑا فخر الزماں چودہوی
ب نور الزماں چودہری کے چھوٹے بھائی تھے۔ آیا خیال میں۔ یاد کرو۔ گرہ میں باندھ لو۔ اور
بار اپنے سوالوں سے مجھے بورہ کرنا۔ میرے نانا فخر الزماں چودہری نواب قمر الزماں کے والد نواب
زماں کے اکلوتے چھوٹے بھائی تھے۔ اب رٹ کر سبق سناؤ۔ چلو۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔
اوما قبقرہ لگا کر بنسیں۔ آگے بتاؤ۔ بڑا الف سیلوی قصہ ہے۔

”لایک ہل۔ الف سیلوی قصہ یہ ہے کہ نانا جان اپنے بڑے بھائی کی طرح بے حد رنجین
رج تھے۔ صرف کلکتہ کی گوہر جان پر ایک گاؤں نکھا اور کر دیا تھا۔ اور ایک وہ۔ بچپن میں سنا
تھا۔ لکھنؤ کی نوا پچوا اور دئی کی چھپیا اور بنارس کی بے نظیر۔ فیوڈل ڈیکٹنس کی بات کرتے
آپ لوگ۔ اس نے پیالی ذرا زور سے طشتری میں رکھی۔

”تم کو پتہ ہے ہم بورنڈ والوگوں کو تم فیوڈل لوگ سیدنی نیٹ کرتے ہو۔ اومانے مسکرا
بہا۔

”بکواس۔ بہر حال۔“ ریمان نے ماچس کے لئے پہلے کرتے کی ایک جیب میں پھر دوسری
ب میں ہاتھ ڈالا۔

”سگریٹ پینے بند کر دو۔ ہاں پھر کیا ہوا۔“

”پھر یہ ہوا کہ نانا جان نے ایک تھیر کیپٹی میں روپیہ لگایا۔ مرحوم خود بھی نامک لکھتے تھے۔
بند منزل میں باقاعدہ جلس گھر تھا۔ بہر حال۔ تھیر کیپٹی کا منجر سا روپیہ بن کر کے رنگوں بھاگ گیا۔
جب عین عالم جوانی میں نانا جان کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا
و وقت ان کے حصے کی زمینداری مہاجران کے ہاں رہن رکھی ہوئی تھی۔

”امی ان کی اکلوتی لڑکی تھیں۔ جب نانا جان مرے وہ شاید چھ یا سات سال کی تھیں۔ والد کے
نے کے دوسرے سال کالرا کی وبا پھیلی۔ اور اس میں ان کی والدہ بھی چل بسیں۔ امی اپنے تایا کے یہاں اپنے
نواب زادہ فخر الزماں کی جو جانماد فضول خرچی اور عیاشی سے باقی کچی تھی نواب نور الزماں نے بہن سے
مرا کر بھتیجی کے قانونی سرپرست کی حیثیت سے اپنے قبضہ میں لی۔ قاعدے سے امی کی ستاوی
تے۔ ایازاد بھائی یعنی نواب قمر الزماں سے ہونی چاہئے تھی۔ سگم نور الزماں اب شوہر کی تیماردار

بھتیجی کو کیوں خاطر میں لائیں۔ وہ کشتیہ کے ایک نواب کی لڑکی کو دیکھ آئی تھیں جو چیز میں گا
 مکنات، باغات اور پستان کے کھیت سب ہی کچھ لے کر آئی۔
 وہ سانس لینے کے لئے ریکا۔ ماچس سے کھیلنے لگا اور پھر بولا۔ ”امی ابھی سو سال کی بھی
 ہوئی تھیں کہ نواب نور الزماں نے ان کی شادی ایک نوجوان غریب مولوی سے کر دی۔ جو ان
 لڑکے کو عربی فارسی پڑھانے آیا کرتے تھے۔“

”اوہ۔۔۔“

”امی کا حمایتی یا پرسان حال ان کے نھیال میں بھی کوئی نہ تھا۔ باقی رشتے دار حسب معمول
 کی زمینداری کی مقدمہ بازوں میں جٹے ہوئے تھے۔ ایک یتیم لڑکی کی ذمہ داری کون سنبھالتا۔ ان
 ماموں اور نانا وغیرہ سب مر چکے تھے۔ نواب نور الزماں کے قریبی رشتے دار ہی امی کے نھیالی لوگ تھے
 اور سب نواب کی مطلق العنانی اور دبدبے سے خائف تھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ لڑکا سید اور جو
 شریف ہے اور نکاح پڑھو دیا۔ اور واقعی آیا بہت ہی فرشتہ صفت اور بھولے انسان نکلے۔ آیا
 گاؤں شوٹا پور نواب صاحب کے علاقہ کے پڑوس میں تھا۔ ان کے ہاں کاشتکاری ہوتی تھی۔ میرے آبا
 یمنوں چچا اور ان کے لڑکے کاشتکار ہیں۔ خود کھیت پوتے اور جوتے ہیں، خود فصل کاٹتے ہیں حق لے
 چوبال پر بیٹھے ہیں۔ ہم اصل نسل کسان ہیں۔ آما۔“

”تمہاری امی خوش رہی تھیں یا؟“

”تم جدید لڑکی ہو آما اور تم پھل نسل کی مسلمان اور ہندو لڑکیوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔ صبر و
 شاکت اور شوہر کی خدمت جن کا دین ایمان تھا۔ امی کو تو اپنے تایا سے بھی شکایت نہ تھی، رضائے باپ
 جن کی رنگ لیبوں کا اثر اس طرح ان کی اپنی زندگی پر پڑا۔ وہ چپ ہو گیا۔“

”گال ہے۔ تم نے مجھے یہ سب اس مرتبہ لندن میں نہیں بتایا تھا۔ ہمیشہ کتر لے رہے۔“

”میرے ذاتی حالات سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔“

”مجھے تو ہے روتو۔ کہ تم واقعی مجھے اپنا پر خلوص دوست نہیں سمجھتے؟“

جب لندن میں اس کے پاس ماموں جان۔۔۔ نواب نور الزماں کا کیبل آیا تھا کہ اس کی
 امی کا گاؤں میں نمونہ سے اتھاں ہو گیا۔ وہ خود کار پڑا ہوا تھا۔ اس زمانے میں آمانے کس لگی سے اس کی لکھا

تھی۔ دن رات وہ اس کے ارلز کورٹ کے ڈگڑ میں سرمانے بیٹھ کر اس کا ٹیپر کھلتی۔ اسے دوپلائی
س کے لئے کھانا پکاتی۔ اس کے کپڑے تک دھوتی اور استری کرتی۔ صرف اس کی اتھی ہی نے اس کی
یسی دیکھ بھال اور خدمت کی تھی۔ آدما کا یہ بے لوث سلوک وہ عمر بھر نہ بھول سکتا تھا۔

”پھر کیا ہوا راتوں۔۔۔؟“

”ارے تمہیں بتلایا تو تھا یا۔۔۔“

”تمہاری اتھی غریب کسان گھر میں کس طرح خوش رہیں؟“

وہ آداسی سے مسکرا دیا۔ ”مجھے یاد ہے۔ میں چھوٹا سا تھا اور ایک اندھیری رات برآمدے
بں چٹائی بچھائے لالین سامنے رکھے اسکول کا سبق یاد کرنے میں مصروف تھا۔ جب اندر سے
مٹی کے آہستہ آہستہ رونے اور باتا کے چلنے کی آواز آئی۔ میں اتھی کو سیدھا چاہتا تھا۔ ان کے رونے کی آواز
سے گھبرا کر میں نے باشا کی دیوار سے کان لگا دیے اور پھر سوراخ میں سے جھانکا۔ اتھی دن بھر کام
اج کی محنت کے بعد تھک کر رونے لگی تھیں۔ وہ چولہے کے پاس بیٹھ رہی پر سر جھکائے بیٹھی
تھیں اور میرے آبا۔۔۔ مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے۔ میرے آبا کمرے کے دروازے
بں کھڑے اس منات سے تقریر کر رہے تھے گویا جھگڑ کے منبر پر وعظا کہتے ہوں۔ وہ کہہ رہے
تھے، میں نے تم کو بیٹی بی بی شادی کے دوسرے دن سمجھا دیا تھا کہ بھول جاؤ کہ تم نواب نخر الزماں مرحوم
لی بیٹی اور نواب نور الزماں چودھری رئیس اعظم فرید پور کی بھتیجی ہو۔۔۔ اور ہمیشہ یاد رکھو۔
۔۔۔ انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر کہا۔ کہ تم ایک غریب سید کی بیوی اور آل رسول کی بہو
ہو۔۔۔ اور یاد رکھو حلیمہ بی بی کہ شہنشاہ کائنات کی بیٹی مولانا علیؑ کے گھر میں چکی پیستی تھیں۔
در ایران کی بادشاہ زلوی شہید کربلا کے گھر میں فاقہ کرتی تھی۔ تم تو ان سب کی خاک پا بھی نہیں ہو۔
نوباہ استغفار کرو اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ وہ بخشش دالا اور مہربان ہے۔۔۔ آبا رسول اللہ
کانام لینے کے بعد درود پڑھ کر بار بار اڑھی پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ ان کی سنجیدہ شکل اور ہوا میں لرزتی
ناڑھی پر میری نظر پڑی تو باشا کی دیوار کے ادھر مجھے اپنی پریشانی کے باوجود بے اختیار منہسی آئی۔
در میں اپنی شتیل پائی پر وہ اس آں بیٹھا۔ اتھی ساری کے آنچل سے آنسو پونچھ کر پھر چولہے پر جھک
گئیں۔ اور آبا باہر چلے گئے۔

”اس کے بعد مجھے یاد ہے، امی نے آبا سے پھر کوئی شکایت نہیں کی، اور خاموشی سے شوہر، ساس، سسر، دیور، جیٹھ اور نندوں کی ٹہل میں لگی رہیں۔ انہیں واقعی یہ فخر تھا کہ سید کی بیوی ہیں۔ جو مذہب تھیں۔ پانچ وقت کی نماز، روزے رکھتیں۔ میرے لئے طرح طرح کے وظیفے پڑھتیں، بنتیں ماتیں۔۔۔ ریحان کی آواز بھراگئی اور اس نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

”یہ سب لوگ کون تھے؟“ آو مانے پوچھا۔

”کون۔۔۔“ ریحان نے چونک کر دریافت کیا۔

”یہ سب جن کی محنت کشی کی مثال تمہارے آبا نے ان کے سامنے پیش کی۔“

”پرورث محمد کی بیٹی اور ان کے نواسے کی بیوی۔ وغیرہ۔۔۔ ارے چھوڑو آو۔ تم کون باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کیا پرانے قصے لے کر بیٹھ گئیں؟“ وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔

”تمہارے آبا بڑے بلند کردار کے انسان معلوم ہوتے ہیں۔“

”آبا۔۔۔“ وہ ٹہلنے ٹہلنے ٹھٹھک گیا۔ ”آبا حیرت انگیز بڑے مثال شخصیت کے

مالک ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے گھر والے ان کو ذرا سا خشطی گردانتے ہیں۔ مگر گاؤں والے ان کو اچھا خاصا ولی اللہ بھی سمجھتے ہیں۔۔۔ جب امی کی شادی ہوئی تو نواب نور الزماں نے ان کو جمیز دیا۔ نواب نور الزماں کا چھوڑا ہوا چھوڑا سار پیہ موجود تھا اور بہر حال امی نواب نور الزماں کے سکے بچائی کی اولاد تھی اور وہ ان کی جائیداد قبضے میں کر کے ان کی کافی حق تلفی کر چکے تھے۔ بہر حال۔ تو امی کا تھوڑا بہت جمیز بنایا گیا جو غریب کسانوں کے لئے تو کسی شاہی خزانے سے کم نہ تھا۔ مگر جب آبا کشتیوں پر لڑے مولویوں اور کاشتکاروں کا قافلہ بارات میں لے کر پہنچے تو انہوں نے جمیز کا سامان قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ امی بتایا کرتی تھیں کہ کہنے لگے وہ نواب نور الزماں کے ایسے غریب داماد نہیں کہلانا چاہتے جنہوں نے بیوی کے روپے سے اپنا گھر بھرا لیا۔ لہذا وہ صحت امی کے کپڑوں کے صندوق اٹھوا کر امی کو رخصت کر لے گئے۔ امی کے زیور البتہ جب میری بہن رابعہ پیدا ہوئی تو نواب صاحب نے اس کے نام سے بینک میں محفوظ کر دیئے تھے۔ آبا بہر حال اسی طرح دھان اُگاتے اور جب گھر میں نماز پڑھتے رہے۔۔۔“

”سچے کیونٹس۔۔۔“ اوانے کہا۔

ریحان ہنسنے لگا۔

”اصل قصہ تو تم نے اب تک بتایا نہیں۔“

”لاحول ولا قوۃ۔“ یہ عاجز آکر بھڑک کر سی پڑ بیٹھ گیا۔

”جب میں گاؤں کے اسکول میں داخل ہوا اور بقول شخصے میری ذہانت کی دھم مچنے

لی تو نواب قمر الزماں اتی آبا سے مصر ہو کر مجھے ڈھا کے لے آئے۔ میں جب چھ سات سال کا تھا

یہ نواب نور الزماں کا جنھیں میں بڑے نانا کہتا تھا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ مجھے اچھی طرح یاد

ن۔ بالکل پرانے فیشن کے، کار چوٹی چوڑے پہنے ہوئے جفادری زمیندار۔ جیسے پرانی کتابوں کی

سویروں میں ہوتے ہیں۔ بہر حال۔ اب تیسرا نواب ریاست کے مالک تھے۔ وہ مجھے ڈھا کے

لے آئے اور اسکول میں داخل کر دیا۔ میں اس وقت بارہ تیرہ سال کا تھا۔ میں ارجمند منزل میں

رہا تھا اور نیر الزماں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتا تھا۔ آبا کو ماموں جان نے لقمین دلایا تھا

اتنی کار و پیہ جو اتنے شادی کے وقت لینے سے انکار کیا تھا میری تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس کے

وجود میں روپیہ مہینہ با ما باطل ہر مہینے آبا کا کچھ سے میرے نام می آرڈر کرتے۔ ماموں جان مسکرا کر

روپیہ وصول کرتے اور میرے نام ڈاک خانے میں جتا کرتے رہتے۔ اصلیت یہ تھی کہ میں ارجمند

زل میں ماموں جان کے لاڈلے نور نظر کی حیثیت سے پر دان چڑھایا جا رہا تھا۔ ان کا بیٹا خواہا کر وہ

نہ تھا۔ ماموں جان اس کی طرف سے بہت مایوس تھے اور مجھے آئیڈیلایز کر رہے تھے اور اصل بات

اسی یہ تھی کہ وہ جہاں آرا سے میری شادی کرنا چاہتے تھے۔ ماموں جان علی گڑھ کے معتقد تھے انہوں

البت۔ لے کے لئے علی گڑھ بھیج دیا۔ وہاں میں مزید لائق اور ہونہار ثابت ہوا۔ ماموں جان لے چاکر

سائے خاندان میں واحد معقول اور ہونہار نوجوان صرف میں تھا۔ ماموں جان میرے لے طرح طرح

خواب دیکھنے لگے۔ یہ سٹری۔ آئی سی ایس کا مقابلہ ان کے پٹ سن کے کاروبار کی دیکھ بھال۔

”جہاں آرا چھوٹی سی تھی۔ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹی ہوگی۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ دوڑی

ن اور پتہ چلا کہ ماموں جان اس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں، تو میں بے حد خوش ہوا۔ میرا خیال تھا

کالج سے نکل کر کسی اخبار میں کام کروں گا۔۔۔۔۔ میں انگریز سرکار کی ملازمت کے سخت خلاف

ہو گیا تھا۔ کسی یونیورسٹی میں پڑھاؤں گا۔ اور جہاں آرا کو لے کر اپنا گھرا لگ بناؤں گا۔

”ماموں جان کو واقعی مجھ سے محبت تھی۔ لیکن میری ذہانت وغیرہ کے علاوہ ماموں جان میرے اتنا خیال رکھتے تھے اس کی غالباً ایک وجہ اور بھی تھی۔“ ریحان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”ان کے والد نوا نور الزماں پرانے ٹائپ کے جاہل اور مطلق العنان زمیندار تھے، ماموں جان۔ قسم الزماں۔ ان کے برعکس ایک جدید انسان ہیں! اور نیک دل۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ان کے والد نے اپنی بے زبان بھتیجی ساتھ ہر طرح سے بڑی بے انصافی کی۔ وہ مجھے اپنا داماد بنا کر تلافی یافتہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ۔۔۔ اس کے علاوہ۔۔۔ وہ یک نخت چپ ہو گیا۔“

”اوما ہم تن گوش اسے دیکھتی رہیں۔“ اس کے علاوہ کیا روٹو۔۔۔؟“

ریحان نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ ”مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ ماموں جان امی کو بے حد پسند کرتے تھے انہیں بچپن سے اپنی بنت عم ہی سے محبت تھی۔ اور اگر ان کا بس چلتا تو وہ کشمیر کی رئیس زادی کے پلے آؤ ہی سے شادی کرتے۔۔۔“

”زندگی۔۔۔ واقعی کتنی عجیب چیز ہے۔۔۔“ اومانے آہستہ سے کہا۔ ”اور تمہاری آؤ بھی نواب قمر الزماں کو پسند کرتی تھیں؟“

”یقیناً۔“

”اور کسی نے ان سے نہ پوچھا کہ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی؟“

”نہیں۔ کسی نے ان سے نہیں پوچھا۔ اور نہ انھوں نے کسی کو بتایا۔ وہ مرتے دم تک تپتی دستاوی رہیں۔ آخر دم تک شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں لگی رہیں۔“

”بنگالی عورت۔۔۔!“

”ہاں۔ بنگالی عورت! ہندوستانی عورت!!“

”وہ کبھی ارجمند منزل آتی تھیں؟“

”بہت کم۔ کسی خاندانی تقریب کے لئے کبھی کبھار آجاتی تھیں اور ماموں جان ان کی خاطر مزار میں دوڑے دوڑے پھرتے تھے۔ جاتے وقت دستور سے زیادہ تحفے تحائف ان کے ساتھ کرتے، مگر وہ کچھ نہیں چھوڑ جاتیں۔ کیونکہ آباد دولت مند سسرال کا ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے۔ اور اتنی ساری

”اُن کا یہ حکم مانا۔“

”فشی مسٹ ہو، میں ملے گریٹ وومین“

”فشی وائز۔“

اب بارش تھم چکی تھی، ادب باغ کی ابر آلود فضا بید خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ریحان نے ی پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی داستان ختم کرنا چاہی۔

”جب میرے ولایت جانے کا پروگرام بنا تو امی نے چاہا کہ اپنے زیورات جو بینک میں محفوظ روخت کر کے میرے ولایت کے خبا کا انتظام کریں۔ ماموں جان نے ابا کو تو یہ سچی پٹھانی کر مجھے ری وظیفہ مل گیا ہے۔ اور امی سے چپکے سے کہا بی بی تم زیورا اپنی بیٹی کے جہیز کے لئے رکھو۔ میں اپنے بھانجے مجھے تیر کی طرح عزیز ہے، اپنے روپے سے لندن بھیج رہا ہوں، امی کو معلوم تھا کہ ماموں جان وہ جہاں آنا کو مجھ سے بیاہ دینے کا ہے۔ وہ بیجاری بے حد مسرور تھیں۔ وہ اپنے شوہر کی ضد کی وجہ ماری عمر تلکدستی میں گزار چکی تھیں۔ انھیں اب خوشی تھی کہ اس رشتے سے ان کے غریب بیٹے کی زندگی نئی گی۔“

”تمہاری امی کے پاس بہت گہنے تھے؟“ اوما نے خالص عورتوں کی سی دلچسپی سے پوچھا۔ ریحان نے ایک بار تعجب سے اس پر نظر ڈالی۔ ”کہہ دو چکا ہوں، ان کی والدہ کے زیور تھے جو تانیا نے بینک میں رکھوا دیئے تھے۔“

”وہ میرے جواہرات جو امی کو ملنے چاہئیں تھے، ان پر ان کی والدہ کے انتقال کے بعد سلگم ل ان کی تانی پہلے ہی قبضہ کر چکی تھیں۔“

”چنانچہ میں ماموں جان کے خرچ پر لندن گیا۔ وہاں سے لوٹ کر آیا تو یہاں شادی کی ہورہی تھیں۔ مجھے ہار پھول پہنائے گئے، ارجمند منزل میں زوردار دعوت ہوئی۔ شوہر یا لود سارا گاڈوں گھاٹ پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ صرف امی نہیں تھیں۔ جن کو میری آمد سے زیادہ انتظار تھا۔ وہ سال بھر نیلے مرچکی تھیں۔ ابا نے جو گھر میں جا کر شکرانے کی نماز چوپال میں گانے کی محفل ہوئی۔ بیاتیوں نے فوراً میرے لئے گیت بنائے۔ میں گاؤں والوں ایک عجوبہ روزگار، سستی بن چکا تھا۔ جب میں ڈھاکے واپس آیا ————— (تم تو ابھی لندن میں

تھیں۔ یہاں کیا کیا ہنگامے رہے میرے ساتھ تو شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی۔ ماموں جان گلے لگا کر سر پر ہاتھ پھیر کر مجھ سے کہا کہ شادی کے بعد میں ان کا پاٹ کا کاروبار اپنے ذمہ لے لو اپنے کتب خانے کی میز پر زمینداری کے کاغذات اور رجسٹر کھولے بیٹھے تھے۔ میری رہائش کے کوچھی کی دوسری منزل کے کمرے آراستہ کئے جا چکے تھے۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ تھی۔

”تب میں نے ان کو اطلاع دی کہ میں کبونسٹ پارٹی آف انڈیا کا ممبر ہو چکا ہوں۔ یہ سن کر ان پر سی گر پڑی۔“

”آئی ڈونٹ بلیم ہم۔“ آدبانے کہا۔

”مجھے ان کو صدمہ پہنچاتے ہوئے بڑا دکھ ہوا۔ مگر میں نے نرمی سے ان سے کہا کہ میں ڈبھڑھٹ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں، ان کا خاندان مادہ بن کر ان کی ریاست سنبھالوں گا۔ بلکہ میں جو کولے جا کر اپنے پھونس کے مکان میں رکھوں گا۔ آخر آپ کی بہن بھی تو اسی محل سے رخصت میرے باپ کے تھوڑے میں گئی تھیں۔“

”ماموں جان بھونچکے ہو کر مجھے تکتے لگے۔ پھر غم و غصے سے تھر تھر کانپے۔ انھیں یقین نہ کہہ میں کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان کو پارٹی کارڈ دکھایا! دررسان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں نے یہ راستہ اپنے لئے منتخب کیا ہے۔“

”عمر بھر میں پہلی بار میں نے ان کو طیش کے عالم میں دیکھا۔ وہ یک لخت اپنے مرحوم جنادری باہ کی تصویر بن گئے، انھوں نے گرج کر کہا: ”نک حزام، احسان فراموش، کسان کی اولاد، ملانے کا چھ تیرا استقبال میں نے سنوارا، درنہ آج ہل چلا رہا ہوتا، دھان کے گٹھے ڈھور رہا ہوتا۔ مکتب میں بچے پڑ رہا ہوتا بد بخت!“

”میں نے دبی زبان سے کہا: ”دھان کے گٹھے تو میں اب ڈھوؤں گا ماموں جان!“

”مگر وہ اسی طرح گرجتے برستے رہے۔ اور مجھے خیال آیا کہ میرے نانا جان مرحوم کے لکھے ہوئے اسی قسم کے میلو ڈرائیٹک نالک، پچاس برس قبل از جنم منزل کے جلسہ گھر میں اسٹیج کئے جاتے ہوں کون کہتا ہے ہمارا ہندوستانی تھیٹر زندگی کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔“

”تین دن تک گھوم، ہنگامہ موتا مارا۔ ماموں جان نے ہر طرح مجھے سمجھایا۔ روئے گائے۔ مگر

اپنی عزت کا، اپنی لڑکی کی زندگی کا واسطہ دیا۔

”آپ اس کے روادار ہیں کہ آپ کی لڑکی گھٹ گھٹ کے مرجائے، مگر آپ اس کا ہاتھ ایک ٹٹ کے ہاتھ میں نہ دیں گے۔ میں نے کہا۔

”دہریہ، کنکال، باغی، جیلوں میں سڑے گا۔ بار بار پھرے گا۔ روپوشی اور سزا نعام۔ اور وہ — (سچ پوچھو آتما جب وہ یہ سب کہہ رہے تھے تو مجھے ان پر پیارا لگیا) میں اپنی نازوں پر اتیرے پلے باندھ کر اس کی قسمت پھوڑ دوں۔

”غرضیکہ نہ وہ مانے، نہ میں مانا۔ مانی جان کو اختلاج قلب کے دورے پڑنے لگے۔ گاؤدی زچھتے کترنے لگا۔ ماموں جان ناس کو حکم دید یا تھا کہ کچھ سے بات نہ کرے، شادی کی تیاریاں خ ہوئیں۔ ارجمند منزل پر بڑا بھیانک سناٹا چھا گیا۔

”ماموں جان نے ایسا بندوبست کیا کہ شادی کی تیاریوں کی یا رشتہ ٹوٹنے کی خبر ارجمند سے باہر نہ نکلے۔ ویسے بھی اس وقت تک ماموں جان نے اپنے اس ارادے کا تذکرہ مانی اور قی کے علاوہ کسی سے نہیں کیا تھا۔ زمینداروں کے ہاں شادی بیاہ کے معاملات میں بہت رازداری برتی ہے۔ ورنہ لکنیاں اور مشاطائیں اور مخالف زمینداروں کے حالی موالی رشتہ تڑواتے ہیں اور کیا کیا ہوتا ہے۔ اور یہاں جیاں آزار کے اپنے ماموں یعنی کشتیہ کے رئیس اعظم اپنے بھائی سیل صاحب کو تے تے بیٹھے تھے۔ بہر حال، ڈھاکہ میں اس میلوڈرامہ کی خبر زیادہ نہیں پھیل۔ جیاں آزار خود مر سے شرمیلی اور تھوڑی سی گھٹی لڑکی تھی۔ اس نے بھی اسکول یا کالج میں میرا تذکرہ کسی سے نہ کیا تھا۔ اسی وجہ کو اتنے برسوں اس کے ساتھ پڑھنے اور اس کی دوستی کے باوجود یہ بات معلوم نہ ہوئی۔

”بھئی میں سمجھتا ہوں، اب لہجہ بھی نہیں منگو الود، میرا تو داستان امیر حمزہ سناتے سناتے سوکھ گیا۔“

”کہے جاؤ۔ میں پانی منگواتی ہوں۔“

”بس میں حسب سابق اپنے پرانے کمرے میں ٹہرا ہوا تھا۔ جیاں آزار کا خیال کر کے میرا دل لٹ جاتا۔ وہ میری لندن سے واپسی کے بعد دستور کے مطابق مجھ سے سخت پردہ کر رہی تھی۔ پنہ کمرے میں یا لوں بیٹھ چکی تھی۔ جب یہ ٹریڈی ہوئی۔ اس کی دونوں ہینیں بوکھلائی بوکھلائی میرے

پاس آکر لکھیں۔ آپا روتے روتے نیم جان ہو گئی ہیں۔ آپا کی آنکھیں سوچ گئی ہیں۔ آپا ان تین دنوں میں آدمی رہیں۔ کہاں وہ دہن بننے کے لئے مایوں بیٹھی تھیں اور کہاں یہ خوفناک المیہ رونو بھائی خدا کے کومرنے نہ دیکھتے۔ یہ سب سن سن کر میرے حواس باختہ ہو جاتے۔

”چوتھی رات میرا آخری فیصلہ سننے کے بعد کہ میں اپنی سیاسی زندگی ہرگز ترک نہیں کروں گا جان نے مجھ سے کہا، تو آج سے ارجمند منزل کے دروازے تمہارے اوپر بند ہیں، اتنا کہہ کر وہ چھوٹ کر رونے لگے۔

”چند منٹ بعد انہوں نے _____ بڑے چالاک میں میرے قمراموں _____ بلیک میل کے لئے ایک چال چلی۔ اس وقت مجھے ایسا خیال ہوا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ وہ خلوصا دل سے ایسا کہہ رہے تھے، مگر جوانی کی اگر ڈا اور اپنے اصول پرستی کے زعم میں ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ہمارے بزرگوں کے بھی جذبات ہیں۔ ان کی بھی اندرونی جذباتی زندگی ہے، انہوں نے بھی شکستہ دلی کار ہے _____ ماموں جان مجھ سے کہنے لگے: ”میتھ مرگئی، تم اس کی نشانی تھے تم نے مجھ ساتھ یہ کیا، اتنا کہہ کر وہ ذرا دقت سے اپنی کرسی پر سے اٹھے، اور کمرے کے باہر چلے گئے۔

”امی کے مرنے کا غم تازہ تھا۔ میں بھی بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوں۔ پھر میں نے اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ اور انجم آرا کو بلا کر اس سے کہا اپنی آپا سے کہورات کو باہر تالا آجائیں۔ مجھے ان سے بعد ضروری بات کرنی ہے۔ انجم آرا کا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ فوراً اوپر دوڑی گئی۔

”رات کو جیہاں آرا مجھے تالاب کے کنارے ملی۔ میں نے تین سال بعد اسے دیکھا۔ تین سال اسے لندن سے خط لکھتا رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ مگر زیادہ نہیں۔ مجھے معلوم تھا وہ ہونے والی ہے۔ اس لئے مجھے اس کے لئے کوئی خاص اضطراب نہیں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے اس سے تھی۔ مگر کوئی جنوں خیز عشق نہیں تھا۔ ہو نہیں سکتا تھا۔ بچپن سے ہم اکٹھے پلے بڑھے تھے۔ لئے ایک پرسکون سی چیز تھی۔ مجھے ہمیشہ یہ معلوم رہتا تھا کہ میں دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، کہ میں ہوں۔ کیسی کٹھن مسافت طے کر کے لوٹوں، وہ سایہ دار درخت اور میٹھے پانی کے کنویں میری منتظر ہوگی۔ اور اب وہ میرے سامنے موجود تھی۔ میری امی کی طرح حتی دستا کی ایک اور تھ میں اس کے سامنے گونگا سا ہو گیا۔ وہ تالاب کی سیر بھی پر بیٹھ گئی۔ انجم آرا، جہر آرا اور مالا ملازمہ پر

ادھر چوکس تھیں۔ اگر ماموں جان کو اس ملاقات کا علم ہو جاتا تو نہ جانے وہ ہم دونوں کا کیا حشر
 خیر۔ تو میں نے اس سے کہا۔ وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلی چلے ؟
 ”تم رطکیوں کو بھگا کر لے جانے کی تجویز کرنے میں بہت اکیسپٹ معلوم ہوتے ہو !“ اوما
 کاٹی۔

”میں نے اس سے کہا، میرے ساتھ جھونپڑوں میں رہے۔ ردھی سوکھی کھائے اور یہ یاد رکھے
 ب فخر الزماں چودھری کے نو سے کی نہیں بلکہ مولوی برہان الدین احمد کا شکار کے لڑکے کی بیوی ہے؟“
 ”بالکل ایسی ہی بات تمہارے آبا نے تمہاری امی سے کہی تھی۔“ اوما نے کہا۔
 ”ہاں۔ عجیب بات ہے نا۔ بہر حال۔ مگر جہاں آرا میں اپنے والد سے اتنی بڑی بغاوت کی
 تھی۔ وہ ٹھٹھی پھکیوں سے روٹی رہی، اور میں اسے اسی طرح روٹا جھوڑ کر ہمیشہ کے لئے ارجمند منزل
 آگیا۔“

”چند روز بعد ہی مجھے انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ اور وہ سارا قصہ خواب و خیال ہو گیا۔“
 ”اور اس کے فوراً بعد تم نے ایک اور خواب دیکھنا شروع کر دیا۔ واہ رہے مرد کی ذات۔“
 ”اب اجازت ہے؟ دوپہر ہو گئی۔“

”ابھی نہیں۔ تمہاری بہن پڑھ رہی ہے؟“

”نہیں، میں کتنا چاہتا ہوں، اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔ مگر آج امی کے انتقال کے
 فہلنے میں جڑ گئی۔ اگر مجھے کبھی ڈھاکے آنا ملا تو مکان لے کر اسے یہاں بلا لوں گا۔ اگر میں آبا
 ، دلا دلوں کہ وہاں پردے کا مکمل انتظام ہے تو آبا شاید علی گڑھ گزرا کالج بھی بھیجے کو تیار ہو جائیں۔“
 وہ ہنس پڑا۔ ”آبا کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں دہریہ — دہریہ ہو گیا ہوں تو ان پر آسمان گر پڑے۔
 تب بھی گاؤں جاتا ہوں، تو باقاعدہ آبا کے ساتھ جمہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں۔“
 ”اوہ ————— ہاد فنی —————“ اوما نے زور سے تہقہہ لگایا۔

”جانیے کیوں ریمان کو اوما کا یہ تہقہہ ناگوار گزرا، وہ نظریں اٹھا کر باغ کو دیکھنے لگا۔
 اوما نے اس کی طویل خاموشی سے گہرا کر لپوچھا۔ ”تمہارا گھر تو بڑا خوب صورت ہو گا۔ آرٹسک۔“
 ”ہاں بے حد خوبصورت ہے۔ تمہارے دو ڈیلینڈز سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ اس کی پھوس کی چھت

زرد پھولوں کی سیل سے ڈھکی ہوئی ہے۔ سامنے سبزی باڑی ہے۔ اور گھنی، سرسبز بنسلی۔ پچھلے ہا کنول کے پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ اس کے کنارے سبباری اور ناریل کے سڈول درخت کھڑے ہیں گاٹھی رہتی ہیں۔ پچھلے برآمدے میں پانگی رکھی ہے۔ ندی پر آبائی ناؤ بندھی رہتی ہے۔ اسی کو کچھ ابا پاری کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھانے جاتے ہیں۔ ناؤ میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ان کی اس کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں جانتے۔ اُمی بتاتی تھیں کہ یہی نوکا کھیٹے وہ اور زاد بھائیوں کو پڑھانے اپنے گاؤں سے نواب نور الزماں کی دیہاتی جوہلی جایا کرتے تھے کیسا ناندھ لوگ۔ ابا ساری عمر میں صرف تین چار مرتبہ ہی موٹر میں بیٹھے ہیں۔ جب میرا داخلہ سکول میں کرانے ڈو تھے اور ساموں جان کی ٹیوک ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھی۔

”اور پھر ہمارا گاؤں۔ کسانوں کے خوب صورت جموں پرے۔ گاؤں کا ٹول۔ کالی باڑا مندو۔ جمعہ گھر۔ چوپال۔ بازار۔ منڈی۔ برگد کے تلے گھاٹ۔ درگاہ۔ میرا گاؤں ترین گاؤں ہے اور میرا گھر دنیا کا حسین ترین گھر۔ کبھی میں تم کو اپنا گھر لے جا کر دکھا اور دیہالی کو۔“

”اور قبرستان جیاں اُمی کی قبر ہے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد اس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اُمی اتنی کم عمر تھیں۔ وہ مجھ سے صرف سترہ برس بڑی تھیں، اور یہ بہن معلوم ہوتی تھیں۔ اگر آج زندہ ہوتی تو تم سے بھی زیادہ بڑی نہ لگتیں۔ بعض مرتبہ تم ہم جھلک سی دکھائی پڑتی ہے۔ خصوصاً جب ڈانسی ہو۔ تو بالکل اُمی بیسی لگتی ہو۔“

”اُمی تو میری ہیں، اب کبھی تم نہ مر جانا اُمی۔“

”ریحان۔“ اُمی نے رشتی اور تلخی سے اس کی بات کاٹی۔ ”اب اٹھنا چاہئے۔ تم جاؤ۔“ وہ چونک کر بولا۔ ”ابھی جاتا ہوں۔“

”کھانا کھاتے جانا۔“

”بہنیں۔ کھانا سر بیند کے ساتھ کھاؤں گا، اور اس کے بعد۔“ اس نے اٹھ کر طویل

ہوئے کہا۔ ”ارجمند منزل میں نواب قمر الزماں چودھری سے سیاسی گفت و شنید۔ کل شام لیگ آ

ی سے ان کے ساتھ ساڑھے پانچ بجے کا ایلوٹمنٹ کروایا تھا۔ ابھی سرسیدر کے اہل بیگم بازار
- بھاگتا ہوں۔ -

وہ اپنے کمرے کی طرف لپکا۔

”ارجنڈ منزل جاتے ہوئے ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟“ ادا نے پیچھے سے آواز دی۔ ”اگر وہاں ٹھکانا
نہ بچھے فون کر دینا۔ تمہاری مدد کے لئے آجاؤں گی۔“

”یو آر نوٹ مینگ ویری فنی ادا۔۔۔“ ریکان نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

ادا کھوکھلی سی، ہنسی ہنسی اور میز پر بیٹھی کانٹے سے لکیریں کھینچتی رہیں۔ پھر سیزر کو بلانے کے لئے
اتر گئیں۔

۲۷

جہاں آرا بیگم

اس وقت ارجنڈ منزل پر ایک سخت ایسی خاموشی چھا گئی، جیسے ساگوان کے جھرمٹ میں چھپے
ادو گرنے چپکے سے کوئی منتر پھونک دیا ہو۔ اور چرند پرند، شجر حجر، انسان سب سکتے میں
- ایسے۔ -

جہاں آرا اور پرکی منزل پر پھیلے برآمدے میں حق کے پیچھے آرام کرسی پر بیٹھی لوزائیدہ بھتیجے کے
سے بن رہی تھی۔ اور اپنے پاؤں جھنگلے کی پھلی جالی میں اٹکار کھتے تھے۔ جھنگلے کی سلاخوں میں سے اس نے
بلک دکھی جو سوچ میں ڈوبے پائیں باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اور پھر لیگ آفس کا بہاری کلرک
نزدیک پہنچا اور آیا اس کے پیچھے باہر چلے گئے۔

بادرچی خانے میں جا کر دعوت کی دلیوں کا معائنہ کرنا ہے۔ پلاؤ دم کروانا ہے۔ شاہی ٹکڑے تیار
ی۔۔۔ دلہن بھابی اپنے کمرے میں آرام سے سو رہی ہیں۔ امی حسب معمول اپنے کمرے میں صاحب
ہیں۔ جانے ان کو اختلاج کے درد سے اتنے کیوں پڑتے ہیں۔ آبا تو ان کا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ امی

”دو تو۔۔ کیا کہہ رہی ہے؟“

”اللہ قسم۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ باہر بیٹھے ہیں۔“

”باہر تو روزی اور پاپی کے بابا آئے تھے۔“

”وہ تو کبھی کے چلے گئے۔ ابھی بشیر چائے کی تریں لے کر باہر گیا تھا۔ اس نے آکر بتایا، تو میں ماگی گئی۔ باغ والی کھڑکی میں سے جھانکا۔ سرکار اور رونو میاں دونوں دفتر میں بیٹھے ہیں۔ دروازے دونوں جنوں میں مسکوت ہو رہی ہے۔“

ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

”جھوٹ مت بول، مالا کی بچی۔“

”اللہ رسول کی قسم، چن کے دیکھ لیجئے۔“

”دونوں میں بڑی سنجیدگی سے باتیں ہو رہی ہیں؟“

”ہاں بی بی۔“

کیا دعائیں کامیاب ہو گئیں؟ دعائیں۔ غازیں، وظیفے، اللہ اللہ۔

وہ اون اور سلاسیاں میز پر ڈال کر جلدی سے اٹھی۔

”ٹھر۔ مالا۔ بھائی جان کہاں ہیں؟“

”نیرمیاں موٹ لے کر باہر گئے ہیں۔ چیلے۔“

وہ مالا کے ساتھ زیر اثر کھانے کے کمرے میں پہنچی، جو کتب خانے سے ملحق تھا۔ درمیانی دروازہ بند تھا۔ عموماً بند رہتا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے گھنٹوں کے بل بیٹھ کر زیر آنکھ جادی۔

وہ عین سامنے بیٹھا تھا۔ بڑی ہیز کے اس طرف، بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہی شکل، وہی آنکھیں، وہی بات کرنے کا انداز۔ مقابل میں آبا بیٹھے تھے۔ چہرہ چٹان کی طرح سخت، درمیان میں نا اور چائے کی کشتی۔ خالی پیالیاں۔ مائے اللہ۔ مجھے معلوم ہوتا تو کشتی سجا کر بیعتی۔ اس سے کان لگا دیتے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جی ہاں۔ میں کامریڈ جوشی کو مفصل بتا دوں گا۔“

بات نے عینک ماتھے پر چڑھائی! اور کچھ پڑھنے لگے۔ پھر انھوں نے کہنا شروع کیا۔ ”جلد صاب“

کے نکات :-

اس پر جلی سی گری۔ وہ اس کے متعلق نہیں اس نامراد سیاست کے متعلق "مسکوٹ" کر کے
بولتے بولتے آبا نے سراجھا کر سامنے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہو
لاا نزدیک ہی گیسری کے صدر دروازہ پر چوکس کھڑی تھی۔ اس نے وہاں سے اشارہ کیا "بیٹھی رہ۔"
بیٹھی رہئے۔"

وہ پھر کواڑ سے لگ گئی۔

اب آبا کا غڈ سمیٹ رہے تھے، وہ کھڑا ہو چکا تھا۔

"اندر جا کر اپنی مانی کو دیکھ آؤ، بہت علیل ہیں۔ آبا زرا رکھائی سے کہہ رہے تھے مجھے
ہے، مجھے معلوم ہے۔ آبا کی یہ سردہری مصنوعی ہے۔ آبا کی خودداری کی وجہ سے ہے۔ آبا انھیں
چاہتے ہیں۔"

"بہت اچھا۔"

اللہ، اب بھی ان کا دل نرم کر دے۔ آبا کا دل بھی نرم کر دے۔ اللہ۔ آبا ان سے میرے
لئے بات کر لیں۔ مولا معجزہ دکھا دے۔

"نیرامیل کہاں ہیں؟" ریمان پوچھ رہا تھا۔

"معلوم نہیں کہیں باہر گئے ہیں۔" نواب نے جواب دیا۔

آبا انھیں رات کی دعوت کے لئے ہی روک لیجئے۔ ایک اجنبی مسافر کی طرح واپس نہ
دیجئے۔ آبا پلیز۔

"مانی جان _____ اپنے کمرے میں ہوں گی؟"

"ہاں ہاں۔ وہیں ہوں گی۔"

"اچھا ماموں جان۔ خدا حافظ۔" اس نے مصافحہ کے لئے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اور بڑ

دب سے جھک کر آبا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ "میں دینی سنبھتے ہی نواب زادہ لیاقت علی خاں
لوٹیکٹ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

”آداب عرض ماملول جان“

”بچتے رہو۔“

وہ فائل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ گیسٹری میں سے مالا نے اشارہ کیا جہاں آرا سرعت سے ڈائیننگ روم کے پھلے دروازے سے باغ میں اتر گئی۔ اگر کہیں ڈبھٹڑ ہو جاتی۔ گیسٹری میں سے جانا چاہئے تھا۔ ضرور ڈبھٹڑ ہوتی، اور پچھے سے آبا آجاتے۔ تو کیا ہوتا؟ آبا کا حکم ہے کہ اگر کبھی بھی دو توار چمنڈ منزل آئے تو جہاں آرا کا اس سے سخت پردہ کر لیا جائے۔ وہ پتر کی طرح پھوڑے سنجی۔ اور پنتی کا پنتی سنان تالاب کے کنارے شکستہ ”راج سنگھاسن“ پر دھم سے جا کر بیٹھی گئی۔

چند منٹ بعد مالا دلیے پاؤں درخت کے پچھے سے نمودار ہوئی۔ ”میں نے اندر جا کر تھانکا تھا۔ رو تو میاں بیگم صاحب کے کمرے میں گئے تھے۔ مگر وہ سو رہی تھیں۔ بے سدھ، وہ باہر نکلے۔ اب جانے کدھر سے۔“ ایک لخت وہ چُپ ہو گئی۔

وہ پھلے برآمدے سے اتر کر باہر جانے کے ارادے سے تالاب کی طرف چلا آ رہا تھا۔ جس کا چکر واٹ کر باغ کی سڑک سامنے کے پھانک کی طرف جاتی تھی۔

پھر وہ عین اس کے مقابل میں آن کھڑا ہوا۔ رنگین تخت کے پاس۔ بالکل اسی طرح، جیسے اس روز خواب میں آیا تھا۔ خواب میں دیکھا تھا۔

بارش شروع ہو گئی۔ وہ جلدی سے سیل کے نیچے آ گیا۔

اور تب اس نے جہاں آرا کو دیکھا۔

”ادھ ہلو۔ ہلو جہاں آرا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”آداب رو نو بھانی۔“

کوئی کبھو خیال نہیں آیا۔ زمین نہیں ہئی۔ قیامت نہیں آئی۔ وہ اس کے سامنے موجود ہے۔ س رات، چار سال قبل وہ اسی جگہ سے اسے خدا حافظ کہہ کر گئے۔ رو تا بلکت چھوڑ کر گیا تھا۔ اب سامنے وجود ہے۔ اور اس سے بات کر رہا ہے۔

مالا چپکے سے کھسک کر درخت کی ادٹ میں ہو گئی۔

”آب کب آئے رو نو بھانی۔“ مضبوط، پرسکون آواز۔

”ابھی تھوڑے دن ہوئے۔“

”آج کل کہاں رہتے ہیں۔“

”بہستی — تم۔ تم اب کس کلاس میں ہو؟“

”میں نے کالج چھوڑ دیا۔ کافی دن ہوئے — بھوپھاجان کیسے ہیں۔ آپ شوٹا پور گئے تھے؟“

”ہاں۔ تھیک ہیں۔“

”اور رالہ؟“

”وہ بھی خیریت سے ہے۔ اچھا جہاں آرا اب ہم چلیں۔ بارش تیز ہوگئی تو مشکل ہو جائے

گی۔ اچھا۔ خدا حافظ۔“ اس نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پھانک کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ آیا، اتنے برسوں، اتنی رات دن کی دعاؤں کے بعد، اور دو منٹ میں چلا گیا۔ مگر دنیا وی

ہی موجود تھی۔ درخت، پرندے، آسمان، زمین، بادل۔

مآلا پیڑ کے پھپھے سے نکلی۔

وہ ہونقوں کی طرح مآلا کی شکل نکلے لگی۔

”بی بی اندر چلئے۔“

اور تب جہاں آرا نے تخت پر زور کا مٹکا مارا اور دوہری ہوگئی۔ ”کیوں آئے تھے مآلا۔ کیوں

آئے تھے، جب میں ادھر بیٹھی تھی، تو کیوں آئے تھے۔ یہ صے کیوں نہیں چلے گئے۔ تجھے معلوم ہے مآلا

کیوں آئے تھے؟ کیا کہہ رہے تھے؟“

”اٹھو بی بی۔ اٹھو۔“

”کیوں آئے تھے۔“

”بی بی پاگل مت بنو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ توبہ۔ توبہ۔“

اس نے جلدی سے آپکل سے اپنا چہرہ لو پٹھا۔ شاید مجھے ہسٹریا ہو جائے گا، اس نے لرز کر سچا

اتنی کی طرح ————— اختلاجِ قلب کی مریضہ کہلاؤں گی ————— لوگ مجھ پر ترس کھائیں گے۔

————— ہنسیں گے ————— اللہ ————— اللہ —————

مآلا نے اس کا ہاتھ تھام کر ”راج سنگھاسن“ کے نیچے سے ہینے ایک منٹ برسائی

نے کو پھلانگنے میں مدد کی۔ پھر بارش کی تیز بوجھار میں وہ دونوں، سر پر انچل ڈال کر جھکی جھکی تیزی سے کوٹھی کی طرف بھاگیں۔

۲۸

رونگیلانا تیرا نجھی

ستمبر ۱۹۲۲ء کی ابر آلود شام کی نیم تاریکی میں دو آوازیں چین رکنج کے پھاٹک کے ترچھے، نیم نکتہ ستون کے قریب۔

”اچھا بھائی۔ یہ لو تینوں کتابیں۔ بہت سنبھال کر رکھنا۔ اس پر ہم نے سروجنی دیہی سے دستخط نہیں دیکھوا انہوں نے تمہارے لئے کیا لکھا ہے۔“

”کہاں۔ کہاں۔ ۶۔“

”ماچس جلانے کی آواز۔“

”یہ دیکھو۔“

”اوہاں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرا نام لکھا ہے۔ ہاؤ۔ ان کریڈٹیل۔ آپ کو س میں؟“

”یہ سب تفصیلات نہ پوچھا کرو۔“

”نہیں بتائیے۔“

”دہلی میں۔“

”اور آپ نے ان سے میرے متعلق کیا بتایا؟“

”کچھ نہیں۔ صرف یہی کہا تھا کہ ایک باؤلی سی لڑکی ہے۔ اس کے لئے اپنی طرف سے اس سے کچھ لکھ دیکھئے۔“

”اوہاں۔“

”اور یہ لو۔“

”اوہ۔ نوکشی کا تارا ٹھہ! اور یہ۔۔۔؟“

”روننگی لانا تیرا نجھی۔!“

”اواں۔!“

”مولوی جشیم الدین سے بھی دستخط کروائے بھائی۔ دونوں کتابوں پر۔ اور یہ لو۔۔۔“

”مولوی منصور الدین کی نئی جلد۔۔۔“

”بیرامونی۔؟ دوسری جلد آگئی؟“

”ہاں۔ مع مصنف کے دستخط۔ اب تم بھی کیا یاد کرو گی۔ کس سوپر انٹلیکچوئل چاہنے والے

سے واسطہ پڑا ہے۔۔۔“

”یا سمین ایک دن کہہ رہی تھی۔ ایک روز وہ اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور نوکشی کا تارا ٹھہ کا

بیسے تخلیق کرے گی۔“

”وہ بھی تمہاری جیسی ہے؟“

”یا سمین؟ نہیں۔ دراصل وہ روزی بیپاری کی چیلی تھی۔ پھر میری چیلی بھی بن گئی۔“

”بس تو پھر اب اللہ اس پر رحم کرے۔ روزی کا حشر دیکھو تمہاری چیلی بن کر کیا ہوا۔ اچھا بھی

اب ہم بھاگتے ہیں۔ تمہارے بابا آہی نہیں چلتے۔“

”وہ شاید مترابا لو کی طرف چلے گئے۔ اب پھر کب آئیں گے؟“

”جب بھی تم بلاؤ گی۔ فوراً۔ اچھا۔ اب چلتے چلتے یہ بتا دو کہ کیوں خفا تھیں۔“

”افوہ۔ دن ٹریک مائینڈ۔“

”ہرگز نہیں بتلاؤ گی وجہ؟“

”نہیں۔“

”میں آوا سے کہے جا رہا ہوں کہ معلوم کر رکھیں۔ ان کو بتا دو گی؟“

”ہرگز نہیں۔۔۔ دہلی میں ڈھا کر صاف سنائی دیتا ہے؟“

”ہمیں بالکل صاف سنائی دے گا۔ ۲۹ تاریخ شام کے ساڑھے چھ بجے۔ پھر ساڑھے ساڑھے

پھر سوادس، تمہارا ہندوستانی پروگرام کس وقت ہے؟

”سارے سات“

”کیا کیا گا رہی ہو؟“

”ہندوستانی پروگرام میں؟ ‘مائی ری میں تو‘ دالاجھن۔“

”سناؤ۔ سناؤ۔“

”یہاں شرک پر۔“

”یہ شرک ہے؟ سننا، جنگل میا بان۔ ہو کا عالم، آہستہ سے گننا دو۔“
خاموشی۔

”مائی ری میں تو لیور میو مول۔“

”ہاں۔ ہاں اور آگے۔“

”کوئی کہے چھانے، کوئی کہے چوڑے۔ لیو ہے جنتاڑھول۔“
خاموشی۔

”پھر رک گئیں، ارے گاؤ بھائی۔“

”کوئی کہے کارو، کوئی کہے گورو۔ لیو ہے انکھیاں کھول۔“

”شاہاش بالکل ٹھیک کہتی ہو۔“

”جائیے ہم نہیں گاتے۔“

”کیری آدن۔ کیری آدن۔ ایڈریٹ۔“

”کوئی کہے ہلکو، کوئی کہے بھارو۔ لیو ہے تراجو تول۔“

تن کا گہنا میں سب کچھ دینا

دیو ہے باجو بند کھول۔“

”اور تین عدد بالوچر ساڑیاں بھی۔“

”ڈل پو شٹ آپ۔“

”آگے۔“

”آگے کیا، بس ختم۔ مائی ری میں تو لیور میٹوموں۔“

خاموشی۔ پتوں کی سرسراہٹ، بہت دور کوئی کھول یکسانیت سے بچے جا رہا ہے۔ کیرن ا
کرتال کی مدھم گونج۔

”کیا آج منگل کی شام ہے؟“

”جی ہاں۔“

”افوہ۔ یاد ہے۔ وہ شام بھی اتنی ہی اندھیری تھی۔ جب ”نور الرحمن میاں“ پہلی بار اس پینڈنگ
پرا کر کھڑے ہوئے تھے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۶۳ء۔“

”نہیں۔ ۲۴ اکتوبر۔“

”ہرگز نہیں ۲۵ اکتوبر۔ ہمارے تو دل پر نقش ہے بھائی۔ اچھا سنو، ابھی تمہارے میوزک کے
کوئرس میں دو سال اور باقی ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”اس کے بعد کیا کہلاؤ گی۔۔۔ لیکچر۔۔۔؟“

”جی جناب۔۔۔ لیکچر۔۔۔ فیکلٹی آف میوزک۔ دشوا بھارتی انٹرنیشنل یونیورسٹی!“

”افوہ۔ رعب پڑ گیا بہت سخت، مگر تم ساتھ ہی ساتھ اپنی ایم، اے کی پڑھائی بھی شروع کر دینا
”بہت اچھا۔“

”گڈ، تو تمہارے فوری مستقبل کی طرف سے تو اطمینان ہے، ویسے یہ یاد رکھو کہ جب تک
ہاں زندہ ہوں تمہارا مستقبل محفوظ ہے۔۔۔۔۔ سنو۔ گری راج کیا کہیں گے؟“

”گری راج۔۔۔؟“

”ہاں ان کی لاڈلی گوری، ایک بے تکی سیاسی کے ساتھ چلی جائے گی تو بہت خفا
ہوں گے؟“

”میرا خیال ہے کہ زیادہ خفا نہیں ہوں گے۔ آپ بابا کو نہیں جانتے۔ بس مجھے صرف اپنی
پیشی ہاں کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔ وہ ایک کٹر مذہبی خاتون ہیں۔ مگر بابا ان بے چاری کو سمجھا بھلا
گے۔ وہ بابا کی unconventional باتوں کی عادی ہیں۔ بابا خاصے قدامت پسند پڑ

مگر جہاں میرے رنج و راحت کا سوال پیدا ہو وہ سماجی قوانین کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ پہلے
ی انھیں اپنے سماج سے کیا سروکار ہے۔ برسوں سے گوشہ نشین بیٹھے ہیں۔

”قواب میں اطمینان سے پردیس جاؤں؟“

”بالکل اطمینان سے۔“

”بھئی واہ۔ کیا چرخیوں گاڑی چلی آرہی ہے۔“

”کہاں۔۔۔ ارے، ارے بھائے۔ پشی ماں آرہی ہیں۔“

”اس وقت کہاں گئی تھیں؟“

”رئیس کو رس کے قریب جو پرانا مندر ہے نا، وہاں ہر منگل کی شام کو کیرتن ہوتا ہے۔“

”تمہارے بعد اقادرمیاں کس قدر چرخیوں گاڑی ہانکتے ہیں۔“

”بھائے۔۔۔“

”ہشت۔ میں ڈرتا ہوں تمہاری پشی ماں سے؟ مگر یہ گاڑی تو ادھر نہیں آرہی۔“

”پشی ماں سیدھی جا کر ڈیوڑھی پراتر جائیں گی۔ تھینک گوڈ۔“

”قواب میں اطمینان سے کھڑا ہوں۔؟“

”نہیں۔ اب بھائے۔ تینوں روکے آتے ہوں گے۔ اور بعد میں طرح طرح کے سوال کریں گے۔ نہیں

ن مت جائیے۔“

”بھائی فیصلہ کر لو۔“

”کیا آپ کو فیصلے کرنے مشکل نہیں لگتے؟“

”قطعاً نہیں۔“

”مجھے بھی نہیں۔ میں کسی سے ڈرتی ہوں۔“

”اب گی بار میں تم کو شوٹنا پورے جاؤں گا۔“

تبسم۔

”کیوں کیا خیال ہے۔“

”سادھو! میں تمہارے گھر ہرگز نہ آؤں گی۔“

”علیٰ گڑھ میں بے وقوف :-
”مجھے بھی سکھلا دیجئے؟ سوں سوں۔“
”ضرور سکھلا دیں گے۔“
دور گھنٹے کی آواز۔
”ارے آٹھ بج گئے۔ اب چلوں۔ بائی۔ بائی۔“

آواز بازگشت
آواز بازگشت
آواز بازگشت

۲۹

شہرِ ممبئی رادھیہ کا سانچا

ڈیر لیٹ دیپالی

میں تم سے دلی معافی چاہتی ہوں۔ اُسے کی اس طوفانی رات اپنی مہم پر جانے سے تمہارے گھر آکر میں نے تمہیں بہت بُرا بھلا کہا تھا۔ مگر ہم سب ایک زبردست قومی کرائس گذرے ہیں۔ اور اتنی قربانیاں دے کر محمود اومیری آنکھوں کے سامنے گولی کا نشانہ بنے جیوتی راہس نے اتنا مارا کہ انہوں نے حوالات میں ہی دم توڑ دیا۔ جب ہمارے ساتھیوں نے پولس چوکی پر حملہ کیا تو بالکل ہنسی تھی۔ اور صرف جلوس کی قیادت کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے میرے اوپر کوئی فرد جرم نہیں لگا سکا۔ اور ہمیں کی جاسکی۔ جب ہمارے ساتھیوں نے تھلے پر سمجھ گولے پھینکے تو پولس نے فوراً گولی چلائی۔ اور ہم پر اشک اور گیس چھوڑا اور بری کوڑی چارج کیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میری بائیں سانس کی سخت تکلیف تھی۔ اور میں ہتھکڑی پہنے زنانہ حوالات کے فرش پر پڑی تھی۔ اور باہر شام ہو چکی تھی۔ بالکل سناٹا۔ کچھ دیر بعد کچھ سپاہی اندر آئے۔ مجھے پولس کی لاری میں بٹھال کر جیل لے گئے۔

اور ناناہ دارڈ میں ڈال دیا۔ جہاں پھری پھرتے۔ ایک نائین میرے پاس رکھ دی گئی۔ باہر کھٹ سے جب میں زور زور سے کراہنے لگی تو ایک بڑھیا دارڈ راند راندی اور بڑبڑاتی ہوئی پھر باہر نکل گئی۔ بعد حیلر آیا۔ اس نے گنداسا اسٹریچر منگوایا۔ مجھے پھر لوہس کی لاری میں لاد گیا۔ دو مسلح سپاہی ساتھ بیٹھے۔ لاری چکولے کھاتی اندھیرے شہر میں سے گذرتی سول ہسپتال پہنچی۔ مجھے اتار کر زمانہ دارڈ کے ایک میسلے سے لوہے کے پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ اس طرح ہتھکڑیوں سمیت دارڈ دیکھ کر تنگ مہسا ہو گیا۔ ایک بوڑھی عورت زور زور سے مین کرنے لگی۔ اس کا لڑکا بھی چند روز قبل اس شہید ہو گیا تھا۔ خیر ڈاکٹر آیا۔ میری مر مچ ٹی ہوئی۔ کھانا کھلایا گیا۔ سپاہی دروازے پر پہرے پر بیٹھے۔ تین دن تک جنرل دارڈ میں رہی۔ مریض عورتیں ہمدردی سے ہر وقت میرے پاس گھری رہتا حکام نے میرا پلنگ، ایک خالی کمرے میں منتقل کر دیا۔

خوش قسمتی سے میری ٹانگ کی ہڈی پر ضرب نہیں آئی تھی۔ مریض البتہ زیادہ چوٹ لگی تھی۔ یہ ڈاکٹر بڑی توجہ سے میرا علاج کرتے رہے۔ رات کو جنرل دارڈ کی عورتیں سپاہیوں کی نظر کچا کر مجھے پھل دے جاتیں اور ہر طرح میری خدمت کو تیار رہتیں۔ اور میں سوچتی رہتی اس لائق نہیں ہوں کہ میری قوم کے افرو پر اتنا خیال کر رہے ہیں۔

اسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا۔ تب ایک روز صبح صبح کمرے میں ایک سیم صاحب داخل ہوئے۔ انگریز اور چھکس اور آہستہ سے کہا: "روزی باا ادھیر عمر کی خاتون چھوٹا سا جوڑا بنا ہے۔ چھوٹے ہاں، رنگ کا فراک۔ پاؤں میں بھدے بوٹے۔ مس ایلس بارلو تھیں اور ان کو دیکھتے ہی باہر بیٹھے سپاہیوں نے انھیں فوراً اندر آنے دیا۔ مس بارلو چارلس بارلو کی بڑی بہن ہیں۔ مشنری۔ انہوں نے نرمی سے کہ میرے باپا پریشان حال مسٹر بارلو کے پاس پہنچے تھے اور مسٹر بارلو نے فوراً پہننے کے انگریز بڑے پادری ٹرنگ کال کیا تھا۔ جن کے ہاں مس بارلو گھر و ملز سے آئی ہوئی تھیں۔ میں چپ چاپ بیسی۔ وہ عجیب و غریب کی تفصیل سنائی۔ مس بارلو نے اسٹول پر بیٹھ کر مجھے سمجھانا کھانا شروع کیا۔ جیسے کہ رسم و کرم کی تبلیغ تھا کہ وہ اپنی کشیدہ ہتھیروں کی ویسی کا منتظر ہے اور یہ کہ اگر میں معافی مانے پر دستخط کر دوں تو مجھے فوراً رہا کر دیا جائے گا۔ اور جہاز کے ڈسٹرکٹ ہسپتال سرکاری حفاظت میں ڈھاکے پہنچا دیا جائے گا (پینے کے ڈمی۔ ایم مسٹر بارلو نے کہا) میں نے صاف انکار کر دیا۔ مس بارلو اٹھ کر چلی گئیں۔ دوسرے روز صبح پھر آئیں۔ ایک، پھل،

اظلاسک اٹھائے جیسا ہی ساتھ (میری یہ نئی شان و شوکت دیکھ کر ہسپتال کے عملے اور پہرے کے سپاہی بہت
بہ ہوئے اور ان کا رویہ بدل گیا) اس بار لو نے پھر مجھے اس نرمی سے لیکر چلانا شروع کیا گویا میں کوئی کم عقل لڑکا
ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ وہ مایوس ہو کر چلے گئیں۔

اس رات زناہ جزل دارو ڈکی ایک مریضی لڑکی خدیجہ چپکے سے میرے پاس آئی (اس کا باپ کپڑی کا موٹی
رکھا) اور کہنے لگی دیدی ہم سب عورتیں برابر آپ کی صحت کے لئے دعا میں مانگ رہے ہیں۔ لیکن آپ نے
مافی نامہ پر دستخط کر دیئے تو ہم آپ کو کبھی معاف نہ کریں گے۔

میں نے اس سے کہا۔ خدیجہ۔ تم سب اطمینان رکھو۔ میں ہرگز معافی نہ مانگوں گی۔ اسی وقت باہر پہرے
سپاہی نے ڈنڈا بجایا اور وہ چپکے سے کھسک گئی۔

ایسی بارو تیسرے روز شام کو آئیں۔ اب کے سے ایک بنگالی افسران کے ساتھ تھے۔ انہوں نے
دع کرایا۔ مسٹر سین گپتا کے اسٹنٹ، مسٹر رتی کمار سانیال۔ یہ تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے
جواب نہ دیا۔ مسٹر سانیال نے بھی اس بارو کے الفاظ دہرائے۔ معافو نامے پر دستخط کرو دیجئے۔ میں نے
سری طون کروٹ بدل لی۔ مسٹر سانیال نے کہا۔ میں کل معافی نامہ لے کر آؤں گا۔ کل تک اچھی طرح سوج
۔ ایسی بارو کو شاید امید ہو چلی تھی کہ میں نرم پڑ جاؤں گی۔ چند منٹ بعد وہ اور مسٹر سانیال واپس چلے گئے۔

چوتھے روز صبح مسٹر سانیال پھر آن موجود ہوئے۔ لیکن ان کے ہمراہ اس بارو کے بجائے ان ہی کے منسلک
اور صاحب تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے کزن بسنت کمار سانیال ہیں۔ کلکتہ کے ایڈووکیٹ اور جنرلٹ
انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ انٹرویو کے معرکے کے بعد کے حالات "کور" کرنے کے لئے کلکتہ سے آئے ہوئے ہیں۔

یہ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے ذرا حیرت سے سوچا کہ ایک سرکاری افسران قسم کے انٹرویو کی اجازت کس
بار سے ملے ہے۔ مگر یہ اندولن کا بنا ریل نانا تھا۔ مہرچر کھن تھی۔ کچھ پتہ نہیں کون ہمارا ساتھی ہے کون دشمن۔

رتی کمار سانیال مسکرا رہے تھے۔ مسٹر بسنت کمار سانیال اب تک بت کی طرح بیٹھے مجھے تلکے جارہے تھے۔
ایک دم گھبرا گئی۔ میرا طبع بھی کیا رہا ہو گا۔ اس وقت مانتے پر پٹی بندھی۔ مسر جھانڈ نہ پیٹا۔ جیسے برسوں کی روگی
ت آٹھ دن سے آئینہ تک نہ دیکھا تھا۔ بھنے بڑا غصہ آیا۔ یہ انٹرویو کی کیا تک ہے اور میں کون سی اتنی بڑی
اہم روٹ ہوں۔ میری جیسی ان گنت لڑکیوں نے کیس زیادہ میا درسی سے یہ اندولن چلایا ہے۔ میں تو پولیس کی
لاٹھی سے ہی چکر اکر کر پڑی۔

خیر۔ تو بسنت کمار سانیاں نے مجھ سے چند عام سے سوالات کئے۔ کہاں پڑھا ہے۔ تحریک میں سے ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور منشا کار کے دونوں باہر میں نے چونکہ معافی مانگنے سے قطعی انکار کر دیا تھا اور میری ٹانگ اور سر کے زخم ٹھیک ہو اس لئے دس روز بعد مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر پولیس گاڑی میں سوار کر دیا گیا اور دوبارہ جیل پہنچا دیا گیا۔ اس روز رات بھر زندہ وارڈ میں رت جگا رہا۔ مرض لڑکیاں چپکے چپکے قاضی نذر اللہ اسلام کے گئے رہیں صبح کو جب میں اپنے کمرے سے نکل کر جا رہی تھی بہت ساری مرضی عورتیں برآمدے میں کھڑی رہی تھیں۔ ان سب کو معلوم تھا کہ اگر تمہارے گئے پھینکنے کا جرم مجھ پر ثابت ہو گیا تو عمر قید ہو سکتی ہے پلنگ سے لٹا کھٹک سکتی تھیں وہ بھی زسوں کے چلانے کی پرواہ کے بغیر کھسکتی کھسکتی وارڈ کے دروازے میں آگئی تھیں۔

چنانچہ میں ڈسٹرکٹ جیل کے زندہ وارڈ میں پہنچا دی گئی۔ کوٹھڑی میں پہنچ کر مجھے پہلی بار احساسہ میں داخلہ کیا گیا۔

تو بسنت کمار سانیاں نے کہا کہ میں قطعی فکر نہ کرنا کہ جسے جہاں لگانے کے نامور بیرسٹر ہیں۔ اگر مجھ پر مقدمہ چلا تو وہ پیروی کریں گے۔ میں نے کہا کہ آپ میرے لئے اتنی پریشانی کیوں اٹھا رہے ہیں۔ وہ ایک دم ہنس گئے۔ قصہ مختصر کرتی ہوں دیپالی بسنت کمار سانیاں روزانہ شام کو جیل آکر مجھے قانونی صورت حال سے کرتے رہے۔ اشرفی کے سر کے کے بعد ہم بیٹالیس لوگوں کو بغیر مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا تھا۔ سندھ اور دوسری لڑکیاں کشتیہ جیل بھیجی جا چکی تھیں۔

اب دیپالی فور سے سنو۔ مجھے یہ انکشاف ہوا کہ بسنت کمار مجھے سید پسند کرنے لگے ہیں۔ اسی وقت وہ جو صرف دو روز کے لئے پینڈ آئے تھے آج ایک مہینے سے یہاں ڈٹے ہوئے تھے۔ یہ صبح تھا کہ وہ قومی میری مدد کرنا چاہتے تھے مگر اور بھی تو اتنی لڑکیاں جیلوں میں بھردی گئی تھیں صرف میری مدد ہی کیوں ہاں اس جواب میں انہوں نے کہا کہ ان سب لڑکیوں کے گھر والے ان کے لئے دوڑ دوڑھوپ کوں گے میری مدد کرنے والا نہیں ہے۔ (میں ان کو پاپا کے متعلق بتا چکی تھی) مگر مجھے لگتا ہے یہ بھی گپ تھی۔ دراصل ان کو مجھ سے عشق ہوا تھا۔ نوایت فرسٹ سائٹ گپ نہیں ہے۔

ایک روز وہ خوش خوش آئے اور کہنے لگے مجھے دس ہزار کی ضمانت پر دیا گیا جاسکتا ہے۔ میری ضمانت کون دے گا۔ میں نے کہا۔ اس کے متعلق سوچنا ہی بے کار ہے۔ دراصل دیپالی میں نے اپنے تیار کر لیا تھا کہ ایک نامعلوم مدت تک جیل میں پڑی رہوں گی اور پاپا میرے غم میں روتے روتے اندھے بن گئے یا مر جائیں گے۔ (ایس بارو ہسپتال کے بعد ایک مرتبہ جلی بھی آئیں تھیں۔ مگر میرے ارادہ کی مضبوطی وہ لگا کر دوبارہ نہ آئیں۔ گارڈ ہلز واپس چلی گئیں)

دوسری صبح دروازہ کھلا۔ جیلر نے اندر آ کر کہا آپ کو رہا کیا جاتا ہے۔ ضمانت سٹرٹنٹ لکار سائیل اٹھی۔ میں بالکل ہی بھوٹکی رہ گئی۔

جیل کے پھاٹک پر بسنت لکار اپنے بھائی بھادج رتی اور رنجنا سائیل کے ساتھ موٹر لے کر منتظر تھے۔ پاپا کے ساتھ گھر لے گئے۔ رتی لکار سائیل کی کونٹھ سول لائنز میں تھی۔ وہاں سپیچ کرا فون دیپالی۔ مجھے ایسا لگا۔ زناہ جیل اور ہسپتال کے زناہ جنرل وارڈ کے بھیانک، افسردہ ماحول کے بعد یہ دوسری دنیا معلوم۔ میں نے سوچا۔ میں خوش قسمت ہوں۔ میں جو اکثر اپنی اپنی کالج کی محدود سی زندگی سے شاک رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسی دنیا میں بیشتر انسان کتنی تکلیفوں میں زندہ رہتے ہیں۔ کیسی کیسی ذلتیں، ذیتیں اٹھاتے ہیں۔ مجھے وہ سب زناہ جنرل وارڈ کی غریب، میلی کچیلی لیکن باہمت عورتیں یاد آئیں۔ مجھے یہ چلا کہ ہماری جنتا، ہماری عورتیں واقعی کتنی بہادر ہیں۔ کیسی بہادری سے زندہ رہتی ہیں۔ یہی بہادری سے مرئی ہیں۔

اتنے دنوں بعد اچھے سے غسل خانے میں اچھی طرح نہائی۔ صاف ساری پہنی۔ میز پر بیٹھ کر کھانا کھا۔ اور برابر یہ احساس رہا کہ روزوں انسانوں کو زندگی کی یہ بنیادی آسائشیں ہی میسر نہیں۔ یہ احساس پچھلے پہلی بار ہوا۔

شام کو ہم تینوں برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بسنت نے مجھ سے کہا۔ کل روانگی ہے۔ سارا کھلو۔ (میرے پاس سامان ہی کہاں تھا، جو ساری پہن کر میں ہم پر گئی تھی وہ خون میں تر ہو چکی تھی۔ دل میں انہوں نے ایک جھڑسا روپ پہننے کو دیدیا تھا۔ مجھے وہ روپ بہت چبھتا تھا۔ بے چاری خدیجہ مجھے اپنی ساری اور بلاؤز اور پٹی کوٹ پہننے کو دیدیا تھا۔ روزانہ وہ اپنی ایک ساری دھو کر رکھا کر مجھے کو دیتی۔ وہ خود بہت غریب لڑکی تھی۔ ایک سماج چیر اسی کی بیٹی۔ دوسری عورتوں نے بھی مجھے اپنی ساری

پہننے کو دیں۔ یہ سب مجلس عورتیں تھیں۔ دیپالی۔

”سامان میرے پاس کہاں ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے۔ ”بالکل عادتاً مندر سے نکل گیا۔“

”میں روزی کو کل بازار لے جاؤں گی۔“ رنجنا بولیں۔

”میں ان کے بازار میں کیا رکھا ہے۔ جب وہ کلکتہ پہنچے گی تو۔۔۔“ لبنت بابو نے کہا شروع کیا

”کلکتہ کیوں۔۔۔؟“ میں نے ان کی بات کاٹی۔

”کلکتہ اس لئے کہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں۔“ لبنت بابو نے جواب دیا۔

اسے ویمنز میگزین رومانس، طوفانی محبت، سنڈیلا اسٹوری وغیرہ وغیرہ کیا کہتے ہیں۔ اپنا تاج

تو بہر حال یہ بتا لے کہ اس طرح کے واقعات زندگی میں یقیناً ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

میں نے پاپا کا غیظ و غضب، یہ انوکھی، پر مضمحل صورت، ہر چیز نظر انداز کر دی۔

سول میرج کے لئے عدالت جانا پڑتا۔ اور نئے قضیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ چنانچہ دوسرے روزات کو چپکے۔

پینڈت کو بلایا گیا۔ ٹیکل ٹھٹا تازہ برہمن۔ ڈرائنگ روم میں پھیرے پڑے۔ باقاعدہ۔ میرا نام رادھیکا رکھا

گیا۔ لبنت نے مجھے بتایا کہ بنگالی دیشنومت میں ہر مرد کرشن اور ہر عورت رادھا کا تھوڑا ہے۔ لونی آئیٹیا

مذہب و مذہب سب میرے لئے معنی بات ہے۔ چرچ کا پادری چند الفاظ ہر ادیتا۔ پینڈت نے بھو

اسی طرح کچھ مٹو مٹو کہہ دیا۔ اصلی چیز محبت ہے۔

تین روز بعد ہم لوگ کلکتہ آگئے۔ لبنت کی کوٹھی بالی گنج میں ہے۔ بیجا علی خاندان۔ ان کے بابا کلکتہ

کے مشہور سرجن ہیں۔ بڑے بھائی بیرسٹر۔ لبنت کی بھابھی بھی ڈاکٹر ہیں۔ میری نندہ۔ برڈ بورن کالج میں کیمسٹری

کی لیکچرر ہے۔ بڑا روشن خیال اور کلچرڈ خاندان ہے۔ میرے سسر اور بیٹھنے نے جو بڑے جو شیلے قوم پرست

ہیں فخر سے میرا سواگت کیا۔ لیکن ساس اور کہنے کی دوسری بڑی بڑیاں اس شادی سے خوش نہیں ہیں

کیونکہ بہر حال میں عیسائی ہوں۔ اور ایک گناہم غریب پادری کی لڑکی۔ مگر یہ نوگ اتنی شائستہ ہیں کہ اپنے کسی

رویت سے اپنی ناخوشی کا اظہار نہیں کرتیں۔ اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ لبنت کمار مجھے کتن چاہتے ہیں۔ یہ ایک

سجید sophisticated خاندان ہے۔ انارٹ کے خاندان جیسا۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد میری

ساس اور دوسری بوڑھی خواتین میرے برتاؤ سے خوش ہو جائیں گی۔

ہماری کوٹھی سرپری توش رانے کے بیٹے کی کوٹھی کے پڑوس ہی میں ہے۔ میرے جیٹھ ادا بست کی مٹر بہت دوستی ہے۔ چنانچہ دیپالی اب میں جہاں آرا اور ادا رانے والے اس اونچے طبقہ میں شامل ہو چکی پر مجھے اپنے احساس کمتری کی وجہ سے اتنا رشک آیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں میں اس سہانی سے تم کو لکھ رہی اور کو نہیں لکھ سکتی۔

سانیاں بہت دولت مند خاندان ہے اور دیپالی میری ساری عمر عزت میں کٹی۔ اب میں خوش ہوں گا کہ اس کی زندگی گزاروں گی۔ روپے کی قدر اسی کو ہوتی ہے جس نے ہمیشہ تنگی و ترشی سے بسر کی ہو۔ ہماری ملی زندگی تمہیں یاد ہے ؟

پاپا اکثر اسرار بانی کی بات کیا کرتے تھے۔ اور ذرا سوچو تو مجھے بسنت کس ذریعے سے ملے اپنے پرانے پارس بارلو کے ذریعے ! اگر چارس بار لو اپنی بہن کو ٹرنگ کال نہ کرنا، وہ مجھ سے ملنے نہ آتیں۔ وہ اپنے ربی بابو کو لے کر آئیں اور ربی بابو کے ساتھ بسنت کمار لے !!

پاپا ظاہر ہے کہ ہندو سے شادی کرنے کی وجہ سے مجھے قطعی معاف نہ کریں گے۔ میں نے بھی ایک ایک ان کو کتنے عظیم حد سے سنبھلے ہیں۔ کلکتے پہنچتے ہی میں نے اور بسنت نے اکتھے پاپا کو خط لکھا۔ اسے ان کی BLESSINGS کی درخواست کی۔ آج صبح ان کا چہرہ سطوروں میں جلو آ یا ہے لکھا کہ وہ خداوند خدا کے شکر گزار ہیں کہ میں زندہ بچ گئی اور خیریت سے ہوں۔ مگر میں نے مسوع کا دامن چھوڑا۔ بسنت پرست کافر سے شادی کر لی۔ اس وجہ سے وہ عمر بھر میری شکل نہ دیکھیں گے۔ اور ملی کالج کے دروازے اور ہمیشہ کے لئے بند ہیں۔ اور یہ کہ وہ میری روحانی نجات اور بخشش کے لئے برابر دعا کرتے رہیں گے۔

اب ختم کرتی ہوں۔ دیپالی۔ بہت لمبا خط ہو گیا۔ ڈائینگ روم میں پنچ کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اب دل۔ سسرال کا معاملہ ہے بھائی ! پی۔ ایس۔ بسنت نے تم کو بہت بہت سلام کہا ہے۔ اور تم سے ملنے منت مشتاق ہیں۔ اب تم جلدی سے ہمارے پاس کلکتہ آؤ۔

تمہاری

رادھیلا روری سانیاں

بالی گنج۔ کلکتہ۔ ۸ اکتوبر ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر بنوئے چند سرکار

بھوتارنی دی نے کھانے کے کمرے کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا کالے رنگ کی لمبی پھانک پر کھڑی تھی۔ یہ مس صاحب کل بھی آئی تھیں۔ بنوئے گھر پہنچا تھا۔ باہر سے باہر چلی گئی۔ اب آج پھر آئی بیٹھی ہیں۔ بھوتارنی دی نے بیٹھک خانے کے دروازے میں جا کر پردے کے پیچے سے نظر ڈالی۔ ہمان خاتون کو تیوری پر بل ڈال کر غور سے دیکھا اور کھڑا دس پہننے کھٹ کھٹ کرتی رسوئی کی طرف چلی گئیں۔

ٹوٹنے جا کر ڈاکٹر سرکار کو ان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ”اچھا۔ بٹھاؤ۔ میں تاہوا مریض اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈاکٹر سرکار نے چلمی میں ہاتھ دھوئے اور تولیہ سے کلاٹیاں پونہ تھپتھپکے غانے میں آئے۔ اس وقت ہمان بی بی مسز سرکار مرحومہ کی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھیں۔

”نو مشکار۔ او ماری۔“

”نو مشکار۔ بنوئے بابو۔“ انہوں نے چونک کر کہا۔

”دیپالی تو بوبو پور جا چکی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ مسکرائیں۔

شیریں مسکر ایٹ۔ ڈاکٹر سرکار صوفے پر چپکے بیٹھے رہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ شبنانی نے مرنے کے بعد سے آج تک، اس گھر میں، اس کمرے میں، دیپالی اور بھوتارنی کے علاوہ اور کسی عورت کے ہی نہیں آئے تھے۔

اومانے باتیں شروع کیں۔ سوشل ”اسمال ٹاک“۔ ٹوٹو نادر سے سلامتی مید کی کشتی میں چاہ لے کر آیا۔ بھوتارنی دی نے باقاعدہ چاندی کا سیٹ مقفل الماری سے نکال کر نئی پیالیوں کے ساتھ چاہ بھی تھی۔ عمدہ ٹرے کلا تھ۔ جلدی میں ٹی کوڑی کا غلاف تہہ لیں کرنا البتہ بھول گئیں۔

”دیپالی تو اسی اتوار کو بوبو پور گئی ہے۔ اگر آپ جب آگئی ہوتیں تو اس سے ملاقات ہو جاتی۔“

”کیوں بنوئے بالو۔ کیا میں آپ سے ملاقات کرنے نہیں آسکتی؟“
 بنوئے بالو ہنسنے لگے۔ ”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں؟“ وہ ذرا سیلف کونشس سے ہو کر میز
 انگلیاں بجانے لگے۔ شبانی کے مرنے کے بعد سے انہیں خواتین سے غیر ضروری ”اسمال ٹاک“
 کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

اُمانے اُن پر ایک محفوظ نظر ڈال کر دیش چندرا انجہانی کے پورٹریٹ کو دیکھا۔ واقعی
 لوں بھائیوں میں بڑی گہری مشابہت تھی۔ بنوئے بالو بھی خاصے دلکش تھے۔ یہ آج غور سے
 دیکھنے پر سب سے چلا۔ دیپالی نے اس روز پہلے روز دو ڈولینڈرز کے مورنگ روم میں ان کے متعلق فلتا
 میں کہا تھا۔ بنوئے بالو واقعی بہت جاذب نظر تھے۔ اور سید تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ بنوئے بالوان کو پہچاننے کے لئے پہچانک تک گئے۔ واپس
 پھر مطب میں جا بیٹھے۔

چند روز بعد اُمانا پھر چند رکنج آئیں۔ یہ اتوار کا روز تھا۔ کوئی پندرہ منٹ تک مطب میں بیٹھیں
 رکھا کل شام آؤں گی۔

دوسری شام وہ دیر تک دیش چندرا انجہانی کی باتیں کرتی رہیں جن کی وہ عقیدتمند اور پرتار
 ہیں۔ پھر شبانی کا تذکرہ چھڑا۔ ڈاکٹر سرکار موجودہ شبانی کے متعلق کسی سے باتیں نہ کرتے تھے وہ
 ان کے نہاں خانہ دل کا ایک ایسا انمول خزانہ تھا کسی دوسرے سے اس کا ذکر کرنا ہی اس کی توہین
 سمجھی جاتی تھی۔ مگر اُمانے ایسے خلوص اور محبت سے شبانی کے متعلق پوچھا کہ وہ بے اختیار اس کا تذکرہ کرنے
 لگے۔ اس عورت کو وہ اپنا ہمارا بنا سکتے تھے۔ یہ عورت شاید جانتی تھی کہ مرد دراصل کتنا
 HELPLESS ہوتا ہے اور ہر عورت میں شاید اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہے۔

اب وہ شام کے وقت اُمانا کا انتظار سا کرنے لگے تھے۔ تینوں لڑکے اس وقت کھیلنے کے
 باہر چلے جاتے تھے ورنہ اپنے بابا کو برآمدے میں ذرا اکٹھن کے ساتھ ٹھہرتا دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھتے
 رہتے۔ شبانی ان کو بخشنے والی نہ تھیں۔ وہ تو ایسے کسی موقع کے لئے برسوں سے ادھار کھائے
 بیٹھی تھیں۔ ایک روز انہوں نے بنوئے بالو سے کہا۔ ”سر پر ہی توش رائے کی دلایت پلٹ لڑکی میری
 باند سے بھیا پرتو ہو گئی ہے۔ اب اسے زیادہ دبدبے میں نہ رکھو۔ بڑھیا ہوئی جا رہی ہے

لاکھوں کا جہیز لائے گی۔ کیوں کھوگا۔؟

”دیدہی۔۔۔ بتوئے بابو نے یک نخت سید محمد بھجھلا کر کہا۔ ”اسندہ ایسی پھر حماقت کی بات نہ کہنا؛ وہ ہونٹ پچکا کر مسکراتی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

مگر کہاں ماننے والی تھیں۔ دوسری شام جب اوما دیسی آئیں بھوتارنی دیسی نے چھپاک سے اندر سچ کر پان پیش کیا۔ اوما دیسی کھڑکی کے پاس بیٹھی ڈاکٹر مرکار کا وہ ذاتی البم دیکھ رہی تھیں جس میں ان کی لڑکپن کا لٹچ کے زمانے، سیاسی دور، شادی اور سنی مومن کی تصویریں تھیں۔ ان کی فرمائش اور اصرار پر بنوئے بابو نے فوراً یہ البم لاکر ان کو دیدیا تھا اور خود کسی کام سے اپنے مطب کی طرف چلے گئے تھے۔

اوما کی بھوتارنی دیسی سے اب تک ملاقات نہ آئی تھی۔ وہ ان سے بھی بہت کھل مل کر باتیں کرنے لگیں۔ کچھ دیر بعد بڑی بی نے پھوٹ سے کہا۔ ”اے تم سیاہ کب کر دو گی بٹیا؟“

اسی لمحے ڈاکٹر مرکار کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے انتہائی کوفت اور مذمت سے بڑی

بہن کو دیکھا۔ ”دیدہی۔۔۔“

اوما بھی صاف حبیبنپ گئی تھیں۔ لیکن بھوتارنی دیسی نے اطمینان سے جواب دیا ”اے کیوں؟ تمہیں تو اپنی بیٹی تک کی شادی کی فکر نہیں۔ تم کو ان معاملات سے کیا غرض۔ جاؤ تم باہر جا کر اپنے قہقہے مریضوں کا ٹمپر کچھ لیتے رہو۔“

اوما دیسی سر جھجکا کر مسکرنے لگیں۔ اس ہینڈ سٹم، ہنرمیلے، تارک الدین ڈاکٹر سے ہلکا ہلکا فخر کرنے میں لطف آ رہا تھا۔ بڑی بی نے لے کے بیچارے کو بالکل ہی شرم سے لال بھبوکا کر دیا۔

بھوتارنی دیسی انھیں اور فاتحہ انداز سے قدم اٹھاتی کرے سے باہر چلی گئیں۔

”آپ۔ دیدہی کی حماقت کا برانمانے گا اوما دیسی۔“

”قطعا نہیں۔ میں پرانی نسل کی خواتین کو کیا جانتی نہیں ہوں!“ انہوں نے شگفتگی سے جواب دیا۔

لیکن اسی رات جب سب لوگ سو گئے۔ نو بھوتارنی دیسی نے سر پانے کی کارنس سے قلم ذوات اتار دیے۔ کمرے میں رہے پاؤں گئیں اور کھوکھو کھو کی کاپی بگ میں سے چند سائے کا غنڈ بھاڑے اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر اتنی پانتی مار کر بیٹھیں اور بھتیجی کو خط لکھنا شروع کیا۔ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ حروف بن کر لکھنا شروع کیے۔ بھگوتی ماما نے میری برسوں کی پررتھائیں سن لیں۔ شاید تمہارے ماپ کا گھر بس۔

دو ماہی کے آنے کی تفصیل۔ اوماہی کی محبت اور خلوص۔ (اتنے بڑے باپ کی بیٹی۔ مگر عزیز نام کو نہیں)۔
 ٹھوکا کو پسند کرنے لگی ہے۔ کھوٹا کا بھی عورت کے معاملے میں میں سمجھتی ہوں اب جا کر شاید دل نرم پڑا۔
 برشتہ مجھے لگتا ہے بہت مبارک ثابت ہوگا۔ کھوٹا کے اور تم سب کے دن بدل جائیں گے۔ اب تم ہی سچو۔
 نہری شادی ہو جائے گی۔ (ماں سے پرارہنسا ہے تم کو کوئی ڈپٹی مجسٹریٹ ملے۔ رانی بن کر رہو۔ تم نے میری
 بی بہت مصیبتیں بھوئی ہیں) لڑکے کا دل چلے جائیں گے۔ رہ گئی ہیں۔ کسی روز بھی میری آنکھ بند ہوگئی تو میرے
 ٹھوکا کا پرسان حال کون ہوگا۔ تو بیٹی خوش ہو جاؤ کہ اوما جیسی امیر اور سچھ داساں ملے گی۔ باقی اس خط
 کھوٹا سے ذکر کرنا۔ میں تمہیں بڑے راز سے لکھ رہی ہوں۔

تمہاری بیوی

بھوسارنی دیہی

ڈاکٹر مسکار کے ایک مریض مترابو مسری تو شہرائے کے موکل تھے۔ اور اکثر مطب آتے رہتے تھے
 ادہ تراڈے کی خاطر۔ انہوں نے کئی بار مسری تو شہرائے کی کاروبار دیکھی اور اوماہی کو آتے جاتے
 بھا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ دیپالی گھر پر موجود نہیں ہے۔ پھر انہوں نے ذرا کرید سے بنوئے بابو سے
 چھا کر کیا آج کل اوماہی اُن سے اپنے درد سنا علاج کروا رہی ہیں۔ بنوئے بابو صاف گواہ بھولے آڈی
 نے۔ کہنے لگے۔ نہیں ایسے ہی ملنے کے لئے جلی آتی ہیں۔

مترابو نے فوراً گھر پہ جا کر انجی بی بی کو یہ قصہ سنایا۔ مسز مترادوسرے ہی دن دو ڈولینڈ نہنچیں۔
 یہی رائے پچھلے برآمدے میں بیٹھی صبح کی کافی پی رہی تھیں اور اسٹیٹسٹین پڑھتی جا رہی تھیں۔ جب مسز
 ترا سچ چلتی آکر نزدیک کی کرسی پر بیٹھ گئیں اور نسکار کیا۔

”ادہ ہو اورن دھتی۔“ لیڈی رائے نے مسکار کو اخبار رکھ دیا۔ اور ان کے لئے کافی بنانے لگیں۔
 ڈی سی رسمی گفتگو کے بعد مسز ترا اس خوبصورتی اور فنکاری سے جو اس قسم کے معاملات میں ہون
 اتین کا حصہ ہے، اصل مقصد کی طرف آئیں۔ ”اوما کی بیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے کافی کا گھونٹ
 رتے ہوئے دریافت کیا۔

”اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ تو جانتی ہیں وہ ہمیشہ سے کتنی زود رنج اور چڑچڑھی رہی

ہے۔ لیڈی رائے نے جواب دیا۔

”جیسی تو میں نے پوچھا۔“

”نہیں۔ اب تو شکر ہے کچھ دنوں سے کافی شگفتہ نظر آرہی ہے۔“

”یہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے ہیں کوڈاکٹر سرکار کا علاج بالکل جادو کا اثر رکھتا ہے۔“

”ڈاکٹر سرکار۔۔۔؟“

”یہ بھی ڈاکٹر صاحب سے اپنے دے کا علاج کروا رہے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں۔ انہوں نے

ہی کئی مرتباً اوکو ڈاکٹر صاحب کے مطب میں دیکھا تو مجھ سے آکر بولے کہ یہ بڑا اچھا ہوا۔“

”اچھا۔ اُوما نے مجھ سے ذکر نہیں کیا۔“

مسز متراب باقاعدہ GLOAT کر رہی تھیں۔ انہوں نے بات جاری رکھی۔ ”آپ نے اُن

کا نام تو سنا ہوگا۔ بنوے چند سرکار۔ وہی جن کی لڑکی دیپالی سرکار ریڈیو پر گاتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“

”بے چارے بڑے شریف آدمی ہیں۔ بی بی نوعرہ سہا بلوک سندھاریں۔ چار بچے ہیں۔ لڑکی بس

دیپالی ہی ہے۔ بڑا اچھا خاندان ہے۔ ان کے بابا سمن سنگھ کے زمیندار تھے۔“

لیڈی رائے قطعاً بیوقوف نہیں تھیں۔ وہ مسز متراب لہجہ اور عندیہ دونوں بھانپ گئیں اور فوراً

ذرا رکھائی اور ناگواری سے دوسری طرف دیکھنے لگیں۔ لیکن مسز متراب کہ گئیں۔ ”یہ تو بنوے بابو کو بالکل

دیوتا سمجھتے ہیں۔ ایسے خاندانی اور وضعدار لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں اور ہمارے پیسے تو وہ تو ہاتھ

کا میل ہے۔“ اس نکتے تک پہنچ کر مسز متراب نے کوئی بالکل غیر متعلق موضوع چھیڑ دیا۔ اس کے دس منٹ

بعد گھٹا پھر اکرات کو پھرو میں لے آئیں۔ ”لڑکیوں کی شادی آج کل ایسا کٹھن مرحلہ بنتی جا رہی ہے آخر

کیا کیا جائے۔ میری ماشی ماں کے دیور کی لڑکی، تجلی داس گیتا تو آپ کو یاد ہوگی اُوما کی ہیلی تھی اس کی غمگین

گئی بال سفید ہو گئے وہ تنگ آکر بھٹوان جانے لنگا یا برمایا کہاں چلی گئی۔ اسکول پڑھانے۔ اب خیال آنا

ہے۔ بنوے بابو جیسا کوئی مل جاتا تو بیچاری کی قسمت بن جاتی۔ بنوے بابو بے چارے اب جا کر کوئی چوہا

پیتا ایس سال کے ہوئے ہوں گے۔ زمیندار کے لاڈ لے بیٹے تھے۔ باپ ماں نے نوعمری ہی میں بیاہ کر دیا تھا۔

یہاں تک پہنچ کر مسز متراب نے سوچا کہ اتنا آج بھر کے لئے کافی ہے۔ اور پھر دوسری باتوں میں لگ گئیں۔

یڈی رائے سسر مترا کی گفتگو سے کافی پریشان ہو چکی تھیں۔ رات کو ڈنر کے بعد انہوں نے سر
ری توش سے اس کا ذکر کیا۔ ڈھاکہ بہت چھوٹا اور پرورشیل قسم کا شہر تھا۔ اوما کی چند رکنج جانے
ناخبر اڑتی اڑتی سرری توش تک بھی پہنچ چکی تھی۔ وہ ڈاکٹر سرکار سے واقف تھے۔ اس وقت انہوں نے یڈی
رائے سے کہا: "شکر کو کرافٹ نے کسی میں دلچسپی لینی شروع تو کی۔"

"اس کا مجھے احساس کھائے جا رہا ہے کہ وہ اکتیس^{۱۳} سے اوپر ہو چکی ہے۔ مگر ایسا بھی کیا۔" یڈی
رائے نے آند دنگی سے کہا۔ وہ اب تک اس لگائے بیٹھی تھیں کہ شاید کوئی ہم تہہ راما مل جائے۔ حالانکہ لڑکی اردو
روز زیادہ چڑچڑی اور موٹی اور بھدی ہوتی جا رہی تھی۔ ہماری قسمت میں نہ جانے یہ دکھ کیوں لکھا تھا۔ معمولی معمولی
لوگوں کی لڑکیاں ایک سے ایک حسین، نازک، دلچسپ۔ ہماری بیٹی شکل دصورت اور حلیے سے استانی
لمتی ہے۔ باتیں شروع کرتی ہے تو سوائے اس کے ان بے تکے کامریڈز کے، سمجھ دار نوجوان ڈر کر دوڑ بھاگ جاتے
ہیں۔ کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اور یہ اور وہ۔ لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا ہمارے مصلحین کی شاید ہرالیہ
سے بھی بڑی غلطی تھی۔

بالائی گنج کلکتہ میں سرری توش اور یڈی رائے کے اکلوتے فرزند زمیں دیند و کمار رائے کے پڑوس
میں ایک سید دو لہندہ سانیال خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے چھوٹے بیٹے بسنت کمار سے زمیں دیند کی بڑی
دوستی تھی۔ پچھلے دنوں جب اوما کلکتہ اپنے بھائی کے پاس جا کر رہی تو وہ نوجوان اس سے بھی ملنے آیا کرتا تھا اور
یڈی رائے کو امید بندھی تھی کہ شاید بسنت اوما میں کچھ دلچسپی لے۔ مگر اس نے بھی ابد اکر اوما کو دیدی کہنا شروع
کر دیا اور پھر وہی کارل مارکس اور لینن اور اسٹالن اوما نے بھی ذرا سی بھی جو اس میں دلچسپی لی ہو۔ بس وہی
کجنت ہوگئی اور مارکس اور بسنت نے اس غریب کالے پاروی کی حسین لڑکی سے بیاہ کر لیا۔ غضب خدا کا۔
اور اب ساری دنیا دیکھنے کے بعد یہ بے چارہ بڑے چند سرکار اوما کو بھایا ہے۔ چلو۔ واقعی
شکر ہے۔ کوئی تو پسند آیا۔ سرکاری افسر سے شادی کرے گی نہیں۔ کمپوسٹ ہوگئی ہے۔ تو ظاہر ہے کسی ایسے
بی نادر آدمی کو چھانٹنے۔

"مگر بنوئے بالو بہر حال خاندانی آدمی ہیں۔ ان کے باپ زمیں دیند رویش چندر کو لوگ آج بھی ڈھاکہ
میں بھولے نہیں ہیں۔" سرری توش کہہ رہے تھے۔ یڈی رائے نے گہرا سانس بھرا۔
"ان کی ایک جوان لڑکی بھی ہے۔" یڈی رائے نے سوچ کر کہا۔

”دیپالی۔۔ اس کے گانے تو تم بڑے شوق سے سنتی ہو۔ اور ہمارا تڑیل اس کے ریکارڈ بڑی لگن سے بکنا کرتا ہے۔ سرسری قوش نے نہیں کر کہا۔

لیڈی رائے خاموش ہو گئیں۔ اور سوچنے لگیں۔ دیپالی کچھ عرصے بعد اپنے گھر چلی جائے گی۔ لڑکے اپنی ذراہ لیڈنگ ٹھیک ہے۔ بجائے مجبوری اُٹا کے لئے بنوئے بابو ہی بالکل ٹھیک ہیں۔ اگر وہ آج ہی اپنا عندیہ اظہار کر دے تو بات آگے بڑھائی جائے۔

صبح کو لیڈی رائے نے اُٹا سے ڈاکٹر مرکار کے متعلق گولی گولی الفاظ میں استفسار کیا تو وہ مسکرا کر چہ نہیں۔ لیڈی رائے نے فوراً چپکے چپکے بنوئے بابو کے متعلق مزید معلومات شروع کروادیں!

ایک روز آوا چند رکن گئیں تو ڈاکٹر مرکار سے کہنے لگیں۔ ”دیپالی کے لئے اب آپ کا کیا پروگرام ہے

”دیپالی۔۔ ابھی تو وہ اپنے میوزک ڈپلومے کے لئے پڑھ رہی ہے۔“

”اس کے بعد؟“

”پتہ نہیں۔“

”آپ کے خیال میں ہے کوئی لڑکا؟“

”نہیں۔ آپ اتنے لوگوں کو جانتی ہیں آپ ہی کوئی تجویز کیجئے۔ مگر آپ کو معلوم ہے میں لمبا چوڑا چہ نہیں دے سکتا۔“

”مجھے وہ اپنی چھوٹی بہن کی طرح عزیز ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اس کا اچھی جگہ بیاہ ہو جائے۔“

”جلد از جلد۔۔ ابھی دو سال تو اس کے میوزک ڈپلوما میں باقی ہیں۔ پھر اس کی ضد ہے کہ ایم۔ اے کیے

ن۔ ابھی اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔“

”نہیں۔ جلد ہی وہ اپنے گھر چلی جائے تو بہتر ہے آج کل زمانہ۔۔۔“

”بڑا خوب ہے؟ بنوئے بابو نہیں پڑے۔“ آپ جیسی ترقی پسند یہ کہہ رہی ہیں!۔“

”میں آپ کو قدامت پرست سمجھتی تھی مگر آپ شاید کچھ سے بھی زیادہ ترقی پسند ہیں!“

”ہیں۔ میں پرانی وضع کا آدمی ہوں۔ مگر میں دیپالی کی خلاف مرضی اس کا بیاہ ہرگز نہ کروں گا۔“

”اگر وہ آپ کی خلات مرضی کرے تو؟“

”وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ بڑی معصوم، سیدھی بچی ہے۔“

”اُدّا ذرا سکرائیں۔ بنوے بابو نے ان کو تعجب سے دیکھا۔“

”ہر باب اپنی بیٹی کو معصوم سیدھی ننھی بچی ہی سمجھتا ہے۔“

”آپ کے والد بھی آپ کو یہی سمجھتے ہوں گے۔“ بنوے بابو نے ہنس کر جواب دیا۔ ”اُدّا ملے لاجواب ہو“

”نیں چند سیکنڈ بعد انہوں نے کہا۔“ ”غرض کیجئے۔ دیپالی عزیز فرقتے میں شادی کرنا چاہے۔؟“

”غیر فرقتے میں؟ آپ کو یہ خیال کس طرح آیا؟“

”بنوے بابو۔ وہ ایک مسلمان لڑکا نہیں ہے۔ کامریڈ ریمان۔ وہ شاید آپ کے ہاں بھی کئی بار آچکا ہے“

”نے کچھ بڑی ہنسی افواہ سنی تھی کہ۔۔۔“

”افواہ۔۔۔؟“ بنوے بابو نے گھبرا کر پوچھا۔

”بنوے بابو۔ ڈھا کر اتنا چھوٹی سی جگہ ہے۔ افواہیں اڑتے کیا دیر لگتی ہے۔“

”لیکن آپ نے کیا سنا؟“

”کچھ نہیں۔“ ”اُو مانے اطمینان سے صوفے پر پہلو بدل کر عینک اتاری۔ لگائی۔ اُدّا ذرا بے پرواہ آواز

”کہنے لگیں۔“ ”دیپالی پچھلے سال جون میں جب بولسور سے گھر آنے کے بجائے سندھ میں چلی گئی تھی نا۔“

”سنستھال پر گئے۔“ بنوے بابو نے تصحیح کرنا چاہی مگر اُدّا مدی کہے گئیں ”وہ سندھ میں گئی تھی نا۔“

پچھلے سال جون میں۔ ریمان سے ملنے۔ آپ کو تو خیر معلوم ہی ہوگا۔ تب ڈیرہ کے کسی موٹل نے صنم کھلنا کے ایک

یوے اسٹیشن پر، شاید باگھیر بارٹ پر ریمان کو اسے ٹرین پر سوار کراتے دیکھا تھا۔ ”اچانک وہ سربراہی کے ساتھ

تھا، ادھوری چھوڑ کر کھڑی ہوئیں۔ کیونکہ ان کو لگا جیسے نہتے بابو پر دل کا دورہ پڑنے والا ہے۔ وہ بھونچکے سے

نیں نکلے جا رہے تھے۔

”اوہ۔۔۔ آئی ایم سو سوری۔ بنوے بابو۔ میرا خیال تھا کہ آپ جانتے ہوں گے۔ آئی ایم سو سوری۔۔۔“

بز۔ اوہ۔۔۔“

بنوے بابو نے ہاتھ اٹھا کر ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ذرا کرب سے اُن پر نظر ڈالی اور صوفے کی

نت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں اوہ وہ سمجھ کر بیٹھ گئے۔ اور تیوری پر مبن ڈال کر کھڑکی سے باہر

دیکھنے لگے۔

”مجھے افسوس ہے، نوئے بالو“ اوما نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”میرا خیال تھا آپ خود جانتے ہوں۔
دیپالی بڑی مستانہ تھی ہے۔ وہ آپ سے عھوٹ نہیں ہوتی ہوگی۔“

”اُسے عھوٹ بولنا آپ نے سکھایا ہے اوما دی۔ نوئے بالو نے مدھم آواز میں کہا۔
”میں نے۔۔۔ میں نے نوئے بالو۔“ اوما نے نینک اتار کر حیرت سے پوچھا۔

”جس طرح آپ اسے ایک بھتے کے لئے اپنے ساتھ گویا کویتلا لے گئی تھیں۔ مجھے آج تک معلوم نہیں
دراصل وہ کہاں گئی تھی۔ یہ سب آپ کی ٹریننگ کا نتیجہ ہے اوما دی۔“

”مجھے افسوس ہے، نوئے بالو۔ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں۔ اوما اب ہڑ ہڑا کر کھڑی ہو گئیں
”میں آپ کو پانی لا دوں؟“ نوئے بالو خاموش رہے۔ اوما جلدی سے کھانے کے کمرے میں گئیں۔ ڈولی
رکھی صراحی میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے سے قبل ایک نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔

شام کا وقت تھا اور رسوئی گھر سے کڑھائی کی چھن چھن کی آواز آرہی تھی۔ کھانے کے کمرے کی کھڑکی
باہر عبدالقادر کے سر پر گھوڑے گھاس چر رہے تھے۔ اوما گلاس کے کمرے تک خانے میں واپس پہنچیں۔ نا
نوئے بالو اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اوما تذبذب کے عالم میں دروازہ
کے پاس کھڑی رہیں۔ اتنے میں بھوتارنی دیسی کھڑا میں پہنے کھٹ کھٹ کرتی اندر آئیں۔

”کیا ہوا۔۔۔؟“ انہوں نے بھریں جھڑ کر دریافت کیا۔

”کچھ نہیں۔ شاید نوئے بالو کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لیجئے۔“ گلاس بڑی بی کو تھما کر
جلدی سے باہر کا رہیں جا بیٹھیں۔ اور گھر روانہ ہو گئیں۔

دوسری صبح اوما پھر چند رکنج پہنچیں۔ مطب کے دروازے میں تالا پڑا تھا۔ بچے اسکول جا چکے
تھے۔ بھوتارنی دیسی عبدالقادر کی گاڑی میں بیٹھ کر بسنے کی جنس لانے بازار گئی ہوئی تھیں۔ اوما نے اندر جا کر
بالو کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نوئے بالو نے اخبار ہاتھ میں لئے کواڑ کھولا۔

”اوہ۔۔۔ تھینک گوڈ۔۔۔“ اوما نے کہا۔

”کیوں۔۔۔؟“

”رات بھر مجھے فکر کے مارے نیند نہیں آئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو یہ صدمہ پہنچایا۔“

"میں زندگی میں بڑے سے بڑے دھچکے کو سہارا لینے کا عادی ہو چکا ہوں۔ مگر میں آپ کا مشکور ہوں کہ نے مجھے اصل صورت حال سے آگاہ کر دیا۔" وہ باہر بیٹھک خانے میں آنے لگے مگر اوما ان کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ انہوں نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

"آپ تو واقعی بالکل سادہ صوبن چلے گی۔"

بنو نے باجو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اوما نے عینک اتار کر آنکھیں ہتھیلیوں سے ملنے رہنے کے بعد کہا: "بنوے باجو آپ سے اب صحت

درخواست ہے۔"

"کہئے۔"

"آپ دیپالی پر ہرگز ہرگز یہ دظاہر کیجئے کہ میں نے آپ کو اس کے سنبھرنے جانے کا واقعہ بتایا ہے۔"

"آپ کو یہ درخواست کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس سے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"کچھ بھی نہیں کہیں گے؟" اوما نے حیرت سے ڈھرایا۔

"نہیں۔" بنوے باجو آہستہ آہستہ دروازے کی سمت بڑھے۔ "آئیے باہر چل کر بیٹھیں۔"

الی سمجھ دار اور بانغ لٹکی ہے۔ آپ کا خیال ہے میں اس طرح کی کوئی بات کہہ کر اُسے شرمندہ

نگا؟

اوما ان کے پیچھے پیچھے بیٹھک خانے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔

بنوے باجو آہستہ آہستہ کہتے رہے۔ "اوما دیمی۔ شاید۔ شاید ایک غیرت مند باپ کی حیثیت سے

دیپالی کو کال کوٹھری میں بند کر دینا چاہئے۔ اور شاید فوراً کوئی ہندو لڑکا تلاش کر کے اس کی

ی کر دینی چاہئے۔ لیکن اوما دیمی۔" انہوں نے ایک لمبا سانس لیا۔ "میں یہ سب کچھ نہیں کروں

اس اتنا میں وہ تھکے تھکے سے، بکرے کا ایک چکر لگا کر شکستہ صوفے پر بیٹھ چکے تھے۔ میں یہ بھی جانتا

کہ وہ اپنی نو عمری کی روایت، آئیڈیلزم، اس سلیمان لڑکے سے محبت، جو کچھ بھی ہو، اس کی وجہ

مجھ سے پہلے بنا کر ریمان سے ملنے اکیلی وہاں چلی گئی اور غالباً اس کے ساتھ ایک ہی جگہ رہی۔ مگر اس نے

بھی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو اسے نہ کرنا چاہئے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔"

"کس طرح۔؟"

”آپ اُودا می۔ آپ ولایت میں تین چار سال ایسی رہیں۔ آپ کے والد کو کس طرح:

ہے کہ آپ نے وہاں کوئی ایسی حرکت نہ کی ہوگی جو آپ کو نہ کرنا چاہئے۔“

اُودا پھر لاجواب ہو گئیں۔ انہوں نے دھیمی آواز میں سوال کیا ”اب آپ کیا کریں گے؟“

اور۔۔ اور ریحان کو بیاہ کی اجازت دیدیں گے؟ میں ریحان کو عرصہ سے جانتی ہوں۔ وہ کافی

اُبابی اور غیر ذمہ دار لڑکا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کزن کو let down کر چکا ہے۔ اُودا پوچھا

بھی، وہ بالکل hand to mouth زندگی گزارتا ہے۔ دیپالی ایک ہول ٹائم کے اڈاکٹر

پر کس طرح گذر کرے گی۔؟ علاوہ ازیں وہ مسلم سماج میں کس طرح ایڈجسٹ کرے گی؟ خود اس

شادی سے آپ کی اپنی پریکٹس پر بڑا اثر نہیں پڑے گا؟ آپ کے زیادہ تر مریض کٹر ہندو بھدر لوگ

ہیں۔۔ معاف کیجئے گا بنوئے بالو آپ تو ایک لاد مذہب رشی ثابت ہوئے مگر میں آپ کی ایک پُرِخوَص

کی حیثیت سے دیپالی کی بھلائی کے خیال سے یہ سب کہہ رہی ہوں۔ حالانکہ it is none of

my business!

بنوئے بالو سر پیچھے ڈالے چھت کو تک رہے تھے۔ وہ ذرا سا مسکرائے۔ ”اُودا می۔ آپ یقیناً

میرے اور دیپالی کی بھلائی کے لئے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ اور میں آپ کا ممنون ہوں۔ مگر بات یہ ہے۔۔

انہوں نے پھر ایک لمبا سانس لیا۔ ”میرے نزدیک انسانی زندگی ایک انتہائی انمول شے ہے۔ اپنی نو

جوان بیوی، اور اپنے نوجوان بھائی کو کھو دینے کے بعد مجھے احساس ہوا ہے کہ زندگی کتنی انمول شے ہے۔ ا

انسان کا دل۔۔ انسان کا دل۔۔“ ایک دم ان کی آواز میں جوش سا آگیا۔ ”اُودا می، آپ کو کیا ات

بھی علم نہیں۔ آپ اتنا پڑھ لکھ گئیں۔ دنیا گھوم آئیں۔ اتنا نہیں جانتیں کہ انسان کا دل کتنی قیمتی چیز

جوان دل اور جوان زندگی بچد۔ بچد بیش قیمت چیز میں ہیں۔ اُودا۔ اور اس ایک مختصر سی انسانی زند

گو دکھی بنانا دنیا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ زندگی بار بار نہیں ملتی۔ انسان صرف ایک بار جنم لیتا

میں پندرہ جنم میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ ایک نفوتصور ہے۔ انسان کا دنیا سے، دوسرے انسانوں سے صرف

بار رشتہ بندھتا ہے اور موت آتی ہے تو یہ رشتہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتا ہے۔۔۔ اگر۔۔ اگر مجھ

یقین ہو جائے کہ دیپالی اس لڑکے کو اتنا چاہتی ہے۔۔۔ وہ لڑکا دیپالی کو اتنا چاہتا ہے، کہ ان کے راستے میں

ہونے کی وجہ سے ان کی زندگیاں ہمیشہ کے لئے خزاں آلود ہو جائیں گی۔ تو میں یقیناً اسے شادی کی اجازت

لگا۔ ہندو سماج اور مسلم سماج اور میری پریکٹس، میری سچی کی مسرت سے زیادہ اہم نہیں۔
 "شادی کی اجازت دے دیں گے۔" "اوما نے بھونچکی ہو کر دہرایا۔
 "یقیناً!" وہ بہت محفوظ ہو کر اوما کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا۔ "تعب ہے! لکڑی برداری
 پانچویں۔ آپ کو میرے ان پروگراموں کی خیالات پر بہت خوش ہونا چاہئے۔"
 اوما۔ کرسی سے اٹھیں۔

"جاری ہیں۔" بیٹھے۔ چار دوائے پی کر جائے گا۔ دیدی ابھی بازار سے آئی ہوں گی۔"
 "نہیں اب میں چلوں" اوما نے جواب دیا۔

نئے بابو صوفے پر سے اٹھے اور انہیں کار میں سوار کرانے کے لئے باہر آگئے۔ جب اوما کار میں بیٹھ
 ، تو انہوں نے ہاتھ اونچا کر کے مسکراتے ہوئے مسکایا۔ اور فوراً دو مریضوں سے بات چیت میں تنہک
 نے جو اسی وقت پھاٹک پر پہنچے تھے۔

دو ڈیڑھ گھنٹہ دوا پس پہنچ کر اوما رائے نے سر پریشانی کے سکرٹری کو حکم دیا کہ جلد از جلد بولپور جانے کے
 ٹیمپ اور ٹرین میں ان کا ریزرویشن کروادے۔ وہ دیپالی سے ملنے شانتی نکیتن جا رہی تھیں۔

۳۱ دہن کی پالکی

دیپالی دیدی آداب

پرسوں یعنی جسے کے روز جہاں آرا آپا کی شادی ہو گئی۔ آپ کو معلوم کر کے ضرور تعجب ہوگا
 بیکے چپکے بات چیت چلائی جا رہی تھی تاکہ بقول شمسہ خاں کوئی باہر والا اڑنکا نہ لگائے۔ خود
 آرا آپا کو تاریخ طے کرنے سے چند روز قبل ہی اطلاع دی گئی۔ یہ شادی بھی شمسہ خاں ہی نے
 ہے۔ نواب اجمل حسین مرشدزادہ نیر بھائی کی دہن کے سگے خالو ہیں۔ دہن بھائی کی خاں
 ہوا انتقال ہو گیا۔ اولاد کوئی نہیں ہے۔ بقول شمسہ خاں جہاں آرا آپا کی عمر چھوڑ ہی تھی اور
 کم عمر کا مل نہیں رہا تھا۔ خصوصاً جبکہ جہاں آرا آپا کی صورت شکل بھی معمولی ہے۔ نواب اجمل حسین

مشرذادہ آپسے عمر میں دو گئے بڑے ہیں۔ وہ بھی دیناج پور کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ میٹرک پاس ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بقول شمسہ خاں وہ اپنے سسر نواب قمر الزماں چودھری کے توڑ کے رئیس تین موٹریں اور تین چارم تھی رکھتے ہیں۔ آپا کے لئے میروں زیور چڑھا دے میں آیا۔ شمسہ خاں اسی۔ کہہ رہی تھیں بڑا کامیاب پاس ہے تو کیا ہوا کون سا جہاں آرا کو اس کے ساتھ بیٹھ کر شیکسپیر ڈ کرنا ہے۔ لیکن امی نے مجھ سے کہا کہ بے چاری جہاں آرا کی قسمت بھوٹ گئی۔ سنا ہے اجمل حسین صاحبہ عیاش ہیں شراب بھی پیتے ہیں۔ امی نے شمسہ خاں سے ان کی عیاشی کی خبر پوچھ گچھ کی تو وہ بولیں۔ یہ ہیں بس اب چکی رہو۔ جب لڑکی والوں نے سب طرح سے اطمینان کر دیا ہے تو ہم غیر لوگ کیوں فکر میں کھلیں۔ دوسرے یہ کہ لڑکا ایک زمانہ میں ذرا رنگین مزاج ضرور تھا۔ کھلتے جا کر ریس کھیلتا تھا! اور ذرا پلانے اور گانا دانا سننے کا شوقین تھا۔ مگر غریب کیا کرتا۔ بیوی مر چکی تھی۔ اکیلا دم۔ اللہ کا دیا پیسہ بہت اٹھاتا تھا۔ مگر اب پھر سے گھر گریست میں لگ کر ٹھیک ہو جائے گا۔ جہاں آرا بڑی نیک بخت ہے اس کی اصلاح کر لے گی۔

صبح کھتی ہوں دیدی مجھے شمسہ خاں اور نیر بھائی کی دلہن دونوں پر بڑا غصہ آیا کہ انھوں نے مل کر آپا کو کہاں جھونک دیا۔ نواب صاحب اس رشتے سے قطعی خوش نہیں ہیں مگر سب گھر والوں نے مل کر ان کا بھالے لیا۔ اونی کیا لڑکی کا کوا کوڑ چننا ہے۔ جب تک وہ بیٹھی رہے گی انہم آرا، اختر آرا کے لئے بھی پیغام نہیں آسکتے۔ نواب صاحب لے پھر بھی حامی نہ بھری تو جہاں آرا کی امی پر فوراً اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا۔ (اختلاج قلب نہیں دیدی۔ اب میں بڑی ہوتی جا رہی ہوں تو دنیا کے بہت سی باتیں سمجھ میں آتی جا رہی ہیں۔ بیگم قمر الزماں کو دراصل مہتر یا کامرض ہے اور نواب صاحب چائے امن پسند آدمی ہیں بیوی کے ان دوروں سے ان کی روح فنا ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بیچا ہے۔ نے ساری عمر اپنے اس ڈیمپریٹنگ کتب خانے میں بیٹھے بیٹھے گزار دی) بہر حال تو بیگم قمر الزماں۔ الٹی میٹم دے دیا کہ لڑکی کا رشتہ اس جگہ نہ ہوا تو وہ زمین آسمان ایک کر دیں گی۔ نواب صاحب ترہ بھی ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ادرتب ان کی بیوی نے ایک ٹرپ چاں چلی۔ یہ مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوا اور بڑی سخت حیرت ہوئی۔ ایک موزیس ارجمند منزی لگی ہوئی تھی۔ جہاں آرا آپا باورچی خانے کی طرف جہ

تھیں۔ میں نیز بھائی کے بچے منور کو گود میں لے کر پیچھے والے برآمدے میں چلنے لگی اور اندر بیگم قمرانہ کمرے سے آواز آئی۔ نواب صاحب بے چارے اپنی بیوی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ میں نے آرا کو جان بوجھ کر کنوئیں میں نہیں ڈھکیلوں گا۔ تو وہ چمک کر بولیں۔ "اور کیا کرو گے؟" جتنے ہو کر وہ تمہاری ہتھیلیوں کے لہنگے بیٹے کے ساتھ بھاگ جائے؟" نواب صاحب نے تانت سے کہا۔

ذری بیگم۔ خاموش رہو۔ خاموش رہو۔ "وہ بھلا کہاں خاموش رہتیں۔ بولیں۔" معلوم بھی ہے ہنگامہ جیل سے چھوٹ گیا۔ پھر ڈھاکے کے چکر لگا رہا ہے، ابھی پرلے روز یہاں آیا تھا۔ میں سو رہی۔ وہ میرے کمرے سے باہر نکلا تو آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ جاتے ہوئے اس کی جھلک دیکھی تو گھبرا کر کی میں گئی۔ باہر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں۔ باہر تالاب کے کنارے دونوں کھسکے سپر کر رہے ہیں۔ تمہیں سنت کی خبر بھی ہے نواب صاحب۔ تم اپنی اسٹڈی میں بیٹھے پاکستان زندہ باد کرتے رہو۔ تمہیں یہ سن کر ہلکا گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ اب تم یہی چاہتے ہو کہ صاحبزادی تمہارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا کر اس کی اٹھائی گیرے کے ساتھ گھر سے نکل جائیں؟ اور فرزند کروو نہ بھی بھاگ سکے تو یہ خبر کرو تو میاں ناکے ہیں کم بدنامی کی بات ہے؟ بے چاری ختمہ بن اور اللہ رکھے نیر کی دلہن نے جوڑے توڑ کر کے ایک لگا یا ہے وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔ رو تو میاں کا قصہ اب تک چھپا ہوا تھا۔ مگر اب بات پھیل گئی تو آرا تو خیر ہیں ہی بد نصیب۔ چھوٹی دونوں کے بھار شے نہیں آئیں گے۔"

نواب صاحب چپ چاپ بیگم کی یہ تقریر سنتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے۔ "انوری بیگم۔ رو تو اگر کسی کے لئے آپہ کچے تو میں اسے اجازت دے دوں گا۔ چار برس قبل میں نے حماقت کی تھی۔ اب اجازت دوں گا۔" یہ سنتا تھا کہ انوری بیگم پر دوبارہ ساڑھ لگے۔ "میں مرنی مر جاؤں گی یہ شادی نہ ہو گی۔ اور یاد رکھو وہ اب تمہاری لڑکی سے بیاہ کرے گا بھی نہیں۔ میں اس روز کے بعد شہر بہن کے اس کے رتی رتی حالات معلوم کرنا چکی ہوں۔ وہ اس ہندو پیرسٹر کی لڑکی کے چکر میں مبتلا ہے۔ سریش کی لڑکی۔ یوں کہو کہ پیرسٹر کی لڑکی نے اسے رکھا ہوا ہے۔ تو یہ تو یہ۔ اس خاندان میں ایسا بے آدمی پیدا ہوا۔ مگر کیا کرے۔ ہے بھی نوپاٹ کوٹھنے والے دوٹکے کے کسان کی اولاد۔ اجمی وہ نواب کا بن کر بھی آئے تو میں اس دہلیز کو نہ بھلا نکلنے دوں۔ آوارہ۔ دو کوڑی کی اوقات۔ میری شہزادی کو گاہ اور اجمی تم بھی سمٹھا گئے ہو کیا۔ یا مرحومہ علیہ بیگم کی محبت نے جوش مارا ہے؟ بلواؤ تو اس کو۔"

ذرا دیکھوں کیسے شادی کرتے ہو جہاں آرا سے اس کی " اتنا کہہ کر وہ تو سوسے بہانے لگیں اور نو صاحب کرے سے باہر چلے گئے۔

جب اندر یہ باتیں ہو رہی تھیں تو انجم آرا بھی برآمدے میں آگئی تھی اور کان لگا کر والدین مکالمہ سن رہی تھی۔ جب باپ باہر چلے گئے تو وہ لمبا سانس بھر کر مجھ سے بولی۔ "اب دیکھو کیا کیا ہے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔ اللہ کرے ایسا ہو جائے۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ قصہ کیا۔ انجم کہنے لگی ابھی آپ سے کچھ ذکر نہ کرنا۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو اور آپا پھر غلط آس لگا کر بیٹھ جائیں۔ مگر دیدی بے چاری انجم کو ٹوہ لگ گئی کہ اب اب کیا کرتے ہیں۔ اور وہ اور مالادونوں جاسا پرستہ ہو گئیں۔ انہوں نے اپنی جاسوسی کے ذریعے معلوم کیا کہ نواب صاحب نے شہ خاں کو بلا کر سے پوچھا: "رو تو میاں اور اوارائے کا قصہ کیا ہے؟" شمسہ خاں ہاتھ کانوں پر رکھ کر بولیں: "مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے تو ایسے ہی اڑتی اڑتی سنی تھی۔ وہی میں نے زوری بہن کو بتلادیا۔" اب نو صاحب نے جلد از جلد اپنے روز میاں کو کونٹیکٹ کرنے کی کوشش کی۔ ان کو دہلی خط لکھا کہ فوراً آکر اوارائے کو فون کر کے پوچھا کرو تو اس وقت کہاں ہیں۔ انہوں نے کچھ گول سا جواب دیدیا۔

ادھر دیناج پور سے عقد کی تاریخ جلد طے کرنے کے تقاضے پر تقاضے آرہے تھے۔ ادھر سگیم تو کے اختتام قلب میں زیادتی ہوتی جا رہی تھی۔ جس روز نواب صاحب نے ان سے کہا کہ وہ جب تک میاں سے بات نہ کریں نکاح کی تاریخ طے نہ کریں گے۔ تو ان کی سگیم نے قیامت برپا کر دی۔ نواب نے دئی۔ بیٹی۔ کلکتہ جانے کہاں کہاں ہر ممکن پتے پر وہ نو میاں کو تار دیئے ٹرنک کال کئے مگر وہ حضرت جا کہاں غائب ہو چکے تھے۔ کوئی جواب نہ آیا۔ ادھر زوری سگیم پر اتنا زبردست دل کا دردہ پڑا کہ لینے کے د پڑ گئے۔ نواب شہ الزماں نے ہار مان لی۔ نواب اجمل حسین سے شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔

مجھے امن زمانہ میں دیدی نواب صاحب پر اتنا ترس آیا کہ کیا بتاؤں۔ ایسے ٹوٹے ہوئے اور دکھ اور غمزدہ لگتے تھے کہ دیکھنا نہ جاتا تھا۔ آپا کو مایوں بٹھایا گیا۔ ان کو بس چپ سی لگ گئی تھی۔ بڑی دھوم کی شادی ہوئی۔ روزی آپا کی اور آپ کی عدم موجودگی کا ہم سب کو افسوس تھا۔ روزی آپا کا اب کچھ پتہ نہیں چلا۔ ایک خبر ہے کہ معافی مانگ کر جیل سے نکل آئیں وہ دوسری خبر ہے کہ کالے پانی بھیج دیا گیا اور ایک خبر ہے کہ کسی انگریز سے بیاہ کر لیا۔ اور ایک خبر ہے کہ ہتھکڑیوں سمیت جیل سے فرار ہو گئیں

وں کی کوئی حد نہیں!) اس بلامنی کے زمانے میں بھی بڑی شان و شوکت کی تقریب رہی۔ نواب قمر الزماں مری کی بیٹی کا خادی تھی کوئی مذاق تھوڑا ہی تھا دیدی۔ دیناج پور سے برات آئی۔ جو دراصل سب مانی کے سسرال والے ہی تھے۔ ایک سے ایک دقیانوسی زمیندار نرائن گنج میں اسٹیمر سے اترا۔ سال ہم لوگ اسی برسات کے زمانے میں نیر بھائی کی بارات لے کر دیناج پور گئے تھے (خیر صاحب بہ بارات اور جہند منزل کے دروازے پر آئی اور دو لہا ہاتھی سے اترا تو ہم سب دھک سے رہ گئے۔ بھنگ۔ تمباکو کا پیٹھا۔ مندریاں سے رچا ہوا۔ بس شکل قصبائی زمیندار۔ نواب اجمل حسین نواب ہاں کے ہم عمر ہیں بلکہ ایک آدھ برس نواب صاحب سے بڑے ہی لگتے ہیں اور ان کے گھر کی عورتیں یہ قصبائی ان پڑھ بنگالین۔ جن کے نزدیک ڈھا کہ بھی لندن سے زیادہ آزاد ہے۔ یا اللہ۔ یہ آپا کی سرال ہے۔ اور یہ آپا کے شوہر ہیں۔ اللہ کی شان ہے۔

اب اللہ کی ایک اور شان کا قصہ بھی سنئے اور غور کیجئے کہ بڑی بوڑھیاں جو "قسمت کا کھیل" مت کا کھیل رشتی ہیں تو کچھ غلط نہیں کہتیں۔

شادی میں رخصتی کے وقت، روٹو میاں بحیثیت ہمان آن موجود ہوئے؛ نکاح ہو چکا تھا۔ نیچے اردوں کی ٹٹس مچی تھی۔ تپتے لگ رہے تھے۔ میں نے فرید پور سے آئے ہوئے کسی نوجوان رشتے دار از سنی "روٹو بھائی۔ آپ بھی کھا لیجئے۔ جلدی سے دو کیلے ہو جائیں گے۔" میں نے پلٹ کر مگر ہال میں اتنی بکھیر تھی کہ کچھ پتہ نہ چلا۔ اتنے میں انجم میرے پاس بھائی بھائی آئی۔ اور کہنے "غضب ہو گیا یا ممین۔ روٹو بھائی آپ نیچے۔ ان کو اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا ان کو یہ تار نہیں ملے؟ اور اگر مل گئے تو ان کا حواب کیوں نہ دیا۔ پہلے کیوں نہ آئے؟ اب کیوں ہیں۔ زخموں پر ہنک چھڑکنے؟" اتنے میں شور مچا۔ دو لہا آ رہا ہے۔ دو لہا آ رہا ہے۔

آپا جو بالکل بے جان سی ہو گئی تھیں۔ ان کو زینے سے اتار کر زنانہ دیوانخانے میں لایا گیا اور پر بٹھال دیا گیا۔ دو لہا میاں مسکراتے ہوئے آئے۔ آرسی مصحف ہوا۔ ساری رسمیں ادا کی۔ ہم لوگوں کا (انجم، اختر آرا اور میرا) جی جوتا چرانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً چرایا۔ اس وقت مجھے پہلی بار روٹو میاں نظر آئے جو دیوانخانے کے دروازے میں کھڑے اطمینان بر بھائی سے باتیں کر رہے تھے۔

اب دیدی اللہ کی تیسری شان سینے۔۔۔ یہ دونوں ماں آپ کے مشہور و معززت ریب۔ احمد ہیں۔ جن کو آپ بھی شاید جانتی ہوں۔ کمال ہو گیا۔ یہ آپا کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ ان کی منگنی آپ سے کیسے ٹوٹی ایک اور لمبا قصہ ہے جو مجھے انجم آرانے بعد میں بتایا یاد راگر میں اس خط میں لکھوں تو خط ہی طویل ہو جائے گا۔ زبانی بتاؤں گی۔ بہر حال تو دیوانخانے میں عورتوں کی وہ بھید جمع تھی کہ دم گھٹا ہوا تھا۔ اسی وقت میں نے آپا کے خاندان کی چند بیٹیوں کی کھسک سہ سہنے فرید پور سے آئی ہوئی ایک بڑی بولیں۔ اے ہے یہ تو اللہ بخشنے فرمک بھائی کا نواسہ ہے۔ دوسری نے کہا۔ وہ تو روپوش تھامیں نے سننا۔ تیسری بولیں۔ نکل آیا جیل سے گھوڑا۔ یو بھی خدائی خوار پھر تا ہے۔ چوتھی نے فرمایا۔ اے جنت مکانی با کا پوت۔ ہاں۔ ہاں وہی۔ اچھا ہوا جہاں آرا سے بیاہ نہ ہوا۔ بے چاری کی قسمت پھوٹ جاتی۔ خود کھاتا۔ کیا نواب کی بیٹی کو کھلاتا گھوڑا دہریہ کیونٹ۔

اب رخصتی کا وقت آیا۔ نیر بھائی نے لکھا۔ مگرہ خالی کرو۔ بھڑک کر دو۔ دلہن کے بزرگ آرہے ہیں۔ بزرگ آرہے ہیں۔ خیر بہت سا بے بزرگ آئے۔ آپا کو دعائیں دینے (ماں دیدی آپ کے بابا پٹھی ماں۔ یتوں بھائی بھی آئے تھے شادی میں) آپ کے بابا آپا کے لئے ایک بنا رسی ساری لائے تھے۔ دوسرے بزرگوں ساتھ جب وہ آئے سر پر ہاتھ رکھنے تو وہ آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر ایک منٹ کے لئے چپ سے کھڑے رہے۔ نو صاحب نے کہا۔ بیٹی تمہارے ڈاکو چچا آئے ہیں۔ نواب صاحب دراصل رخصتی کے وقت دیوانخانے کے ایک گوشے میں گم سم کھڑے تھے۔ (میں نے کسی فرد کو روتے زندگی میں پہلی بار حجبی دیکھا۔ مگر سنہ ہے کہ بیٹیو کی شادی پر سب باپ لوگ روتے ہیں) جب دیدی آپ کے بابا آپا کے قریب آئے تو نواب صاحب سے کہنے لگے۔ "ہوئے! ایک دن دیپائی بھی اسی طرح رخصت ہو جائے گی۔ تم بہت کچھ لہجہ کرنا۔ دداع کرنا۔ میں مسند کے پیچھے دل کے دریچے میں چڑھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ سارا نظارہ دیکھ رہی تھی پھر پادری ہرجی روزی کے پاپا آگے بڑھے۔ انہوں نے بھی آپا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعادی۔ اور آیتا وائف" قسم کے عنوان کی ایک مذہبی و اخلاقی پند و نصائح کی مجملہ کتاب رہن سے بندھی ان کے رکھ دی۔ پھر نواب صاحب سے کہا خدا باپ کا شکر ہے۔ آپ نے اپنی لڑکی اپنے ہاتھوں سے عزت ساتھ اپنے گھر سے رخصت کی۔ خدا کا شکر ہے۔ اور سر تھکانے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے باہر چلے گئے۔ وہ تو آگوار مچی تھی کہ کیا بتاؤں اور انجم بار بار جب موقع ملتا کچھ سے اگر کان میں کہہ جاتی۔

نی کو نہ آنا چاہئے تھا۔ ایسی بے رحمی کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کہاں کی جدلیا تھی، اگر کسیت ہے کیا آدمی بسٹ بن کر جذبات سے عاری ہو جاتا ہے؟

ردنومیاں اُوما دیہی کے ساتھ آئے تھے۔ بہانوں میں سرسپری توجس اور لیڈی رائے بھی شامل تھیں۔ ردنومیاں اُوما دیہی کے ساتھ بعد میں پہنچے۔ رخصتی کے وقت وہ دروازے میں کھڑے نیر بھائی سے یہیں رہ رہے تھے۔ نیر بھائی نے کہا: آہ۔ ردنوبھائی یہ عید کا چاند کہاں سے نکلا۔ آپ سے تو آج چار ساڑھے برس بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کہنے لگے۔ ہاں بھئی۔ ذرا ادھر خاصا مصروف رہا۔ (یہ بھی کس قدر زبردست ریاست ٹینٹ تھا!) میں ابھی کچھلے مینے ڈھاکا آیا تھا۔ تب تم لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکی۔

انجم تو اس موقعے کی تاک میں تھی کہ ان سے ٹھیکٹا کر سکے۔ وہ بچپن سے ان کی کافی ذمہ داری کر رہی تھی۔ ایک کراگے بڑھی اور لوبنی۔ ردنوبھائی آپ ڈھاکے سے کہاں گئے تھے۔ دتی؟ کہنے لگے۔ "نہیں ہی بی بی میں لے کے بجائے پارٹی کے ایک ضروری کام سے سیدھا لاہور چلا گیا تھا اور وہاں سے پشاور۔ یہ کچھلا مینہ باب اور مرحد کے دورے میں گذرا۔ پشاور میں مجھے پارٹی ہیڈ کو آرٹریز کی طرف سے حکم پہنچا کہ فلاں کا آئے پھر فوراً ڈھاکے واپس جاؤ۔ تو دوبارہ سیدھا یہاں آ رہا ہوں۔ آج صبح ہی پہنچا تو اُصا نے لایا کہ شام کو جہاں آرا کی شادی ہے۔ کیوں بھئی۔ اب تم کب شادی کر رہی ہو۔ تم لوگ تم آگے پڑھ ڈالو۔ بے چاری جہاں آرا کو ماموں جان نے کالج سے نہ جانے کیوں اٹھالیا تھا۔"

انجم مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جب وہ اس قدر سادگی سے یہ سب کہہ رہے تھے تو میرا جی چاہا کہ ہاٹیں مارا کر دوں اور پھر ان کو قتل کر ڈالوں۔ آپا ان کے دکھ میں رو رو کر زندہ درگور ہو گئیں اور یہ ان کی شادی میں کس قدر مطمئن اور بے نیاز نظر آ رہے تھے۔

ساتھ ہی اُوما کھڑی تھیں۔ دیوار سے لگی۔ اور عینک کے پیچھے سے آنکھیں چمکا چمکا کر رخصتی کا نظارہ ملاحظہ کر رہی تھیں۔

اب دواغ کا وقت قریب آتا جا رہا تھا۔ آپا کو گود میں اٹھا کر صدر دروازے تک لایا گیا۔ پھر رونا مینا چھا۔ نیر بھائی آپا کو پالکی میں بٹھانے لگے۔ اس وقت ردنومیاں بھی قریب کھڑے تھے۔ شام خار بھی اب ہی خزانہ میں چمک کر لوہیں۔ "اے ہے ردنومیاں۔ تم بھی تو بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے رخصت کرو۔" اس دلت دیدی مجھے ایسا لگا جیسے سرنخ گھڑی ہی آپا سے پیر تک لڑ کر رہ گئیں۔ چنانچہ ردنومیاں نے

اگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کہا ALL THE BEST بی بی۔ اور جلدی ہو
ہٹ گئے۔ نواب صاحب قریب کھڑے تھے۔ وہ چہرہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگے۔ دراصل اس وقت
دو زارہ قطار دروہے تھے۔ اور اسی بھر بھڑکتے میں ایک بڑی بی دوسری بڑی بی سے پولیس "اے ہے!
طرح دکھیا ملیمہ کو بھائی کی حیثیت سے تمہارا نے رخصت کیا تھا۔"

ظاہر ہے بی بی نے کہا۔ ہاں ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ میں انجم اور اختر اس شادی سے اس وقت
ڈیپریٹڈ تھے جن دنوں شادی کی تیاریاں کی جا رہی تھیں تو میں نے سوچا کہ دل خوش کرنے کے لئے کچھ تو
جائے چنانچہ سوجھی دیسی کی وہ نظم "پالنگی بردار" ہے نا۔ کالج کی چند لڑکیوں کے ساتھ مل کر میں نے اس کا
سیلے بنایا اور اسے رخصتی سے کچھ دیر پہلے ارجمند منزل کے جلسہ گھر میں پیش کیا۔ آپا کی پالنگی سامنے ہی رکھی
تھی۔ اور دیناج پور پہنچ کر بھی آپا اٹھ کر گھاٹ سے میں میل در در اپنی سسرال پالنگی میں جا میں گی۔
ہمارا سیلے دیکھنے کے لئے سات ماہانہ مرد عورتیں جلسہ گھر پر ٹوٹ پڑے۔ بہت سے اوپر جا کر روئے
میں سے جھانکنے لگے۔ جو پسند کیا گیا۔ دیدی یہ گویا میری پہلی پبلک پیش کش تھی۔ آبا بہت خفا ہوتے مگر وہ
خوش قسمتی سے جل بے گوری گئے ہوئے تھے۔ آپ کو معلوم ہے نا آبا بڑے قدامت پسند پکے مولوی ہیں۔

بھر بھڑکتے ہیں۔ دونوں بھی جلسہ گھر کی ایک دیوار سے لگے "پالنگی بردار" دیکھ رہے تھے۔ امارا
ان کے ساتھ کھڑے تھیں۔ وہ بڑے سوچ میں ڈوبے ہمارے قصے دیکھا کئے۔ جب سیلے ختم ہوا تو وہ بھر بھڑکتے
میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ بھئی تم تو کروگرافی کا خوب صلاحیت رکھتی ہو۔ شاہاش۔ کہاں سیکھ رہی
ہو۔ میں نے جواب دیا۔ کہیں بھی نہیں۔ کہنے لگے مگر یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ تم کو باقاعدہ یہ فن سیکھنا چاہئے
میں نے کہا اب ان کی اجازت نہیں۔ حالانکہ میں شانتی لکیتن جانا چاہتی تھی وہاں ہماری دیپالی دیدی بھی ہیں
دیپالی کے نام پر دیدی وہ سکرالے لگے۔ بولے اچھا تمہاری دیپالی دیدی وہاں ہیں۔ بہت
خوب۔ کوشش کر کے تم وہاں ضرور جاؤ۔ اماران کے چہرے پر ایک دم آپ کا نام سننے ہی روشنی سی آگئی۔
کیوں دیدی؟ کیا قصہ ہے؟ پھپھی رستم؟
جس وقت، دونوں بھائی بھڈے سے باتیں کر رہے تھے امارا نے بینک کے ٹول گول شیٹوں کے
پچھے سے کھڑی مجھے گھورے جا رہی تھیں۔ میں تو بھتی فوراً وہاں سے کھسک گئی۔ ارے بھئی آپ ہی
سوچئے رو تو میاں سے کچھے مطالب؟

دیدنی سرورجی دیمی کے "پانکی والوں کا گیت" کتنا دلدور ہے۔ پانکی چلے ہو ہو۔ پانکی ہو ہو۔ گیتوں کی تھاپ پر پھولوں سی جھومتی۔ ندیا کے جھاگ پر چڑیا سی ڈولتی۔ پانکی چلے ہو۔ ہنس ہنس ہم گاتے چلیں، تیز تیز، جلدی جلدی، گیتوں کی شبنم میں تارا سی پانکی، ٹاکی سو جوں پر کرنوں کی لہریں۔ یاد لہن کے آنسو۔ سچ سچ پانکی چلے۔ پانکی چلے۔ دیدنی اس گیت پر بہت ہی موثر سیلے بنا۔ خوب تالیں بجیں۔ اس کے بعد آپا کو پانکی میں بٹھلا گیا۔ ہلے چاری روٹی بکتی سسرال سدھاریں۔ جب ان کی پانکی ارجمند منزل کے پھاٹک سے باہر نکلی روزوں ان اس وقت لان پر ایک طرف کھڑے دوستوں کے ساتھ خوش گیتوں میں مصروف تھے۔ ایسوں تو بس پیسے پر رکھ کے مات۔

اچھا دیدنی بانئی بانئی فقط

یا سمین مجید
سگن گچیہ - ڈھاکہ
۲۱ اکتوبر ۱۹۴۲ء

۳۳

کھل اور اکھل

اکتوبر ۱۹۴۲ء - تیسرا پہر۔ ارجمند منزل کا پھلا برآمدہ۔ جہاں آرا، روزی، یا سمین، انجم آرا اور مترا بڑے تخت پر بیٹھی ہیں۔ جہاں آرا، روزی کے تین ماہ کے بچے کو گود میں لے کھلا رہا ہے۔ روزی، ماں آرا کے ڈھائی ماہ کے بچے کی گاڑی پر جھکی "بلے بی ٹاک" میں مشغول ہے۔ پھر وہ دونوں لڑکیوں مخاطب کر کے کہتی ہے۔ "کلنے میں بیٹے بسنت سے کہا۔ جہاں آرا کے بیٹے کا نام اس کے باپ اجمل حسین، نام کے وزن پر اکھل رکھا گیا ہے۔ میں اپنے بیٹے کا نام اکھل کے وزن پر رکھوں گی۔ بسنت ہنسے، بولے۔ سسکرت میں کسی شبد کا مخالف شبد بنانا ہو تو اس کے شروع میں ا لگا دیتے ہیں۔
نیو کیس تمہارا اکھل کھل کا مخالف نہ ہو جائے!"

جہاں آواز غزلی کے بچے کو اس کے گدیے پر لٹا کر کھتی ہے۔ ”کیوں ماسٹر کل! تم بڑے ہو کر اکمل سے لڑو گے؟“

نیر الزماں کا سوسا لڑکا منور الزماں اپنے گلاؤں کو برآمدے میں دھکیلتا پھر رہا ہے۔ تینوں کی آئیں گٹ بنائے سامنے تالاب کی بیڑھیوں پر بیٹھی پان چار ہی ہیں، روزی سانیال اپنے شوہر بچے اد کے ہمراہ چند روز قبل کلکتے سے ڈھاکے آئی ہے۔

”روزی آج اپنی ہم کاقصہ تو سنائے جب آپ کل ملی کالج پہنچیں تو کیا ہوا؟“ اختر آرا پوچھتی۔
 ”کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں کل کو لے کر ملی کالج گئی تھی۔ ماما کو کلکتے سے خط لکھ دیا تھا کہ پاپا کے ڈر کے میدھی گھر نہیں آؤں گی۔ دو ڈیڑھ روز لے بسنت کے خاندانی دوست ہیں۔ نریندر رائے نے اصرار کیا تھا ڈھاکے جاؤ تو ہمارے ہاں ہی اترنا۔ ڈھاکے پہنچ کر اسی شام دو ڈیڑھ روز سے میں ملی کالج گئی۔ ماما نے چار صبح سے راہ دیکھ رہی تھیں۔ سارا مشن کمپاؤنڈ بھاٹک پر جمع تھا۔ میں کل کو لے کر لیڈی رائے کی کار سے آ بسنت بابو ساتھ گئے تھے؟“ یاسمین بھید نے پوچھا۔

”نہیں۔ ماما تو روتی ہوئی آکر لیٹ گئیں۔ سیدھی نے پھولوں سے سارا گھر سجا یا تھا۔ ڈاکہ انتظام کیا تھا۔ میں اندر گئی تو پولیس تمہارے پاپا اپنے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ چلی جاؤ کچھ نہیں کہیں گے میں سمجھی سمجھی اندر گئی۔ پاپا کھڑکی میں کھڑے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ماما نے کہا ’پال۔‘“

”وہ کچھ نہ بولے۔ معلوم تھا میں دبیلز پر کھڑی ہوں۔ ماما نے پھر کہا۔ پال! خدا باپ کے ناشکر۔ نہ تو۔ ایک سال ہوا تمہاری لڑکی اس طوفانی رات موت کے منہ میں جانے کے لئے گھر سے نکل گئی۔ خاں نے اپنے اسے زندہ سلامت رکھا۔ اسے برکت دو۔ دیکھو اس کے ساتھ ایک ننھا فرشتہ تمہارے گھر ہمارا آیا ہے۔ (گلو اولٹا ماما۔) میں نے دل میں کہا، عزیزیکہ پاپا شاید کیو CUE کے انتظار میں کھڑے تھے ذرا چہرہ سخت کر کے میری طرف مڑے۔ بینک ماتھے پر سر کائی۔ ذرا جھجک کر آگے بڑھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ کسل اپنی غوغاں کرنے لگا۔ پاپا بولے، خدا باپ لمبی عمر کرے۔ اور پڑھ کر مٹک لےجے میں کچھ نہ پوچھا۔ کیا نام رکھا ہے؟ کل میں نے جواب دیا۔“

”بسنت بابو کے لئے کچھ نہ پوچھا؟“ جہاں آرا نے دریافت کیا۔

”نہیں۔“

” چلو۔ خیر کچھ تو برت بگھلی۔“ اختر آرا بولی

” بالکل بگھل گئی۔ کچھ دیر بعد پاپانے کمن کو گود میں لیا۔ اس سے لاڈ پیار کرنے لگے۔ اس نے لے
نا کا سوٹ بھی خراب کر دیا۔ مگر پھر وہ اسے اپنے سے الٹا ہی نہ کریں۔ جب میں چلنے لگی پوچھا کہاں
نا ہو؟ میں نے کہا میں دو ڈیٹنڈ میں ٹھہری ہوں۔ کہنے لگے کیوں؟ کیا یہ گھر تمہارا نہیں ہے؟
نہ کہا۔ کل آجاؤں گی۔ چنانچہ دوسرے روز جو میں گئی تو وہ جیسے کمن کے انتظار میں باہر ہی نہیں رہے تھے۔
یکھ کر کھل لٹھے۔ ماننے چپکے سے پوچھا۔ بسنت بابو کو نہ لیتی آئیں؟ میں نے جواب دیا۔ کل لاؤں گی آپ
سہ ہموار کر رکھئے۔“

” پھر لے کر گئیں بسنت بابو کو؟“ یاسمین نے دریافت کیا۔

” نہیں۔ کل تو نہیں جاسکی۔ پرسوں پرسوں کسی روز لے جاؤں گی۔“

” اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو روزی آیا؟ میں تمہاری جگہ ہوں تو فوراً لے جاؤں۔“ یاسمین نے اپنی سابق
نی سے کہا۔

روزی چپ ہو گئی۔ اتنے میں ماسٹر اکل حسین مرشد زادہ نے زور زور سے دعنا شروع کر دیا۔ ہانپوں
اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جہاں آرا نے روزی سے کہا۔ ” بسنت بابو کو آج ہی لینی کا سچ لے جاؤ۔“

” کل شام تو ہم لوگ سر پرری توش سے باتوں میں لگ گئے تھے۔ میرے سسر بسنت کو دئی بھیجنے
رہیں ہیں کہ وہ دہاں رہ کر قانون کی پریکٹس شروع کریں۔ نئی دئی میں ان کی کوٹھی بھی ہے۔ اس کے کرائے
جانے کا انتظار ہے۔ اسی سلسلے میں مزدوری باتیں ہونے لگیں۔ اور آج شام کو سر پرری توش اور لیٹی
نے ہم دونوں کے اعزاز میں ڈنر کیا ہے۔ اس لئے آج بھی نہ جاسکیں گے۔“

” سر پرری توش اور ان کے ڈنر کی وجہ سے روزی تم اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئیں۔“ جہاں آرا نے کہا۔
” جہاں آرا۔“ روزی نے آہستہ سے ذرا کوفت کے ساتھ جواب دیا۔ ” اب میں بسنت کو وہ پھینچ
دکھانا نہیں چاہتی۔“

’ جہاں آرا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ “ روزی۔ تم کو اب اپنے گھر سے شرم آتی ہے اپنے
لو اپنے posh شوہر سے ملاتے بھی شرم آتی ہے۔ تم جھینپتی ہو کہ پادری ہنرچی کی لڑکی ہو۔“

اسی وقت سلیم تمسرا الزماں اپنے کمرے سے نکلیں۔ ڈھکے کی سرخ پاڑ والی سفید ساری بنگالی طرز سے باندھے، بیدنازک اندام آکر تخت کے کنارے پر ٹنگ گئیں۔ مکمل کو گودس لے کر قریب آئی مالا کو ابروئے اشارہ کیا۔ وہ اندر سے صندوق نکال کر لائی۔ سلیم صاحب نے صندوق کھول کر دو سو ایک روپے کے نوٹ نکالے اور مکمل کے گدیے کے نیچے چپکے سے سرکا دیئے۔

”اور سناؤ روزی۔ ماں باپ سے صلح صفائی ہوگئی؟“ انہوں نے دریافت کیا۔

”جی ہاں۔“

”اچھا ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔“ لڑکیوں سے چند منٹ باتیں کرنے کے بعد سلیم قمر الزماں اندر واپس چلی گئیں۔

روزی نے قیمتی جا رحبت کی ساری پہن رکھی تھی اور نوٹنگے کا پورا سیٹ۔ مالا نزدیک آکر بڑے اشتیاق سے اس کے گپنے چھو چھو کر دیکھنے لگی۔ ارجمند منزل کی خواصوں کے لئے بے چارے عزیز پادری صاحب کی بیٹیا کی بڑے گھرانے میں شادی نہایت اہم واقعہ تھی خواصوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ پادری صاحب سے شادی سے پہلے روزی کی ماں گری بالا ارجمند منزل میں ماگیری کر چکی تھیں۔ ان سب کو وہ قصہ معلوم تھا۔ کس طرح ایک عزیز برہمن بال و دھوا سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے فرید پور کے ایک گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا نواب قمر الزماں چودھری کی پناہ میں ارجمند منزل پہنچی تھی۔ یہاں برتن مانگنے کے کام پر لگادی گئی تھی۔ کس طرح نواب صاحب نے اسے اپنے نو عمر بیٹیوں کی عنایات سے بچانے کے لئے انگریز لاٹ پادری کی میم کے حوالے کر دیا تھا۔ جس نے اسے عیسائی کر کے اس کی شادی نوجوان کا لے پادری ہنری سے کر دی تھی۔ روزی کو بھی ہنری کی ان تلخ حقائق کا شدت سے احساس تھا۔

مازہ مالا مصاحب خاص کی حیثیت رکھتی تھی اور صاحبزادیوں کی گپ شپ میں حصہ لیتی تھی اس لئے روزی سے پوچھا۔ ”یہ سب سسرال سے ملا ہے بی بی؟“

”ہاں۔ مالا“

”کیا کیا ملا؟“

”ایک سیٹ ہیرے کا۔ سات جڑوا اور سادے۔ یہ والا سیٹ ہماری شادی کی پہلی سالگرہ پر مکمل

کے ڈیڈی نے دیا ہے۔“

”اللہ مبارک کرے۔“

(مسنز ایسٹہرگری بالابنرجی نے اپنے گلے کی باریک طلائی زنجیر جس میں منی سی صلیب آویزاں اور کانوں کے مختصر سے بھول اور چار باریک چوڑیاں اتار کر اس کے لئے رکھ لی تھیں۔ جب زینشن کے مسٹر لوٹھر بسواس سے اس کا رشتہ طے ہوا تھا۔ اور پچھلے سال جب روزی نے گلے سے اپنی شادی کی اطلاع بھیجی تو مسنز بنرجی نے گھر کے خرچ میں سے تھوڑے تھوڑے پیسے بچا کر اپنے بے ہونے اچار مرتبے میں لپوش اور سوئٹرز بیچ بیچ کر روپیہ جمع کیا اور ساری عمر کی گرتی میں جو چند پیسے انہوں نے پس انداز کئے تھے ان کو اس رقم میں ملا کر ڈھاکر کا مخصوص کھوکھلے سونے کا ایک لٹخمرید پائیں۔ اور تین ریشمی ساریاں۔ ان کی اپنی شادی میں ان کے انگریز مرنی رائٹ ریورنڈ ولفرڈ نے اور مسنز براؤن نے چاندی کا ٹی سیٹ دیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی روزی کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ یہ چیزیں جب روزی پہلے روز لئی کالج گئی تو انہوں نے ایک سوٹ کیس میں رکھ کر اسے دیں۔ روزی

ال نے آج ارجمند منزل میں اپنی بلند مرتبہ ہسیلوں سے اور آلے سے اس کم مایہ چیز کا ذکر کیا۔
ارجمند منزل کی ایک باندی چاؤ کی کشتی لے کر حاضر ہوئی۔ جہاں آرار نے اگلے کو اختر آرائی گود اور چاء بنانے میں مصروف ہو گئی۔

نواب قمر الزماں جو دھری باہر تشریف لائے۔ پانچوں لڑکیاں تعظیماً کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے اسے بات کی۔ اس کے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”کیا نام رکھا ہے؟“

”گل کمار سانیاں۔“

”اگلے کے وزن پر۔“ اختر آرانے خوشی سے کہا اور سب کمار سانیاں کی کہی ہوئی بات دہرائی لفظ میں اُلجھ کی اصافت اس لفظ کا الٹ نظر کرتی ہے۔

”کیوں بے؟ میرے اگلے سے لڑے گا؟ کان کھینچوں گا؟ نواب صاحب نے خوشدلی سے کہا۔“

”جی نہیں نواب صاحب۔!“ روزی نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ”اگلے گلے کا مخالف۔“

وہ اس سے۔ میرے گلے سے لڑے گا۔“

”دونوں کے کان کھینچوں گا۔ بد معاش کہیں کے۔!“ پھر نواب صاحب ہنستے ہوئے برآمد سے

نیچے اتر گئے۔ اور پائس باغ کی روشنیوں پر چہل قدمی کرنے لگے۔ کچھ در قبل نیر الزماں کی دہن ایک سوا یکہ نوٹ مکمل کے گردنے کے نیچے سر کا گئی تھیں۔ جہاں آرا نے چاندی کے ٹھکے سے پتھر توڑا، نقرئی جھنجھوڑ میں قیمت انگریزی کھڑکیوں اور کپڑوں سے بھرا سوٹ کس مع ایک سوا یکہ روپے کے دیا تھا۔ سوٹ کا تخت کے نزدیک رکھا تھا۔

”پوٹروں کا ریس!“ روزی نے چار پیسے ہوئے شگفتگی سے کہا: ”دیکھو ہر طرف توتوتو کے نورا بھرے پڑے ہیں۔“

روزی کے اس جملے سے تینوں نوابزادیاں اور یاسمین جھینپ گئیں۔ روزی بطور مسز سائیا اپنی نئی دو لمند حیثیت سے بید سر رہتی۔ یاسمین کو بہت مایوسی ہوئی۔ شاید روزی آپا تھوڑی سی بددعا بھی ہو گئی ہیں۔ وہی روزی جو آج سے صرف سال بھر قبل سر رکھن باندھ کر میدان کارزار میں کود پڑی تھی پوئیس کی لاکھیاں کھائی تھیں۔ جیل میں معافی مانگنے سے انکار کیا تھا۔ دولت، مرتبہ اور آسائش انسان اتنی جلدی کا پالٹ دیتے ہیں، اب یہ کس مرتبہ انداز میں مجھ سے بائیں کر رہی ہیں کیونکہ میں محض ایک عزیز و اقارب کی لڑکی ہوں۔ یہ بھی بھول گئیں کہ سال بھر قبل تک پندرہ روپے ماہوار پر مجھے ٹیوشن دیا رہا ہے۔ یاسمین نے سوچا۔

عین اسی لمحے روزی نے اسے مخاطب کیا: ”ارے یاسمین اب تم بھی مجھ پر شادی کر ڈالو دیپالی کو بھی چاہئے بیاہ کر لے۔ اور نکلے اپنے اس ڈیمپر سنگ جنڈر کنج سے۔“
”وہ دیپالی دیدی کا گھر ہے روزی آپا۔ اور وہ ان کے لئے شاید بالکل ڈیمپر سنگ نہیں ہے۔“
یاسمین نے نرمی سے جواب دیا۔

”نون سنس شادی سے پہلے ماں باپ کا گھر لڑکی کے لئے قید خانہ ہوتا ہے۔ آزادی تو شادی کے بعد ملتی ہے۔ خود مختاری کی زندگی۔ کیوں جہاں آرا؟“
جہاں آرا مسکرا کر خاموش رہی۔

روزی نمائش پسند، چمپوری اور بددماغ ہونے کے علاوہ ذرا سببے و قوت بھی ہو گئی ہے۔ جہاں آرا نے افسوس کے ساتھ سوچا۔ اور اسے ایک نہایت کمینہ خیال آیا۔۔۔ آخر بے تو ہماری پرانی نوکرانی کی اولاد۔۔۔ دوسرے لمحے اسے اپنے اس خیال پر ندامت ہوئی۔ اس نے جلدی سے کہا۔

رے دیپالی کا بیاہ ہو گا تو دیکھنا میں کسی دھوم دھام کروں گی۔ اس کے بابا تو کچھ کرنے سے رہے۔ سادھو
ی ٹھہرے۔ میں دو مہینے پہلے سے دیناج پور سے آ جاؤں گی۔ سارا انتظام خود کروں گی۔ مگر وہ روزی کی طرح
پا کر کسی سے بیاہ نہ کرے۔ سول میرج۔“

”آپا تم اپنے ہاتھی بھی لیتی آنا۔ دیناج پور سے“ انجم آرا نے لقمہ دیا۔

”ضرور۔ ہاتھی گھوڑے پانچ سب لاؤں گی۔ مگر دیپالی کوئی مرغاضھوٹے تو سہی جیسے روزی نے
ھوٹل یا۔“

”دیپالی ہے کہاں؟ تم سسرال سے آئی ہوئی ہو۔ کیا تم سے ملنے سے نہیں آنا چاہئے تھا؟“ روزکا
نے ذرا بلند سی سے ترش لہجے میں کہا۔

”آپا کے ڈھاکے آنے سے پہلے ہی دیپالی دی ریڈیو پروگرام کے لئے دلی بلائی گئیں۔ آج کل یہ خبر کم
ہے کہ اومارے ڈاکٹر سرکار سے بیاہ کرنے والی ہیں۔ شاید دیپالی دی کو یہ بات پسند نہ ہو۔ اور اسی وجہ
سے وہ زیادہ سے زیادہ گھر سے دور رہتی ہوں۔“ اختر آرا نے کہا۔

”ڈاکٹر سرکار سے۔؟ اومارے۔؟ میں نے تو ووڈ لینڈز میں کوئی تذکرہ نہیں سنا۔“ روزکا
نے حیرت سے کہا۔

”کیوں۔؟ اومارے جیسی ہیں ویسی ہیں۔ ڈاکٹر سرکار نے انہیں قبول کر لیا تو اومارے کی خوش قسمتی
ہوگی۔ مگر دنیا یہی سمجھے گی کہ ڈاکٹر سرکار نے اومارے کی دولت سے شادی کی ہے۔ جہاں آرا نے جو ابدیہ
انجم آرا راتھ کر اندر گئی اور ایک قیمتی ولایتی کھلونا لاکر کمل کے قریب رکھ دیا۔

”ہائے تم لوگوں نے کتنی پیاری پیاری چیزیں کس کو دی ہیں۔“ روزی نے تینوں نوابزادیوں کو مخاطب
کر کے کہا۔

”ڈونٹ بی سلی۔“ جہاں آرا بولی۔

تخت کے کنارے بیٹھی ہوئی یا سمین نے سوچا۔ میرا تحفہ ان سب تحائف کے مقابلے میں حقیر اور
کم قیمت ہے۔ مگر میں نے کتنے پیار سے بچے کے یہ دو فریک سی کر انہیں دیئے ہیں۔ انھوں نے میرے پرنٹ
کا ذکر تک نہیں کیا۔ اب وہ دوستی کو تحائف کی قیمت سے ماپا کریں گی؟

”یڈی ارجنارائے نے تو بس ایک چیک دیدیا ہے۔“ روزی نے پروائی کے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

مگر کل کے نام جمع کروالوں۔ ویسے تو اس کے ٹھا کر دادا نے اس کے پیدا ہوتے ہی بنک میں اس کا اکاؤ
کھول دیا ہے۔

بے چاری روزی نئی نئی دولت پا کر بوکھلا گئی ہے۔ چاروں رطکیوں نے سوچا۔

برآمدے سے موٹر آن لگی۔ اور نواب اجمل حسین مرشدزادہ جوڑی دار پانچامہ، سیاہ خیروا
ترکی ٹوپی نیچے اترے۔ برآمدے میں آکر وہ تخت کے قریب ذرا سا ٹھٹھکے۔ جہاں آرا نے روزی سے ان کا
کرایا راہنوں نے ذرا گھبرا کر آداب عرض۔ آداب عرض۔ مزاج شریف۔؟ کہا اور زینے کی سمت چلے
۔ پان چباتے، بھدے، جھٹی نا، بد ہیئت، میٹرک فیل جاگیر دار جہاں آرا کے خدائے مجازی
روزی سوچ رہی تھی۔ اسرار خداوندی! میں جہاں آرا کو کتنا خوش قسمت سمجھا کرتی تھی اور خود کو کتنا
بد نصیب۔ مجھے لذت کما رسا نیاں جیسا دکش اور اسماٹ شوہر ملا۔ جہاں آرا بے چاری کی تقدیر میں
نواب اجمل حسین کھٹے تھے۔ اسرار ربانی!

نواب قمر الزماں پائیں باغ میں ہوا خوری کر کے برآمدے کی طرف آ رہے تھے۔

”ارے بھی بیگم۔ ذرا یہاں آئیے گا۔ میری سفید شیروانی کہاں ہے۔“ اوپر زینے پر آکر نواب

اجمل حسین نے آواز دی۔

”جی ابھی آئی۔“

”اور تازہ پان۔“

”جی۔ آتی ہوں۔“ جہاں آرا نے فوراً اکمل کو تخت پر لٹایا۔ اور چپٹی پیروں میں ڈال کر

بسرعت زینے کی طرف بھاگی۔

نواب قمر الزماں اس وقت برآمدے میں پہنچ کر گیسٹری کی جانب جا رہے تھے۔ انہوں نے

کرب کے ساتھ جہاں آرا پر نظر ڈالی۔ بے زبان ٹیچر جو دھری کی بے زبان جتتی! اسی کی طرح جی ونا! ملیجکی

کی شادی ایک غریب کسان، مولوی کے ساتھ کر دی گئی تھی۔ وہ اس سے نباہ لے گئی۔ لیکن یہ کالج کی تعلیم یافتہ

لڑکی بھی اس زبردستی کے بے نگر رشتے کو کس صلے سے نباہ رہی ہے۔ میں تجھ سے شرمندہ ہوں جتی! اور اپنی

مجبوریوں سے شرمندہ ہوں۔ میں تو ساری عمر ملیمہ سے بھی نامدم رہا تھا۔ مگر میری ندامت سے ملیمہ کے لئے کیا

فرق پڑا؟ میری شرمندگی یا اپنا پیمانے سے تیرے لئے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو مرتے دم تک اپنے اس نامعلوم

مجازی کی اسی طرح خدمت کرتی رہے گی۔ میری بچی۔ میری بے چاری بچی۔ کاش۔ کاش میں بان سے تیرا یہاں کر دیا ہوتا۔ شاید میں لہجہ کی نوع کے سامنے بھی سرخرو ہو سکتا۔ کاش۔ کاش۔ آہستہ گیلری میں سے گزرتے اپنی جائے پناہ۔ اپنے تئیں خلع کی طرف چلے گئے۔

دو ڈیٹرز سے مٹریسٹ لکار سانیال کا فون آیا۔ تھوڑی دیر میں مٹریسٹ لکار کے لئے کار بیج آئے گی۔ نیرازیاں نے برآمدے میں آکر روڑی سے کہا۔

روڑی کی آیا تالاب کی مٹی پر سے اٹھ کر آئی اور گل کا سامان اور تحائف پیک کرنے میں مصروف ہو گئی اور گل دو دنوں برابر گلوں پر پڑے بے خبر سو رہے تھے۔ ڈھائی تین ماہ کی دو مختصر کمزور، نازک، سی جانیسی۔ سوز و غم بھرا تھا۔ تالاب کا پانی گلنار ہو گیا۔ گل باب خاص کے نیچے رکھے دو کرم اڑتے لہاس کی رنگین موتیاں کرنوں میں جھلا اٹھیں۔

جھٹ پٹے کا وقت کروں کے اندر بہت ڈیر پر لنگ ہو سکتا ہے۔ نواب قمران گلنار کے اپنے گلنار سے پہلو کے باغ میں اتر گئے اور شیتے ہوئے تالاب کے کنارے آکر راج سٹھاسن پر جھک گئے۔

برآمدے میں تخت پر لیجے دو لوں بچے سوتے ہیں گلنار کے۔

سنہ ہے جب ننھے بچے کوئی پیارا سا خواب دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ پامیں نے مسکرا کر بچوں پر ہلی۔ اسی لمحے اس نے دل ہی دل میں روڑی کے نئے کپڑے پہن اور نودولتے پن کو معاف کر دیا اور اپنی فطری لب سے اسے مخاطب کیا۔ روڑی آیا۔ آپ نے یہ نام خوب سوچا۔ گلنار برقعہ اگلے۔ اور دونوں بچے۔ ایک سن کی بیدارگی۔ دو نئے ہندوستانی!

”انسان۔ جدید ترین موڈل۔ روڑی نے کہا۔“

دونوں لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

”روڑی آیا۔ سروجنی دیسی کی ایک نظم ہے۔“ فنکار یا سمیں گلنار اور گلنار کو دیکھتے ہوئے

ہتہ بولی۔

”سو جاؤ میرے بچو۔“

صبح تک کے لئے محفوظ و مامون

سوئے رہو۔

کہ ہمارا رت جگا بہت طویل ہے۔
جتنی دیر تم سوؤ۔ ہم۔ ہم کھتی بوئیں گے
ہم آرزوں، اور رنجوں اور آنسوؤں سے بھر پور سینے بولتے ہیں۔
تا کہ جب تم جاگو تو ان کی فصل کاٹ سکو
بچو۔

صبح ہوتی ہے۔ رات گزر گئی۔
ہماری مشقت ختم ہوئی۔ ہماری کھیتیاں لہلہا رہی ہیں
ہم اسے ہاتھ کزور تھے

لیکن اندھیالے میں ہم نے تمہاری آنے والی شان و شوکت کے خواب دیکھے۔
تمہارے بچوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچا۔ ہمارا رت جگا ختم ہوا۔
جاگو بچو

ہم نے سینوں کی جو فصل تمہارے لئے بولی ہے
اس کے صلے میں
ہماری محنتوں کے ثمر کو
تم تو صیغ سے یاد کرو گے
یاد رکھو؟

ہیں ملزم ٹھہراؤ گے۔ یا ہمیں معاف کر دو گے۔

یا ہمیں مجید نے سراٹھایا۔ نواب قمر الزماں برآمدے میں آپکے تھے اور تخت کے قریب کھڑے
ہے تھے۔ انہوں نے یا ہمیں کے سر پر ہاتھ رکھا اور چپ چاپ خواہیں اندر چلے گئے۔
بن بارغ کے درخت شام کی سنہری ہوا میں لویاں گنگنا رہے تھے۔
مل اور اکمل بے خبر سوئے۔

برڈز آف پیراڈائیز

”اگر تمہارا وہ خط مجھے صرف ایک دن پہلے مل گیا ہوتا تو شاید ہم لوگ آج یہاں نہ ہوتے۔“
نے کہا۔

ہسپانوی لباس پہنے مسٹریس مسرتوتی نے کیلے کے جھنڈ میں سے نکل کر قہوے کی کشتی میز پر سے دیکھ رہی تھی۔ پہاڑی کے نیچے اسپینش کولونیل وضع کے بنگلے میں سے کلیپسو موٹرک زانے لگی۔ ”شو نو کی گرل فرینڈ سان فرینڈو سے آئی ہوئی ہے۔“ دیپالی نے کہا۔ پانی کی بند ٹیپ سے میز پر آن گری۔ یاسمین نے اوپر دیکھا۔ بادل کریمین پر سے سرکتے ٹیلے کی سمت آ رہے بڑے پتوں اور موٹے تنے والے رین ٹری کے جھرمٹ میں شفاف نار پیہ سما تھا۔ سر پر سرخ بندھن مانا باندھے اسکرٹ میں بلبوس ایک ایسٹ انڈین عورت نالے کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔ ایک درخت پر بنے ٹری ٹاپ ہاؤس پر بورڈ لگا تھا۔ ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار۔ پلانٹیشن میڈیکل ڈسپنسری۔ اس درخت کے نیچے بھی پرند فردوس اڑتے پھر رہے تھے۔ چند مریض جمع تھے۔ چینی ایسٹ نیگرو۔ اپنی اپنی جنتوں سے نکالے ہوئے انسان۔ آدمی کی عادت ہے اسے اس کی جنت سے نکالو تو وہ اپنے ہی جہلی ایک اور جنت بنا لیتا ہے۔

”دیدہ کیا ہوا تھا۔؟“ یاسمین نے کمزور آواز میں پوچھا۔

”ماسٹر کا فون۔“ مسٹریس مسرتوتی نے بنگلے کے برآمدے سے آواز دی۔ دیپالی نے کہا: ”ابھی آئی۔“
”تھکر بنگلے کی سمت چلی گئی۔ مسٹریس مسرتوتی باہر آ کر کرسی پر بیٹھیں۔ اور بولیں: ”ہمارا میم صاحب کہتے ہیں ڈانس رہے۔ پاکستان سے آیا ہے۔“ ہاں مسٹریس مسرتوتی۔ ہم تمہارا میم صاحب کو بہت زمانے سے لے ہے۔“ یاسمین نے بنگلے اردو میں جواب دیا۔ ”ہم اور دیپالی میم صاحب ایک ہی کنٹری کار چنے والا۔“
مطلب۔ پہلے ایک ہی کنٹری تھا۔“

”تم سینا میں بھی ناپوتا ہے؟۔ جیسے مس نکو۔ مسٹرئیں مسرتی نے کھڑے ہو کر دو تین چک لیں۔ یاسین کھلکھا کر ہنس پڑی۔

سرخ بندانا والی عودت اسکرٹ گھاتی کپڑوں کی ٹوکری مکر پر رکھے تلے کی طرف سے آئی۔ گا مبرلا کے قریب پہنچ کر اس ٹوکری گھاس پر رکھی اور مسٹرئیں مسرتی کے ساتھ ناچنے لگی۔ اب وہ دو سیاہی رقص کر رہی تھیں۔ سمرت ماہم کے کسی قبل از جنگ استوائی سیٹنگ کے ناول کا سین۔ یا نے آنکھیں ملیں۔

سرخ بندانا والی عودت نے گلے میں پختن پاک کا بڑا سا تعویذ پہن رکھا تھا۔ وہ مسٹرئیں مسرتی زیادہ خوبصورتی سے ناچ رہی تھی۔ دیپالی بنگلے سے واپس آئی۔ کرسی پر بیٹھ کر چاء بنانے لگی۔ کتنی بے فکری کی زندگی ہے یہاں یاسین نے سوچا۔ ”یہ لڑکی بہت اچھی ڈانسر ہو سکتی ہے۔ کون یاسین نے پوچھا۔

”مسٹرئیں خیرالنسا؟ باہا کے کپاؤنڈر شرافت علی کی بیوی۔“ دیپالی نے جواب دیا۔
”مسٹرئیں خیرالنسا نے عصمت سے پوچھا۔“ آپ پاکستان سے آیا ہے؟“
”ہاں۔“ یاسین نے جواب دیا۔

”آپ نے نورجہاں کو دیکھا ہے؟“
”کون نورجہاں؟“

”میرے لئے جہاں میں چین ہے نہ کہ اسے۔“ مسٹرئیں خیرالنسا نے گا کر جواب دیا۔ ”خاندان مووی ولا۔ ہم نے سب موڈریز دیکھی ہیں۔ کنگن۔ برتھن۔ گاجی صلاح الدین۔ سکندر۔ جندگی ہے پیا سے پیار میں بتلئے جا۔ عک کے مجھ میں اپنا سر جھکائے جا۔“
”مگر یہ تو بہت پرانی فلمیں ہیں۔“ یاسین نے کہا۔

”بس وہی یہاں چلتا ہے۔ اور دوسری فلم دیکھا۔ انداز اور برسات۔“ مسٹرئیں مسرتی نے جواب دیا۔

”ہم لوگ سس صاحب یہ موڈریز دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہے۔ ہمیں پتہ چلا ہے ہارا ادا لڈ کنڑی ایسا ہی ہوگا۔“ مسٹرئیں خیرالنسا نے اداس آواز میں کہا۔

دیپالی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”فرگٹ اٹ۔ دیدی۔“ یاسین نے کہا۔

”تم بہت خوش ہو۔ تم دنیا کے TOP پر ہو۔ ورلڈ ٹور پر نکلی ہو۔ اپنے ملک کی مشہور ٹرانز ڈھاکہ اب بھی تمہارا وطن ہے۔“ دیپالی نے ذرا ترشی سے جواب دیا۔

”سوری دیپالی دی۔“ یاسین نے کہا۔ واقعی میں بہت مسرور ہوں۔ ساری دنیا اب میرے ہوں میں ہے۔ کامیاب کریئر۔ اِن گنت مداح۔ گلیمز۔ سلیٹی۔ شہرت۔ ان بے چاری دیپالی دیدی کو اٹا۔ ہ اور جہاں آرا آیا کو۔ ہ محض یا یوسی۔ لیکن مجھے روزی سانیال کی طرح اپنی کامیابی پر زور نہیں ہونا چاہیے۔ گو میں نے اپنی کامیابی کی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنے ابا کو ڈیٹا غانی کیا۔ مگر ٹسٹ کی لگن۔ اس نے باواز بلند اضا فو کیا۔

”بوش۔“ دیپالی بولی پھر اچانک چپ ہو گئی۔

شاید یہ مجھ سے جھٹنے لگی ہیں۔ انہیں اب کون جانتا ہے۔ مجھے ساری دنیا جاننے لگی ہے۔ جیرلز ہتکے اگر کوشش کی جائے تو میں اپنے ”موڈرن اور ٹیل بیسے“ کا نیویارک میں باقاعدہ اسٹوڈیو قائم کر سکتی ہوں۔ مگر ابھی یہ بات ان کو نہیں بتاؤں گی اور حل جائی گی۔ کیا پتہ لا شعوری طور پر متعصب بھی ہوں۔ میرا حال ایسٹ پاکستان سے ان کو نکلنا ہی پڑا۔ نہیں۔ پرانی مارکسیسٹ میں متعصب تو شاید نہیں ہیں۔ اتنی پرانی دوست ہیں۔ اگر ان کو یہ بتا دوں کہ ہینڈ سم، مشہور انگریز فیشن ڈیزائنر جیرلز بلونٹ سے شادی کرنے والی ہوں تو شاید اور حمد کریں۔ نہیں بتاؤں گی۔ نظر لگ جائے گی۔ پری نادر جیرلز ایک طرف۔ بے مثال یونانی مجسمہ۔ اور ایک طرف ان بے چاری کے موٹے کالے لبت موہن ہیں۔ وہ تو جہاں آرا آیا کے میاں سے بھی گئے گدر سے ہیں۔

سرسوتی اور خیر النساء گھاس پر مٹھی ایک اجنبی زبان میں گفتگو کر رہی تھیں۔ شو نو نے بنگلے کے برآمد میں اگر آوازی۔ ”دیدی۔ آپ کا فون۔“ دیپالی پھر اٹھی اور عمارت کی طرف چلی گئی۔

سرسوتی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”مس صاحب ہمارا ایم صاحب رو کیوں رہا تھا؟ ہم نے دیکھا ہے۔ وہ کبھی کبھی ایسے ہی مٹھے بٹھلے روئے لگتا ہے۔“

”معلوم نہیں۔ سرسوتی۔ شاید۔ شاید ان کو اپنا کنٹری یاد آتا ہے۔ اور۔ اور۔“

”اور کون —؟“

یاسمین نے جلدی سے بات بنائی۔ ”وہ — مٹرلس سرسوتی ادھر ڈھاکہ میں دیدی کا ایک فرینڈ تھا۔ جہاں آنا بیگم —“

”جہاں آرا بیگم —!“ مٹرلس خیرالنساء نے خوشی سے دہرایا۔ ”بادشاہ کا بیٹی؟“

”نہیں۔ ایک معمولی سے نواب کا بیٹی۔“

”پھر کیا ہوا — کیا ہوا؟“ دونوں عورتوں نے بے صبری سے پوچھا۔

”جہاں آرا بیگم کا نو اسٹوری بہت ٹریک تھا۔ اسی کو یاد کر کے تمہارا سیم صاحب دکھی ہو

جاتا ہوگا۔“

”کیا ہوا؟ — کیا ہوا؟ — عا سکی معسومی —؟“ سرسوتی نے پوچھا

خیرالنساء نے سوال کیا۔ ”عسک مجاہدی تھا یا عسک حلیکی —؟ ہیرد کون تھا۔؟“

یہ عورتیں بے حد سینا دکھتی تھیں۔

”خیرالنساء شاید عسک مجاہدی اور حلیکی دونوں تھا۔ جہاں آرا آیا اپنے کزن کو لو کرتا تھا وہ

اُس کو۔“

”سمجھ گیا۔“ مٹرلس سرسوتی نے طمانیت سے کہا۔

”پھر اُن کا کزن اُن کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔“

”کیوں —؟ پچ پچ۔ ہائے ہائے۔ ہائے رے۔“

”آئیڈیا لوجی کی خاطر۔“

”آئیڈیا لوجی — کیا —؟“ خیرالنساء لے دریا فت کیا۔

”مطلب — مطلب — ایسا کہ۔ عزیز امیر صب برابر ہونا چاہئے۔ ہیرد امیر لوگ

کو HATE کرتا تھا۔ ہیرد بہت امیر تھا۔ اُس زمانے میں خیرالنساء۔ لڑکا لڑکی آئیڈیا لوجی کی

خاطر ایک دوسرے کو چھوڑ دیتا تھا۔“

”تب تو وہ پاگل لوگ تھا۔“ سرسوتی نے کہا۔

”ہاں۔ ایک دم پاگل۔ اور اگر سوچو تو — تو ہم بھی پاگل ہے۔ ہم نے آئیڈیا لوجی کی خاطر

ن سیکھا۔ کہ ہمارا دشمن میں کلچر خوب پھلے پھولے۔ ہم نے اس کے لئے بہت محنت کیا۔ بہت کوشش
ہمارا ایک انکل کا دوست سنٹرل منسٹر۔ تھا۔ اس نے ہمیں فارن ٹور پر بھیجایا۔ پاکستان گورنمنٹ

”کون گورنمنٹ۔؟“ سرسوتی نے پوچھا۔

”ہمارا اپنا پاکستان گورنمنٹ۔ تم لوگ تو ابھی برٹش کولونی ہے۔“

”کولونی ہے تو ٹھیک ہے۔ آرام سے ہے۔“

”آہ۔ تمہاری منظمی اب تک کولونیل ہے۔“ یاسمین نے حقارت سے کہا۔ بے چاریاں بھلاؤ

ولاد۔ خود غلام۔

”اور تمہاری بینٹیلی کیا ہے؟“ سرسوتی نے چمک کر پوچھا۔ نیورلڈ میں پیدا ہو کر مہندی نژاد

رہ بھی نڈر ہو جاتے ہیں۔ اور بے ادب۔ اب ان جاہلوں سے کون بحث کرے۔ وہ چُپ ہو گئی۔

دیپالی واپس آئی۔ ”میرے شوہر کا فون آیا تھا کہ تم سے کہہ دوں۔ انہوں نے کل رات کو تمہارے ڈانس

رگراں گورنمنٹ ہاؤس میں رکھوا دیا ہے۔ گورنر جنرل کے لئے۔“

”گورنر جنرل کے لئے۔؟“ یاسمین نے خوشی سے اچھل کر دہرایا۔ مسٹرئس سرسوتی زبردست مسکرائی۔

سے کی ٹرے اٹھا کر بیگلے کی طرف چلی۔ یاسمین نے اس کی طنزیہ مسکراہٹ دیکھی اور جھینپ گئی۔

”اچھا اب ہم بھی جلتا ہے۔“ خیر النساء نے کہا۔ سرخم کر کے مسکرائی اور کچڑوں کی ٹوکری اٹھا کر

ردپیشکی سمت روانہ ہو گئی۔

”عجیب مسخری عورتیں ہیں۔“ یاسمین نے اظہار خیال کیا۔ ”تم کن لوگوں میں آ پھنسیں۔“

”بہت بھلے لوگ ہیں، دیپالی نے جواب دیا۔ ”انہیں یقیناً ہم اور تم مسخرے لگتے ہوں گے۔“

ماہرزین کو چھوڑے انہیں تلو سال سے اوپر ہو گئے۔ اب تک اسے یاد کرتے ہیں۔ یہ خیر النساء اور سرسوتی

دونوں کے پُرکھے یو۔ پی کے صلح اعظم گرمھ سے آئے تھے۔ تلو سال پہلے۔ جب انگریزوں نے یہاں اپنے

مردو غلاموں کو آزاد کیا تھا۔ تب ان کی جگہ اپنے نئے ہندوستانی غلام یہاں منگوائے تھے۔ یہ یہ آدھے

پینش آدھے ایمرٹن یو۔ پی کے ہندو یا مسلمان آدھے برٹش ہیں۔ سترہویں صدی کے انگریزی الفاظ

ان لوگوں میں۔ پچھلے زمانہ میں۔ یہ بے چارے اب تک برٹش قلی کہلاتے ہیں۔ مگر یہ بڑے ذہین لوگ ہیں انہیں

معمولی مت سمجھنا۔“

”دیدنی۔ کہاں سے کہاں بات نکل گئی۔ کچھ دیر ہوئی میں نے آپ سے پوچھا تھا۔ کیا ہوا تھا
میں کا جواب تو دیجئے۔ مجھے اب تک معلوم نہیں۔ کیا ہوا تھا۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔“

سید سے اب ملاقات ہوئی ہے۔ اور اس اجنبی رداقتادہ جگہ۔۔۔ آخر ہوا کیا تھا؟“

دیپالی نے ایک بڑا آن پیراڈائیز کو دیکھ کر کہا۔ ”دیکھو یہ کتنے خوب صورت پرندے ہیں۔“

”دیدنی۔ پلزز۔ بات مت ٹالئے۔“ یاسمین بھائی تم تو ہمیشہ کی فوڑی پار کر ہوا۔“

”پوری بات بتائیے نا۔ آپ سن بیالیں میں جب جہاں آرا آپا کی شادی ہوئی اس کے بعد کبھی
ان سے ملی کیوں نہیں؟ وہ جب بھی دیناج پور سے ڈھاکہ آتیں آپ کے لئے معلوم کرا تیں۔ اطلاع
ملتی کہ شانتی نکیتن میں ہیں یا ریڈیو پور گرام کے لئے لکھتے گئی ہوتی ہیں۔“

”نہیں۔ میں چند ایک بار جہاں آرا سے ملی تو تھی۔ دراصل اس سے نظر میں چار کرتے ہوئے
مجھے احساس جرم ستاتا تھا۔“

”آخر کیوں۔ کیا ہوا تھا؟“

دیپالی ہنس پڑی۔ ”کیا ہوا تھا؟ اُس نے دُہرایا۔“ کچھ بھی نہیں۔ جہاں آرا کی شادی کی
اطلاع کا جب تمہارا خط آیا اس سے صرف دو روز قبل اُدارائے شانتی نکیتن پہنچیں۔ مجھ سے
بہت سیلو ڈریمٹک انداز میں کہا۔ ریمان اپنی کزن کا بچپن کا منگیتر ہے۔ تم سچ میں آگئیں بڑ
شرم کی بات ہے۔ تم اپنی ہسپلی کی زندگی بریاد کر رہی ہو۔ اپنے نیک دل باپ کو صدمہ پہنچا رہی ہو۔
جہاں آرا اور ڈاکٹر سرکار دونوں کہیں تمہاری وجہ سے اپنی جانوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔

”جب سے میں نے بالکل غیر متوقع جہاں آرا کی الماری میں ریمان کی تصویر رکھی دیکھی تھی میں
بھونکی تھی۔ اور احساس جرم مارے ڈال رہا تھا اس کے بعد میں نے ریمان سے بات نہیں کی۔ ان کے
بہت اھرا پر جب ان کو وجہ بتائی انہوں نے پورا قصہ سنایا۔ کس طرح ان کی نسبت ٹوٹی۔ اور وہ
ان سے میری ملاقات سے پہلے کی بات تھی۔ پھر بھی مجھے تشفی نہیں ہوئی۔ بہت سمجھا بکھا کر ریمان نے
مجھان سے بیاہ کر لینے پر راضی کر لیا۔ لیکن اب شانتی نکیتن پہنچ کر اُداسی کہنے لگیں۔ جہاں آرا اب
نک یہ آس لگائے بیٹھی ہے کہ ریمان شاید ارجمند منزل واپس آجائے اور نواب اس سے شادی کر لے۔“

کے لئے تیار بھی ہو جائیں۔ اگر تم نے ریحان سے بیاہ رچایا تو جہاں آراغریب شاید نہ رکھالے بلکہ نشین محمدن لڑکیوں کے ایسے ٹریک فٹ سے ہیں۔ علاوہ ازیں ریحان ایسا ناقابل اعتبار شخص ہے جب اس نے اپنی کزن سے بے وفائی کی جس کے باپ کے روپے سے وہ ولایت پڑھنے گیا تھا تو وہ بھلا تمہارا کب تک ساتھ دے گا۔ تم کو بھی چھوڑ دے گا۔ پھر تم کیا کرو گی۔ چند رکنج کے دروازے بھی تمہارے لئے بند ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ کیا کہیں تھی اور نا تجربہ کار۔ یہ سب سن کر ذہل گئی۔ اُوارا کے کے واپس جانے کے بعد اسی رات میں نے ریحان کو بڑا کراخت لکھا کہ آئندہ مجھ سے کبھی نہ ملیں۔ اسی رات میں نے وہ خط پوسٹ کر دیا۔ اس کے دوسرے روز تمہارا خط ملا۔ جس میں تم نے اطلاع دی تھی کہ بیچاری جہاں آرا کی شادی دیناج پور کے کسی زمیندار سے ہو گئی۔ اگر تمہارا وہ خط مجھے دو روز پہلے مل گیا ہوتا تو میں اُوارا کے بھرتے میں نہ آئی ہوتی اور پردگرام کے مطابق ریحان سے سول میرج کرنے کلکتہ چلی جاتی۔ لڑہونی کو کوئی مال نہیں سکتا۔

”ریحان کلکتہ جا چکے تھے۔ میرا اعتبار نامہ موصول ہونے کے بعد انہوں نے مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے ان کو بہت ہی سخت خط لکھا تھا۔ آئیٹیا لوجی کی خاطر۔ یعنی یہ کہ انسان انسان کا ل نہ دکھائے۔ اور وہ جہاں آرا کا دل دکھا رہے تھے۔ اور میں اپنے والد کا۔“

”دیپالی دیدی۔ ایک بات بتاؤں۔ ہم سب پاگل لوگ تھے۔ قبول مشرٹیس سر سوئی۔ صرف وادی صبح الدماغ تھیں۔ اور ریحان بھائی کے بارے میں آگے میں بتاؤں ہ سینے۔ سن پتیا لیس میں لاندیا کسان بھائی طرف سے ایک لوک گیت کانفرنس ہوئی تھی۔ یاد ہے؛ لوک گیت منڈیاں مارے ملک سے آئی تھیں۔ اس کانفرنس میں ریحان بھائی میرے پیچھے لگ لئے؟“

”راسکل۔۔۔!“ دیپالی نے قبضہ لگایا۔

”آپ اُس میں نہیں آئی تھیں۔“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ ریحان اور اُوارا وہاں جانے والے ہیں اس لئے نہیں گئی تھی۔“

”مسلمان نوک سنگرز بہت بڑی تعداد میں آئے تھے۔ کیونکہ جنگال کی نوک میوزک زیادہ تر مسلمانوں کی تھی۔ یہ دراصل مجھے اب مشرقی پاکستان بننے کے بعد اندازہ ہوا۔ ریحان بھائی ن نوک سنگرز کے کیمپ کے انچارج تھے۔ ایک دستہ منی پور سے آیا تھا۔ گارو ہلز سے مس اہیں بارو

لو انہوں نے بھگا دیا تھا۔ کیا زمانہ تھا کہ منی پور کے راجہ کا بھائی کیونست لیڈر تھا! آج یہ سب قصے اتنے عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ سپلینڈر تھیٹر کے لوگ تھے۔ کیا جوش و خروش تھا۔ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ شو نارتنگال عنقریب تقسیم ہونے والا ہے۔ بس صرف یہی خیال تھا کہ انگریزوں کو نکالتے ہی ملک میں دودھ کی ندیاں بہ جائیں گی۔ —

”اور کتنی جنگجو اصطلاحات تھیں! ہماری ٹولیاں اسکوڈ کہلاتی تھیں۔ چانگام اسکوڈ۔ مریا ویلی اسکوڈ۔ منی پور اسکوڈ۔ سپلینڈر تھیٹر اسکوڈ۔ دیدی وہاں اڑیہ اسکوڈ نے ایک گیت سنایا تھا۔ اس پیٹ کی خاطر میں بنگال گیا۔ پاٹر میلے۔ دھان کوٹے۔ دھان کاٹی۔ چاکری کی۔ پیٹھ پر کوڑے کھائے۔ ناچا۔ چرخہ کاتا۔ گالیاں دیں۔ ہم راج سے ملا۔ اس پیٹ کی خاطر۔ —

”اور ہم ڈھاکہ سے ٹری نیڈاڈ آگئے۔ اس پیٹ کی خاطر۔“ دیپالی بولی۔
 یاسمین کہتی رہی۔ ”ایک گونڈ گیت تھا۔ میں نے گائے بیچ کر جنگل کا ٹیکس دیا۔ بیچ کر۔ اب بھی کافی نہیں۔ انگریز کے راج میں ہم بھوکے رہتے ہیں۔ ہمیں اس وقت ایسا پکا معصوم یقین تھا کہ اپنے قومی راج میں کوئی بھوکا نہیں رہے گا۔ اور وہ حیدرآباد اسکوڈ۔ ہم سرخ سپاہی شانِ وطن۔“

”ریحان کے متعلق بتاؤ یاسمین۔“

”ہاں دیدی تو وہ اس کانفرنس میں میری بہت سرپرستی کرتے رہے۔ میں نے ان کو بتایا میں دیپالی سرکار کی دوست ہوں۔ ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اچانک میں بہت پور ہو گئی۔ طبیعت میزاج ہو گئی۔ پارٹیشن سے ذرا پہلے میں اپنے کٹر مذہبی قدامت پرست مولوی دالدار سارے گھر والوں سے بغاوت کر کے ایک اسکالرشپ پر بھرت ناٹیم سیکھے مدراس چلی گئی۔ ماوردہاں سے ایک سال بعد اپنے ایک روشن خیال رشتہ دار کے پاس سیدھی کراچی۔ وہ بہت بار سوخ آدمی تھے۔ انہوں نے ایک بنگالی منسٹر کے ذریعہ کوشش کر کے مجھے باہر بھجوانے کا بندوبست کیا۔ انہی دنوں ڈھاکہ سے جہاں آرا آپا نے لکھا کہ آپ لوگ چند رنج فروخت کر کے کلکتہ اور وہاں سے ٹری نیڈاڈ جا چکے ہیں۔ جہاں آرا آپا کو بڑا افسوس تھا کہ جاتے وقت آپ ان سے ملی نہیں۔ خط تک نہ لکھا۔ ان کو صدمہ زیادہ یہ تھا کہ شاید ہندوستان پاکستان کی سیاست کی معنی آپ دونوں کے درمیان آگئی۔“

نہارے میں لیا ہوا بڑا سا مکان تھا۔

”متر بابو نے نہ جانے کس طرح یہ طے کر لیا تھا کہ بابا اودا مارے پر عاشق ہو گئے ہیں۔ لیڈی رائے بھی چاہتی تھیں کہ اودا کسی سے بھی جلد از جلد شادی کر لیں! اور ریمان کے FIXATION سے آزاد ہوں۔ ریمان بھی شہر میں موجود تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ نیا نیا پارٹیشن ہوا تھا۔

کیونکہ بہت شدید تھی۔ ریمان سے دوستی کی افواہ کی وجہ سے اپنی ساری دولت کے باوجود اودا کے لئے رشتے مفقود تھے۔ نرٹیند بھی بہت پریشان تھا۔ وہ ایک پگلا سرمایہ دار۔ وہ بہن کے سیاسی رجحانات سے ہمیشہ نالاں تھا! اب اس نے بھی اودا پر شادی کے لئے زور ڈالا۔ آخر ایک روز اودا میری خود ہی آکر ٹرٹراہٹ میں بابا سے کہ گئیں کہ وہ اُن سے بیاہ کر لیں گی۔ شادیاں کی اسکیم یہ بھی رہی ہو کہ بیاہ کے بعد شوہر کی موجودگی میں ریمان سے ملنا جلنا اتنا قابل اعتراض نہ سمجھا جائیگا۔

”میرے بابا بہت سادہ لوح ہیں۔ وہ کسی انسان کو بڑا سمجھ ہی نہیں سکتے۔ مگر اودا کے وہ بھی مدّاح نہ تھے۔ اس کے باوجود، چونکہ اپنی جگہ سے اگھر چلے گئے، وہ کسی جذباتی سہارے کے متلاشی تھے اور اودا میری ان کو بھی خوب FLATTER کر رہی تھیں۔ متر بابو جو شادی کی گفت و شنید ڈھاکے کے زمانے سے چلا رہے تھے بڑے کامیاب بزنس مین تھے۔ بابا رائے خاندان کے داماد بن جائیں تو توڑ کے ذریعے وہ نرٹیند رائے سے اپنے دسویں کام نکلو اسکین گے۔ کیونکہ نرٹیند اتنا ”برادرن مٹا اور بددماغ مغرور آدمی تھا کہ کوئی تھو خیر اس کے پاس پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

”میں محو حیرت یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ اصول پرست بابا نے مجھ سے ریمان کے بارے میں کبھی ایک لفظ نہ پوچھا تھا۔ اودا میری سے میں بات ہی نہیں کرتی تھی۔ بڑے شدید تناؤ میں وقت گذر رہا تھا۔

”اب دیکھو۔ کلاس کی پیدائشی خردماغی کبھی جاتی نہیں۔ اودا پرانی ”فیوٹور“ تھیں۔ بابا سے شادی کرنے والی تھیں مگر ہمارے کہنے سے اس طرح کا برتاؤ کرنے لگی تھیں جیسے ہم غریب ریونیو جی لوگ ان کے محتاج کر رہے تھے۔

”میں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ بابا مطب جانے کی فکر میں تھے۔ چند رنج کی قیمت کا روپیہ ہتہ ہتہ ختم ہوتا جا رہا تھا۔ شو نو اور ٹوٹا آوارہ گردی کرنے لگے تھے۔ متر بابو کے گھر پر راجے

لوں کو تقریباً ایک سال ہو گیا۔ اب سبز منزل نے پستی ماں سے لڑنا شروع کر دیا۔ بھوتانی دینی۔ گود ہر۔ خود ایک لڑاکا خاتون۔ گھر میں روز کھٹ پھٹ ہونے لگی۔ میں گھبرا کر باہر نکل جاتی۔ ریڈیو روموں سے ذرا سی آمدنی ہو جاتی تھی۔ باقی وقت میں میوزیم یا کسی لائبریری میں گزارتی۔ مترابو کے پس جلتے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ ادرا س چیز سے اور زیادہ کوفت ہوتی کہ ریمان اسی شہر میں موجود اور ان کو معلوم ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔ ایک بے روزگار رہنیو جا۔

”ایک صبح میں دکتوریہ میوریل میں گھوم رہی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں میسوپولطان کے بالخالق کے پورٹریٹ کے نیچے کھڑی جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ سراج الدولہ بکلائیو۔ کارنواں پو میر۔ اچانک اُواد سی کی آواز سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا وہ کسی انگریز کے ساتھ وہاں موجود تھے اس سے ملوایا۔ وہ ان کا لندن کا کوئی پرانا ہم جماعت تھا۔ کلکتہ آیا ہوا تھا۔ اسے سیر کر رہی پھر انہوں نے نہایت بلندی سے میرا تعارف کرایا۔ مس دیپالی سرکار۔ میرے بھائی ذرائے کی پرسنل اسٹنٹ۔

”میں ہنگامگان کی شکل دیکھنے لگی غصے کے مارے میرا بھیجا آؤٹ ہو گیا۔ میں نے فوراً کہا کیجئے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کسی سٹریٹینڈ ولے کی پی۔ لے نہیں ہوں۔ اُواد سی نے جو اس وقت دکتوریہ میوریل کے اندر انگریز دوست کے ساتھ بڑی شان سے کھڑی تھی گھور کر دیکھا۔ اور کسی برطانوی ڈچر کے سے انداز میں کہا۔ ”اس کے متعلق ہم پھر بات کریں یونگ برٹ۔

”انگریز بہت ہتھ بوتا ہے۔ وہ اس غیر متوقع مجھے سے خاصا نام نظر آیا۔ میں لال سیلی سے ہنٹ گئی۔

”اسی روز شام اُوارائے مترابو کے ہاں پہنچیں۔ میں باہر چوہرت پر کھڑی تھی انہوں نے زلے ہی مجھے چھٹکارا شروع کیا۔ تم۔ تم کو میرے انگریز دوست کے سامنے مجھے جواب دینا ہوتی۔

پہلے سے آگے بڑھ رہی ہیں اُواد سی۔ میں نے جواب دیا۔

مد سے تم آگے بڑھ چکی ہو۔ احسان فراموش۔ تم پہلے تاریخ سے زمیند کے آفس میں کام کر رہی۔

تجارتی جیسی ریاضی لڑکیوں سے کلکتہ پٹا پڑا ہے۔ ہر جو تھی بنگالی لڑکی تمہاری طرح گاتی ہے۔ تم مجوزہ نہیں ہو۔ یہاں تم کو ویسٹ بنگال کا گورنر کوئی نہیں بنا دے گا۔ بشکر کرو کہ میں نے نریندر کے دفتر میں ملازمت کا بندوبست کر دیا۔

”اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں آپ کے شرابی، بد معاش، بد دماغ بھائی کی سکرٹری بننا قبول کروں گی بہت سخت غلطی پر ہیں۔ ادا دیدی۔“

”میں نے اب ذرا سکون سے جواب دیا۔“

”میں تمہارے باپ سے بات کرتی ہوں۔ انہوں نے پیر شیخ کر کہا۔“

”کر لیجئے۔ میں نے جواب دیا۔“

”بابا اور مسٹر مہرا گھر پر موجود نہ تھے۔ پشی ماں کالی گھاٹ گئی ہوئی تھیں۔ مسٹر مہرا کان لگا اندر سے یہ سارا مکالمہ سن رہی تھیں۔ اومادی لٹے پاؤں واپس گئیں۔ جب بابا گھر آئے مسٹر یہ سارا قصہ ننگ مرچ لگا کر ان کو سنایا۔ بابا نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ نزد میدان میں ٹہلنے جاتے تھے۔ کھانے کے بعد مجھے آواز دی۔ میں باہر چوتھے پر آئی۔ اس رات میں اُد جانے کے بعد کمرہ بند کر کے بہت روئی تھی۔ بابا نے کہا۔ دیپالی ہمت سے کام لو۔“

”میں نے کہا۔ بابا کیا آپ واقعی اس خوفناک عورت سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“

”وہ چیپ رہے۔ میں نے کہا کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں نریندر رائے کی پرسنل سکرٹری علاوہ ازیں سرپری توش اومادی کے لئے رطیلجہ کو ٹھی بنوا رہے ہیں آپ وہاں رہیں گے۔ ریمان آیا کریں گے۔ میں ریمان کی ساری عمر شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ کیسی ہولناک صورت حال ہے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس روز میں نے پہلی بار بابا کے سامنے ریمان کا نام لیا تھا۔“

”بابا چند منٹ ننگ خاموش رہے۔ پھر بولے۔ چلو۔ ہم اس ملک کو ہی خیر باد کہتے ہیں۔“

”واپس ڈھاکہ۔۔۔ میں نے پوچھا۔“

”ہیں۔ ٹری نیڈاڈ۔ مکمل کا خط آیا تھا۔ اگر میں وہاں آنا چاہوں تو وہ میرے لئے وہاں آ کر سکتا ہے۔ کبھی پلانیشن پر میڈیٹل آفسیر کی جگہ مل سکتی ہے۔“

”بابا کے ایک چچا زاد بھائی مدین گڈری ڈھاکہ سے پورٹ آف اسپن چلے گئے تھے۔ ڈا“

بہت پیسہ لگایا۔ ایک مرتبہ وطن آئے تو چند کونج آئے تھے۔ بڑھیا سوٹ۔ ہوانا سگار۔ میری ماں زندہ
 انہیوں نے بھینپ بھینپ کر گھر کا افلاس چھپاتے ہوئے ان کی میزبانی کی تھی۔ اب میں نے بابا سے
 ”مگر آپ اب اوما دی کو کس طرح SHAKE OFF کریں گے؟“
 ”بابا ہنس پڑے کہنے لگے۔ میں ان سے کہوں گا شادی کے بعد وہ میرے ساتھ ٹری نیڈا دھلیں۔
 نکار کریں گی، قحہ ختم ہو جائے گا۔“

”ایسا ہی ہوا۔“

”چندر کونج کی قیمت کا جو رد یہ باقی بچا تھا اس سے جہاز کے پانچ ٹکٹ خریدے گئے۔ بابا۔
 ماں۔ بیٹا۔ شو نو۔ ٹو نو۔ بہت لمبا بحری سفر کر کے ہم لوگ یہاں پہنچے۔ کھوکھو آنے پر راضی نہ ہوا۔
 نبھاسجھائی لیڈر بنتا جا رہا تھا۔ اور آر۔ ایس۔ ایس میں شامل ہو چکا تھا۔“

”ازدواجی زندگی کا آرام جو سپندر برس بعد ان کو دوبارہ حاصل ہو سکتا تھا شاید بابا نے میری وجہ
 اس کی قربانی دی۔ پتہ نہیں۔ لٹی یاں مجھ سے بہت خفا تھیں کہ گھر آئی لکشمی کو واپس کر دیا۔“
 ”ار سے وہ لکشمی تھی کہ وبال جان۔“ یاسمین بولی۔ ”آپ سب کی زندگی اجیرن کر دیتیں۔“
 ”یہاں پنچ کر میں نے لٹی ماں کو سمجھایا کہ اشنان کر میں میں بھی ہو سکتا ہے۔ جہاگالی ہر جگہ ہے
 بروں کی یہاں کمی نہیں۔“

”یہاں سوشل رسوم انیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیں۔ ہنومان جی کے مندروں میں پوجا
 بد لوگ باگ چوراہوں پر آ کر فیٹھا کرتے ہیں اور کلپسو ڈانس۔ شو نو کو سمان فرسینڈو میں ٹوکرڈ
 ہے ٹو نو ونیزولا چلا گیا ہے۔“

”للت سین سے میری شادی یہاں پنچنے کے دوسرے برس مکمل چا جانے طے کر وادی رادر میں ہٹے
 ن سے مسز سین بن گئی۔ للت یہاں کے کامیاب ترین بیرسٹریں۔ پہلی بیوی اسپینش نژاد اور لاد لٹی
 عرصہ ہوا طلاق دیدی۔ شریوٹ آدمی ہو، میں کافی خوش ہوں۔ بابا اور لٹی ماں ہائے ساتھ بطور P.G.
 تے ہیں۔ بابا کے مطب کے لئے دیکھو للت نے کیسا خوب صورت بڑی ٹاپ ہاؤس بنوایا ہے۔“
 یاسمین نے ذرا تعجب سے دیپالی کو دیکھا۔ کچھ لمحے خاموش رہی اور بولی۔ ”اس کا مطلب ہے
 سا آرا آیا بھی لینے دیناج پور کے رئیس کے ساتھ خوش ہوں گی؟“

”شاید۔“

”یہ مجبوریوں سے سمجھوتہ ہے یا سچی خوشی؟“

”معلوم نہیں۔“

ایک طویل امریکن کار بھانگ میں داخل ہوئی۔ اسے دردی پوش نیگرو شو فر ڈرائیو کر رہا بھاری بھر کم اور کم رولت سین برلیٹ کیس سنبھالے کار سے برآمد ہوئے۔ رین ٹری کی سمت آئے ڈاکٹر بنوئے چند سرکار ٹری ٹاپ ہاؤس کی سیڑھیاں اترے۔ وہ چاروں باتیں کرتے اپنے کولونیل بنگلے کی طرف چلے گئے۔ اندر ڈرائیونگ روم میں نیگرو بٹلر پنچ کے انتظام میں مصروف، یاسمین طویل برآمدے میں سے گزرتی ڈرائیونگ روم میں چلی گئی۔ اس نے دریچے سے باہر جھانکا۔ بھونڈے دیوی ایک درخت کے نیچے آنکھیں بند کئے بیٹھی ہل رہی کر مالا جب رہی تھیں۔ سامنے پالتو خرگوش اور اعلیٰ نسل کتے دوڑتے پھر رہے تھے۔ نہایت پرسکون منظر تھا۔ یاسمین دریچے میں سے ہٹ کر وسیع ڈرائیونگ روم میں ادھر سے ادھر بیٹھ قیمت سامان آرائش دیکھتی پھری۔ ایک بڑے اونٹنی گراموفون کے نزدیک دیپالی سرکار کے پرانے ریکارڈ رکھے تھے۔ یاسمین نے گوک بھر کے سفید گلاب اور بھونڈے والا ایک ریکارڈ گراموفون پر لگایا۔ سوئی کہیں بیچ میں پڑ گئی۔ اچانک دیپالی کی آواز بلند ہوئی۔ کوئی کہے کالو۔ کوئی کہے گورو۔ یو ہے۔ یو ہے۔ جتنا ڈھول۔

یاسمین پر پھر بیزاری کا دورہ پڑا۔ اس نے سوئی اٹھائی۔ ریکارڈ پلٹا۔ کماری دیپالی سرکار دو سرا بھن۔ سوئی پھر دست پر پڑی۔ جو پہر اوے سو ہی پہنوں۔ جو کھلاوے سو ہی کھا جہاں پٹھاوے تاہیں بیٹھوں۔ میرا کہے پر بھو۔

واہری عورت کی اوقات۔ یاسمین نے ذل میں کہا۔

نیگرو بٹلر کمرے میں آکر بولا۔ ”مس! پنچ از سرورڈ۔“

گراموفون بند کر کے وہ ایوان طعام کی طرف بڑھی۔ سامنے آتش دان پر روزی کی دستخ

شدہ تصویر پر نظر پڑی۔ ”رادھیکا سانیاں۔ نئی دہلی۔ ۱۶ مارچ ۱۹۴۷ء

۳۴ ایستھر گری بالا بنرجی

ڈھاکہ۔ مشرقی پاکستان۔ دسمبر ۱۹۷۹ء

مشن کمپاؤنڈ کے ایک کوارٹر کے سیننگ روم میں کروشیا کے میزپوش سے ڈھکی بڑی ہیز
تین تصویریں رکھی ہیں۔ مکمل نیرا۔ ایلا۔ نئی دہلی۔ روزی کے بچے۔ پادری بنرجی آرام کرسی پر لکھیں
ندکے لیٹے ہیں۔ ڈاکہ سامنے سے گزر جاتکے۔ وہ اس کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہیں۔
”روزی کا خط آیا؟“

”نہیں۔“ ایستھر گری بالا اسٹوو پر بھات اُباتے ہوئے جواب دیتی ہیں۔

”اتنے برسوں سے وہ آئی بھی نہیں۔ کب آئے گی؟ ہر سال انتظار کرتا ہوں کہ شاید اس کو گھر

آجائے۔“

”پال۔ اس کے لئے یہاں آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ویزا بڑی مشکل سے ملتا ہے۔“

”جب پارٹیشن نہیں ہوا تھا تب کونسا آتی تھی۔ اسے اب بھی ہم سے خرم آتی ہے۔ وہ ہم سے
میشہ سے چڑھتی تھی۔ وہ بڑے آدمی کی بیوی ہے۔ ہم دسی کر سچین غریب لوگ ہیں۔ مگر ہمارے مرنے کے
جد سے شاید ہماری قدر آئے۔ ہم اس کے ماں باپ تھے۔“

چرچ سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کو دو کمروں کا کوارٹر مل گیا ہے۔ عسرت سے گزر رہی ہے۔

کری بالا اچار چٹنی بنا کر بیچتی ہیں۔ دونوں کا باری باری موتیا بند کا آپریشن ہو چکا ہے۔ پادری صاحب

باپریشن ٹھیک سے نہیں ہوا۔ ان کی بھارت زائل ہو چکی ہے۔ یسوع۔ یسوع۔ وہ جو آسمانوں

سے گزر گیا۔ یسوع۔ شام کو گری بالا پادری صاحب کا ہاتھ تھام کر ان کو ہٹلانے لے جاتی ہیں۔

سفید داڑھی۔ نابینا۔ پر نور چہرے والے پادری بنرجی سنان سڑک پر آہستہ آہستہ چلتے یسوع

کے ایک حواری معلوم ہوتے ہیں۔ آٹے ٹوہا۔ آٹے ٹوہا۔ آٹے ٹوہا

کل رات یادری بھرتی اپنے منجی سے جا ملے۔ آخر وقت میں وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو نہ دیکھ سکی۔ روزی کو موت کی اطلاع کا تار بھجوا۔ اس کا خط آیا۔ ماما تم فوراً میرے پاس چلی آؤ۔ لیکن برعین خزاں ماما اپنے داماد کے ٹکڑوں پر پلنے نئی دہلی نہیں جائیں گی۔ اور نہ اپنے امیر زادے نواسوں کی آیاگری کریں گی۔ مشن بولے ان کی مدد کر رہے ہیں۔ مشن اسکول میں ہو سٹل وارڈن کا کام دلوادیا ہے۔ مگر پرنسپل سے ان کی نہیں بنتی۔

ایک روز وہ رکشا پر بیٹھ کر ارجمند منزل پہنچی ہیں۔ ۱۹۰۵ء میں ایک بال و دھوا برہمن ہندو پندرہ سالہ بیٹی سسرال والوں کے مظالم سے بچنے کے لئے کشتی پر بیٹھ کر فریدپور کے گاؤں سے بھاگ کر اپنے زمیندار آقا کے ہاں پناہ لینے ارجمند منزل ڈھاکہ آئی تھی۔ ایک بوڑھی عیسائی غریب بیوہ نے ارجمند منزل پہنچ کر نواب قمر الزماں کے دفتر کے دروازے پر دستک دی۔

پنچالیس سال قبل، نواب قمر الزماں اپنی بنت عم علیہ بی بی پردم دے رہے تھے۔ مگر اپنی رعیت کی اس دلکش ہندو بال و دھوا کے قیر نظر کے بھی گھائل ہو گئے تھے۔ بوڑھے نواب قمر الزماں نے خود آگ کر دروازہ کھولا۔ ایک پوپلے منہ والی پریشان حال ضعیفہ ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اسکول پرنسپل کے خلافت اس کی شکایات سن کر نواب نے کہا۔ "اسی تھو! ارجمند منزل تمہارا

گھر ہے۔ یہیں رہو۔ تم کو اس عمر میں ہم محنت مزدوری نہیں کرنے دیں گے۔"

"نواب صاحب۔ پال بڑے خود دار آدمی تھے۔ میں کسی بھی جگہ محنت خوردی کر کے ان کی روح کو تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ مجھے کہیں کام دلواد کیجئے۔"

گری بلا دیسی کے اصرار پر نواب صاحب۔ ان کو یونیورسٹی کے گریجویٹس میں کچن سپروائزر کی ملازمت دلوادیتے ہیں۔ دو سال بعد وہ بجا راضہ نمونہ مرجاتی ہیں۔ چرچ یا رڈ میں پال کے پہلو میں دفن کی گئیں۔ کسی کو علم نہیں کہ نئی دہلی کی مشہور دو تہ مند سوشل ورکر رادھیکا سانیال ان کی بیٹی ہے۔

نئی دہلی میں جس وقت روزی کو مسز بھرتی کی وفات کا تار ملا جو نواب قمر الزماں نے بھجوا دیا تھا وہ اپنی عالی شان بیٹی کو ٹھی میں ڈنر کے انتظام میں مصروف تھی۔

بہان آچکے تھے۔ تاریخ سن کر ماسانیال نے لیا۔ وہ روزی کے پاس گیا جو چند غیر

لڑیہانوں کا سواگت کر رہی تھی۔ ایک امریکن اسکالر اسکور کی تحریک کے بارے میں ایک امریکن فاؤنڈیشن کی طرف سے کتاب لکھ رہا تھا۔ اس سلسلے میں روزی سے ملنے آیا تھا۔ اس نے بسنت کمار سانیاں سے کہا۔ ”مجھے تم ہوا ہے کہ آپ کی بیوی اسکور کے موومنٹ کی ایک ہیروئن تھی!“ بسنت سانیاں دھیرے سے کہلایا۔ اس نے روزی کے ہاتھ میں وہ تار دیا جو ڈھاک سے آیا تھا۔ اور آہستہ سے کہا۔ ”روزی۔ تم ہیروئن نہیں ہیں۔ تمہاری ماں ہیروئن تھیں۔“

جہاں آرا دیناج پور سے میکے آئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ سب ارجنند منزل کے پھلے والے مجمع تھے۔ اس کا بچہ اگلے۔ والدہ۔ بھانوج۔ دونوں چھوٹی بہنیں۔ نیر الزماں نے اندر سے آکر کہا۔ ذرا اپنی جیتی یا سمن مجید کی حرکتیں دکھیو۔ یہ دیکھو لندن کے ایک اخبار میں اس کی تصویر۔ کسی زیر سے شادی کرنی۔“

جہاں آرا نے ہینک لگا کر اخبار دیکھا۔ ”بلیک میوٹی ویڈیز۔ ڈارک ڈانس یا سمن مجید بہر ڈاٹ پرنس چارمنگ۔“ ”سنگے پاؤں والی کالی رقاصہ کی شادی۔“

”معقول۔ اور یا سمن کیا رس کا گھوٹا ہے۔ بلیک میوٹی۔ ڈارک ڈانس۔ حدیہ میوٹی۔“ نیر الزماں ہسرا کر کہا۔ ”جل پائے گوری کے مولویوں کا خاندان۔ اور یہ انجام۔ سنگے پاؤں والی رقاصہ۔“

”اور وہ نگوڑا انگریز کیا کرتا ہے؟“ بیگم قمر الزماں نے پوچھا۔

”ہوگا کوئی بھر بھو بھا۔“ نیر الزماں نے کہا۔

”فیشن ڈیزائنر ہے۔“ جہاں آرا نے اخبار چڑھ کر کہا۔ ”مگر جب دیہالی کا ٹری نیڈاڈ سے خط آیا اس نے لکھا تھا کہ یا سمن ڈانس کرنے پورٹ آف اسپین گئی تھی۔ اس خط میں تو کسی انگریز ونگریز کا ذکر تھا۔“ جیرلڈ ایڈرین بلونٹ۔ بہت خوب!“

۳۵

یا سمین بلمونٹ، ڈارک ڈانسر

دیپالی دیدی۔ آپ کا خط ملا۔ اب آپ کو ساری بات بتاتی ہوں۔ بہت عرصہ بعد آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ جیرلڈ سے میں نے کہا تھا کہ شادی اسلامی طریقے سے ہو۔ وہ مان گیا۔ نکاح کے لئے ہم نے ایک دوست کو بلوایا جو پہلے باقاعدہ مولوی رہ چکے تھے۔ اب بے دین تھے۔ ہم سب پیسے نکل کر رات کے بارہ بجے ان کے گھر پہنچے۔ وہاں مزید مئے نوشی ہوئی۔ پھر مولوی صاحب نے نکاح پڑھا۔ دو لہا دہن مولوی گواہ سب نشے میں آوٹ تھے۔

شادی کے بعد ہم دونوں نے چلیسی میں ایک میوزک کرائے پر لے لی۔ جیرلڈ کی آمدنی بہت اچھی تھی میں نے رخصت ترک کر دیا۔ سنگھڑاؤس وائف بنی۔ بچی پیدا ہوئی۔ اس کا نام شہزاد رکھا۔ جب وہ ذرا بڑی ہوئی میں نے پھر اپنا ڈانس ٹرپ تیار کیا۔

ایک روز اچانک اور بالکل غیر متوقع جیرلڈ میرے ٹرپ کے ایک بنگالی رقص کے ساتھ بھاگ گیا۔ معلوم ہوا دونوں پیرس میں ہیں۔ میں پتہ چلا کر نیرس پہنچی۔ ان کو ڈھونڈنا۔ سب کو میں ان کے فلیٹ پر پہنچی بنگالی چھو کر اسپرٹ باندھے گھر بیٹو عورتوں کے سے انداز میں اسٹوڈ کے سامنے کھڑا نا شہتہ تیار کر رہا تھا۔ جیرلڈ ڈریسنگ گاؤن پہنے بیٹھا اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ گریسٹی کا یہ نظارہ دیکھ کر مجھے اُ بکائی سی آئی اور میں بغیر کچھ کہنے سے لٹے پاؤں لندن واپس آگئی۔ پھر میں نے جیرلڈ کو لکھا کہ طلا آ دیدے۔ اور مہرا داکر اس کا جواب آیا کہ شادی ہی کب ہوئی تھی۔ مولوی اور گواہ سب نشے میں دھت تھے۔ وہ نکاح نہیں تھا مذاق تھا۔ علاوہ ازیں ہم نے بلحاظ برطانوی قانون سول میرج نہیں کی۔ لہذا بچی کی پرورش کی ذمہ داری بھی مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ مجھے صفت نازک میں کبھی دلچسپی نہیں تھی۔ تم لندن میں اپنا ڈانس اسکول اور یوگا کلاسیں چلاؤ کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور ڈاؤن اینڈ آوٹ تھیں۔ اور وطن واپس جانے کے لئے کرایہ تک پاس نہ تھا۔ میں تمہارے ساتھ رہ کر تمہاری کفالت کرنے لگا تھا۔ محض ازراہ ہمدردی۔ لیکن میں امید کرتا ہوں تم اچھے دوست رہیں گے۔

جیرلڈکی والدہ جو ایک متمول اور نہایت کجخوس ریٹائرڈ ایجنٹ ایکٹرس ہیں وہ شہر زاد کو اپنے
 بچا اپنے گاؤں لے گئی ہیں اور اس شرط پر اس کی ذمے داری لینے کو تیار ہیں کہ وہ اسے روٹ کیتھولک اٹھائیں
 میں نے کہا روٹ کیتھولک کیا ہوٹن ٹوٹ، شستو، بدھسٹ کچھ بھی بنا دیکھئے۔ اسے میری طرح دھکے
 کھانے پڑیں۔ میں اب ایک دفتر میں کلر کی کر رہی ہوں۔ ڈانس ٹروپ چلانا بہت مشکل تھا۔ انڈیا
 آنے والے نامور ڈانسرز کا کبھی ٹیشن بہت سخت ہے۔ پھلے مہینے امید کی کرن نظر آئی معلوم ہوا
 یحسان الدین احمد آئے ہوئے ہیں۔ کچھلی مرتبہ پورٹ آف اسپین میں آپ کو میں نے بتایا تھا کس طرح یہ
 ات ایک زمانے میں میرا تعاقب کرتے رہے تھے۔ اب وہ سنٹر تھے اور یہاں ایک وفد کے ساتھ آئے
 اور ڈور چیمبر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے فون کیا۔ طے کی کوشش کی۔ انہوں نے صاف "بال دیا کہ
 نہ مصروف ہیں۔ پھر میں نے سنا، انہوں نے کہا "پرانے شناسا اب سب قریبی دوست ہونے کا دعو
 تے ہیں۔ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ یہ کام کروادو۔ وہ کام کروادو۔ میں کس کس سے ملتا پھرتا۔ جس
 طن سے انہوں نے یہ کہا اتفاق سے وہ مجھے بھی جانتا تھا۔ اس نے اگر مجھے بنایا۔

جہاں آرا آپا سے آپ کی خط و کتابت ہے، میں نے ان کو کئی خط لکھے جواب نہیں آیا۔ غالباً
 بند منزل والے بھی میرے طرز زندگی سے سخت متنفر اور بیزار ہیں۔ مگر میں کیا کر سکتی ہوں۔ زمین او
 ن میرے سامنے سے بھاگ گئے۔ مجھے کہیں پناہ نہ ملی۔

آپ کی یاسمین بلونٹ

۳۳۶ پابلیٹ آف فیسر اکمل مرشد زادہ

لاڈا اسپیکر پر دہرایا جا رہا تھا۔ مسز دیپالی سین۔ مسز دیپالی سین۔ وی۔ آئی۔ پی۔ لافچ۔ ٹی
 آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ مسز دیپالی سین ٹی۔ ڈیلو۔ اے کی مسافر۔ پورٹ آف اسپین کی مس
 پالی سین۔

ششدر اور مضطرب وہ مسافروں کی بھڑ سے نکلی۔ پاکستان ایر فورس کے یونیفارم میں

بلوس ایک سافلا نوجوان اس کی طرف آیا۔ ”دیپالی آنٹی۔“ اس نے ذرا جھجک کر پوچھا۔ ”میں کمل ہوں۔ امٹی لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کی فلائٹ بہت لیٹ تھی۔“ وہ پائلیٹ آفیسر کمل حسین مرشدزادہ کے ساتھ وی۔ آئی۔ پی۔ لاؤنج کی طرف بڑھی، کم کے اندر ڈھکی ملل کی سفید ساری میں بلوس ایک نکلن آنکھوں والی دہلی پتلی عورت، کھچڑی خیر مقدم کے لئے صوفے سے اٹھی۔ دیپالی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”یہ امٹی ہیں۔“ نوجوان کمل نے ذرا گھبرا کر کہا۔

”میں تمہاری شادی میں شریک نہ ہو سکی تھی دیکھو اتنی دور سے تمہارے بیٹے کی شادی میری شرکت کے لئے آئی!“ دیپالی نے مصنوعی ایشامت سے کہا۔ جہاں آرا کو اس حالت میں دیکھنے کی ذمہ داری میں خود ہوں۔ میں ریمان کو آسانی سے بھلا سکی۔ لیکن ریمان؟ رح سے ان کی زندگی ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی۔ زندگی کی بربادیوں کا یہ کیسا لاتناہی سلسلہ ہے۔ اس نے آرا کو آنکھوں والی جہاں آرا پر پھر نظر ڈالا دو سال قبل وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ کمل اس کا اکلوتا لڑکا تھا۔

دیپالی نے اتنی شان، وشوکت پہلے ارجمند منزل میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اُدما رائے کے دو دلہنے میں بھی نہیں۔ پاکستان کا نیا اوپری طبقہ واقعی سید متھول ہو چکا تھا۔ دلہن بھی ایک ملک التجار کی لڑکی جب کمل کے سہرا باندھا جانے لگا جہاں آرا وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ کونے میں جا کر اپنے سوجو شوہر کو یاد کر کے رو رہی تھی۔ دیپالی نے ایک بار پھر اسے حیرت سے دیکھا۔ ہندوستانی۔ خیر۔ پاکستانی۔ عورت! خلائق رضی اسے ایک ایسے عیاش بن بدقوارہ بد ہیئت شخص سے برباد کیا جس نے ساری عمر سے جلایا۔ مگر اس نے دوسروں کے سامنے ہمیشہ اپنے شوہر کی حمایت کی اور اس کی خدمت گزار رہی۔ اور اب اسی یاد کے رو رہی تھی۔

چند سال قبل جہاں آرا کی چھوٹی کنواری بہنیں انجم راور اختر آرا اپنے بھتیجے منور الزماں سے ملنے لندن جا رہی تھیں جو وہاں اسکول میں پڑھتا تھا۔ طیارہ آپس پر گر کر پاش پاش ہو گیا۔ سارے مسافر مارے ہوئے۔ برص میں لاشیں بھی نہ ملیں۔ اس دہشتناک جو انفرنگی کے صدمے نے ان کی ماں بیگم قمر الزماں کی جان لی۔ نواب قمر الزماں، اس کے بعد سے بہت کم لوگ تھے۔ اس وقت یتیم نواسے کی شادی کے عصر نے میں

میلانے کے نیچے ترکی ٹوپی اوڑھے (اگلے وقتوں کے لوگ ننگے سر رہنا خلاف تہذیب گردانتے تھے) گورنر اور اعلیٰ افسروں سے ایک آدھ بات کر لینے کے بعد پھر خاموش ہو گئے۔ صوفے پر گم صم بیٹھے رہے۔ کی نظر دیپالی پر پڑی جو ایک طرف کھڑی جہاں آرا کی پرانی خادمہ مالا سے باتیں کر رہی تھی۔ انہوں نے اشارہ کر کے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔ وہ دونوں چپ چاپ مٹھے کی جہل میں کانٹا نظر کیا کرتے۔ دیپالی کی آنکھ بھڑائی۔ اس نے چپکے سے آنسو پوچھے۔ نواب صاحب نے دیکھ لیا۔ آہستہ سے لے ”رونا نہیں چاہئے بیٹی۔ بڑی بات ہے۔ صبر بڑی چیز ہے۔“

کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ کے بھانجے ریحان الدین احمد۔۔۔ میں ابھی ان سے یہ میں مل کر آ رہی ہوں۔“

نواب صاحب نے چاندی کی موٹھ والی چھڑی کو آہستہ سے قالین پر کھٹکھٹایا اور ذرا توقف کے لوے۔ ”ریحان اب وہاں بڑا آدمی ہے۔ اپنی پرانی سیاست چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گیا۔ منسٹر بن گیا ہے۔ اب کیا کر رہا ہے؟“

”اومارائے کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کے بھائی کی کوئی بہت بڑی بزنس ہے۔ روناں ایک فرم کے جنرل منیجر ہو گئے ہیں۔ میں اپنے چھوٹے بھائی کھوکھو کے ہاں ٹھہری تھی۔ اس نے لن کو فون کر کے سیر آنے کی خبر دی۔ خود ملنے نہیں آئے۔ اپنی کار بھیج دی۔ میں، کھوکھو اور اس کی بیوی اومارائے کے علی۔ روڈ گئے۔ کوٹھی کی دوسری منزل میں اومارائے خود رہتی ہیں۔ نیچے ایک دنگ میں ریحان اور ان بیوی اور لڑکا۔ چند روز ہوئے لڑکا گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اومادیدی کے بھائی نرملیندورائے نے اب شادی نہیں کی۔ چوبیس گھنٹے شراب میں غرق نکال کلب میں بیٹھا رہتا ہے۔ سارا کاروبار ریحان ہاتھ میں ہے۔ سناہتے چند ماہ کے لئے منسٹر بنے تھے نرملیندو اور اومارائے کے اس کاروبار کو۔۔۔ فائدہ پہنچایا تھا۔ اس وجہ سے وہ لوگ ان کے اور زیادہ احسان مند ہیں۔ ریحان صاحب اپنے تے لڑکے کے متعلق بہت پریشان تھے۔ مجھ سے کہتے لگے باغی ہو کر گھر سے نکل گیا۔ تیرہ سال لڑیں۔ ابھی سے شاعری کرتا ہے۔ بھوکھی بیڑھی کا ہمدرد شاعر۔“

نواب دسترالزماں نے جو سر آگے بڑھائے بغور سن رہے تھے۔ یک لخت ایک تلخ قبچقہ بلند۔ لوگوں نے اچھی سے انہیں دیکھا۔ انجم آزاد اور اختر آرا کی موت کے بعد آج وہ پہلی بار بیٹھے تھے

بنگال کے ایک قدیم کوی ابھی نندنے کہا تھا "تالاب کنول سے بھر گئے بہار میں مکھیاں آم
بور پر جمع ہیں۔ مسافت چھوٹی ہو تب بھی، ہوا جب گاڑی کے راستے میں رقص کرتی ہے، غریب اوطن
دل دکھ سے بھر جاتا ہے۔" اور دھکا کہ سے پورٹ آف اسپن کا راستہ بہت طویل تھا۔ واپس جانے سے
قبل اس آخری غم وہ سنگ مرخ کے تالاب کے کنارے پرانے "راج سنگھاسن" پر ٹھہری جہاں
سے باتیں کرتی رہی۔ اس نقلی شاہی تخت پر لڑکپن میں یہ لوگ اسی طرح بیٹھا کرتی تھیں۔

معاً جہاں آرا نے پوچھا: "ریحان بھائی کی دہن کیسی ہیں؟ کون لوگ ہیں؟"

"عام سی گھڑی بی بی ہیں۔" دیپالی نے جواب دیا۔ "غریب شریف گھرانے کی لڑکی۔ بتا رہی ہے۔"

اوما رائے کے بھائی نرملیندر رائے نشے میں نین کا دھلا سہ سے تھے۔ گارڈن ریچ میں ان زہرو بی بی کے با
ان کی کار کے نیچے دب کر مر گئے۔ وہ ایک غریب کاریگر تھے۔ زردوز۔ جن کے دادا کھنڈو سے کلکتے آ گئے۔

تھے۔ اوما دیدی نے تنگم کر کے بھائی کو پولیس پھیری سے بچالیا۔ متوفی کی ایک ہی لڑکی تھی۔ ماں مر چکی
بھائی ادارہ نکل گئے تھے۔ اوما رائے بطور تیلانی اس تیم بے سہارا لڑکی کو اپنے ہاں اپنی نئی کوٹھی میں۔

آئیں۔ اپنے دارڈروب کی دیکھ بھالی اس کے سپرد کر دی۔ رہنے کے لئے ایک کوچھری دیدی۔ زردوز
لڑکی سینے پر رونے میں غاق سلیقہ مند۔ احساس کمتری کی شکار۔ ریحان صاحب جو حسب معمول اوما

کے ہاں آتے رہتے تھے انہیں یہ لڑکی بھاگتی۔ یہ پارٹیشن کے ڈھانگی تین سال بعد کی بات ہے۔ ریحان صاحب
کے دل میں جانے کیا نیکی آئی ایک دن اس بے چاری منظلوم لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔ اوما اس کے ساتھ

بڑی ساس نند کا سا برتاؤ کرتی ہیں۔ وہ خاموش رہتی ہے۔ ریحان بھی اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیتے
"اوما رائے کا ایک دلچسپ مشغلہ زہرہ نے بتایا۔ دائم المرنجیں ہیں۔ سیاست سے کب کی کن رہ کٹر

ہو چکی ہیں۔ صبح سویرے اٹھ کر نزدیک بیلوڈ پر چلی جاتی ہیں۔ ایک ملازم چھچھڑوں اور ہڈیوں کا برتن۔
کر پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ سڑک اور باغ کے سائے آوارہ ملیوں اور کتوں کو ناشتہ کراتی پھرتی ہیں۔ پھر کوڈ

کوڈانہ ڈالتی ہیں۔ گھر واپس آ کر ریحان کی بیوی سے جمائیں جمائیں کرتی ہیں۔ ریحان عموماً گھر سے باہر رہتے ہو
واٹ لے لائف۔"

جہاں آرا نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور اٹھ کر مغرب کی نماز کے لئے اند چلی گئی۔ باورچی خانے کی
طرف سے رابعہ آتی نظر آئی۔ ریحان کی چھوٹی بہن رابعہ جو اکمل کی شادی کے لئے اپنے گھر عظیم پورے سے

دز کے لئے ارجبند منزل آئی ہوئی تھی۔ وہ راج سنگھاسن کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ شفق رنگ پر نظر ڈالی اور کہا۔ ”میں بھی نماز پڑھ آؤں۔ ناقرہ کو تمہارے پاس بھجتی ہوں۔“
 ”ناقرہ نماز نہیں پڑھتی۔“ ”دیپالی نے پوچھا۔

”نماز۔۔۔ وہ خدا ہی کو نہیں مانتی۔ وہ اپنے ماموں پر پڑی ہے۔ اللہ کی شان ہے۔ مولانا الدین احمد کامیٹا اور نواسی دونوں ملکر۔“ رابعہ نے جواب دیا اور تیز چلتی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔ چند منٹ بعد اس کی لڑکی ناقرہ نجم السحر ارجبند منزل سے باہر آکر ”راج سنگھاسن“ پر ہلک گئی۔ حساس، ذہین چہرے والی بیسٹ مال لڑکی تھی۔ اور ایک جوشیلی اسٹوڈنٹ لیڈر۔ لگ بھگ اسی نے انقلابی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ دیپالی نے سوچا۔ پچھلے ایک ہفتے میں دیپالی کی مہر مت دوستی ہو گئی تھی۔ ناقرہ سے ایسٹ پاکستان کی پیچیدہ سیاست کے قصے سناتی رہی تھی۔ مولانا فی کی عوامی لیگ۔ بالیسال اور کھلنا کے قوط۔ جیسو رکی زرعی تہا کا خریک۔ پولس فائرنگ۔ کابجی ٹیشن۔ پولس فائرنگ۔ مظاہرے۔ آدم جی جوٹ مل کا فساد۔ عوامی محاذ۔ حیل یا ترائیں۔ بنگال۔ ست کا پرانا نقشہ۔ ادھر مغربی بنگال میں بھی تقریباً ہی سب ہو رہا تھا۔

”میں تمہارے ماموں کے متعلق تمہاری جہاں آرا راجا کو بتا رہی تھی۔“ دیپالی نے کہا۔

”مجھ ان کے متعلق سب معلوم ہے۔“ ناقرہ نے ناگواری سے جواب دیا۔ ”امی اپنے بھائی کو ہمیشہ میڈیا لائز کرتی رہی ہیں۔ اور جہاں آرا راجا بھی۔ اور شاید۔۔۔ اور شاید۔۔۔ آپ بھی مگر ہم لوگ آپ سے زیادہ تیز فہم ہیں۔ ہم کھرا کھوٹا سچا جان لیتے ہیں۔ ماموں جانا۔ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش دادی۔ محترم نخل گڈول۔ آج پراگ میں ہیں۔ کل قاہرہ۔ برسوں نیویارک۔ آج اس پوٹیشن پارٹی میں ہیں کل اس جہاں منسٹر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں، ادھر کوڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ۔
 فیروز آبادی اسے کہتے ہیں۔“

”ناقرہ۔۔۔“ دیپالی نے رسائیت سے کہا۔ ”کل کے باغی آج کے ایسٹاٹمنٹ میں شامل ہو چکے۔ تم آج کی باغی ہو۔ ممکن ہے تم کل کے ایسٹاٹمنٹ میں شامل ہو جاؤ۔“
 ناقرہ نجم السحر استہزائے ساتھ ہنسی۔

”دیپالی آٹھی۔۔۔ معاف کیجئے گا آپ عمر کی اس ایٹیج پر سنج چکی ہیں جہاں انسان

کو ایک دفاعی ہتھیار۔ ایک تڑپ بکتر کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔
دیپالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا: ”ناصرہ ڈیر۔ تم نے ایس ان ونڈر لینڈ پڑھی ہے۔“
کی وہ نظم یاد ہے۔

YOU ARE OLD FATHER
WILLIAM, THE
YOUNG MAN SAID
AND YOUR HAIR HAS
BECOME VERY
WHITE
AND YET YOU INCESSANTLY
STAND ON YOUR
HEAD—
DO YOU THINK, AT
YOUR AGE
IT IS RIGHT?

ناصرہ بھی ہنسنے لگی۔ اور بولی۔ ”یہ بات تو آپ کے پنڈت نہرو سے کہنی چاہئے“
ملا اندر سے تہہ کی ٹرے لے کر آئی اور اسے تخت پر رکھ دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد
دیپالی نے کہا۔ ”ناصرہ۔ تم جہاں آرار سے ملتی رہا کرو۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ وہ بید تھا ہے۔ نیر الزما
کی بیوی سے اس کی نہیں بنتی۔ دیناج پودرا اپنی سسرال میں اب وہ رہنا نہیں چاہتی۔ ماں مر گئیں۔ دو جوا
بہنوں کی خوفناک موت کا غم سہہ چکی ہے۔ باپ چراغ سحری ہیں۔ اور وہ ان سے ہمیشہ سے مخالف رہ
ہے۔ شوہر مر گیا۔ جیسا کچھ بھی تھا۔ اب لڑکے نے اپنا گھر بسایا۔ وہ کتنی اکیلی ہے۔“
”ہوں گی۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اگلے مجھ سے شادی کرنا چاہتے
تھا؟ مجھے بھی وہ بید رہتا تھا۔ مگر میرے باپ معمولی آدمی ہیں۔ کلاس ٹو انسر۔ ہم لوگ عظیم لوگوں

جانے والا تھا۔ وہ پشاور اور فورس اسٹیشن میں تعینات تھا۔ اپنی کرن ناصرہ کی طرح وہ بھی بڑا شدید قوت
پاکستانی تھا۔ پاکستان کی دفاعی سرروسز کا ایک فرض شناس جو شایلا، محب وطن ہو ابا ز۔

۳۷ شکری کا ناچ

نئی دہلی
۳ اکتوبر ۱۹۶۵ء

مائی ڈیر دیپالی

تمہارا خط آیا تھا۔ جلد جواب نہ دے سکی۔ اپنی شدید پریشانیوں اور فکروں میں مبتلا تھی۔ میرا
کمبل اب فوج میں لفٹ ہے۔ وہ محاذ پر لڑ رہا تھا۔ خدا باپ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ خیریت سے گ
آگیا۔ مگر ایک بری خبر سناتی ہوں۔ جہاں آرار کا بیٹا اکمل جموں پر میاری کرتے ہوئے مارا گیا
یہ خبر مجھے بالکل اتفاقیہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ سکتی ہوں کہ جہاں آرار بے چاری کا کیا حال ہوگا۔
اس بے چاری کی شادی میں شرکت کے لئے پچھلے سال ہی وطن آئی تھیں۔

جب کس اور اکمل پیدا ہوئے ہیں تو یاد نہیں کس نے یا تم نے یا میرے شوہر نے کہا تھا کہ
کے پہلے ا (جدا) لگانے سے اس لفظ کی ضد بن جاتی ہے۔ سچ یہ نام ہی منحوس نکلا۔

موجودہ صورت حال میں جہاں آرار کو تعزیت کا خط لکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا قیامت ہے
اور جہاں آرار میگور کا "شکری ناچے" اتنی گنجینہ نیل اومبرے ڈمر و باجے "بہت گایا کرتی تھیں۔
بے چارہ اکمل مرشدزادہ نیل اومبر میں ڈمر و جانے گیا اور اس کے اپنے پر نچے اڑ گئے۔ ہندوستان اور پاک
کی سرحد پر تمہاری شکری زوروں میں ناچ گئی۔ تم وہاں آرام سے بیٹھی ہو۔ خوش قسمت ہو۔ پچ و دوڑ
پیرسٹر صاحب کو سلام۔

تمہاری

رہزی

۳۸ گڈلک ڈائری

۱۶ اپریل ۱۹۶۶ء - ۱۷ اپریل ۱۹۶۶ء - ۱۹ رمضان ۱۳۸۶ھ - ۱۸ اپریل ۲۰۲۳ء

نام: یاسمین بلونٹ

دفتر کا پتہ:-

گھر کا پتہ:-

ٹیلیفون نمبر:-

کار نمبر:-

ڈرائیونگ لائسنس نمبر:-

ٹی۔وی۔ لائسنس نمبر:-

بینک اکاؤنٹ نمبر:-

پاسپورٹ نمبر:-

لائف انشورنس پالیسی:-

بلڈ گروپ:-

عینک نمبر:-

آج سال نو ہے۔ اللہ کا نام لے کر اس نئی نویلی ڈائری کو شروع کرتی ہوں۔ جوڑھا کر سے کوئی آنے
مجھے لے گیا ہے۔ نام ہے "گڈلک ڈائری" اس میں میں لکھ رہی ہوں۔ لہذا اس کا نام "گڈلک ڈائری"
چاہئے۔ توبہ۔ توبہ۔ یا اللہ میں تیری ناشکری نہیں کرتی۔ ہزاروں سے اچھی ہوں۔ توبہ۔ توبہ۔ اللہ
نکرنا۔ اللہ تجھ پر میرا سارا حال روشن ہے۔ میرے گناہوں کو معاف کرنا۔ تو مفور و رحیم ہے۔ میں نے
افرائیاں کیں۔ اپنے حافظ قرآن مولوی باپ کو صدمہ پہنچایا۔ اسٹیج پر ناچی گاٹی۔ مشرک سے بیاہ گیا۔
حاضر نکاح ہی نہ تھا۔ بیٹی کو عیسائی بنوا دیا۔ اللہ میں تیرے غضب کے خوف سے تھر تھر کاہتی ہوں۔

مجھے مذاقِ قبر سے بچاؤ۔ اللہ تجھے اپنے حبیب کا واسطہ۔

آج صاف نو ہے۔ میں نے سینئر مسز بلونٹ کو ٹرانک کال کی تھی کہ نئے سال کی مبارکباد اپنی بیٹی
دون۔ معلوم ہوا دادی پوتی دونوں ماس کے لئے چرچ گئی ہوئی ہیں۔ اللہ مجھے معاف کرنا۔ اللہ میں اپنے حال
اپنی مجبور یوں کا شکار تھی۔ اللہ تو میرے سب مصائب یا مجبور یوں سے واقف ہے۔ پھر کبھی مجھے
زرے گا ؟

ڈیر ڈائری۔ اس ملک کی عورتوں کے سبھی خون سفید ہیں۔ شہر زاد بیمار پڑی ہے۔ بڑھیا مسز
نے اسے ہسپتال میں ڈال دیا اسے دیکھنے بھی نہیں جاتی۔ وہ گاؤں یہاں سے اتنی زور ہے۔ صبح کو ٹرین سے وہ
رات کو ٹھکان سے چور ٹرین سے لوٹو۔ صبح سویرے پھر فیکٹری وقت پر پہنچو۔ یہ لے کیسی مسلسل محنت، جا
کی زندگی کب تک چلے گی۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے تمہارا دل کمزور ہے۔ ڈانس کرنا بالکل چھوڑ دو۔ میری بیٹی
شہر زاد جس کا اب پورا نام شہر زاد کرستینا جو ز فین بلونٹ ہے۔ مجھ سے کہتی ہے۔ اس کے دین میں احساسِ جز
و احساسِ گناہ کی شدت ہی بخشش کا باعث بنتی ہے۔ بہت سے راہب اپنی پیٹھ پر خود کو ڈرے لگا
یں۔ تو کوٹے تو مجھے زندگی ہی لگا رہی ہے۔ اللہ میرے عیوب سے چشم پوشی کرے۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ پرموں شام میں شیریں کو دیکھ کر ہسپتال سے باہر آئی۔ گاؤں کی خاموشی
سڑک شدید بارش میں نظروں سے اچھل ہو چکی تھی میں بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔ شیریں مجھ سے بہ
نکھائی سے پیش آئی تھی۔ شاید اس کی دادی نہیں چاہتی کہ میں اس سے زیادہ لمبوں جلوں۔ شہر زاد ابھی ٹانگا
برابر چھو کر رہے مگر اپنے باپ کی طرح بے رحم اور کائنیاں اور دادی کی طرح سرد مزاج۔ وہ شاید یہ بھی نہیں
چاہتی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کی ماں لیب کالی عودت ہے۔ اس کا اپنا رنگ سفید ہے۔ سبز آنکھیں۔
چو کلیٹ بال۔ اپنے حسین و جمیل باپ پر گئے ہے۔ وہ اپنے آپ کو دو غلام ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ آج وہ مجھے
صاف صاف کہہ رہی تھی۔ "مئی تم بار بار ہر ہفتے مجھے دیکھنے اتنی درد سے کیوں آتی ہو۔ مت آیا کرو۔ میں آتی
ہوں۔" میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں باہر کر سنسان بس اسٹاپ پر کوچ کا انتظار کر رہی تھی۔ مینہ زیادہ تیزی سے آ
لگا۔ بارش کے نظروں اور میرے آنسوؤں نے میرا چہرہ بھگو دیا تھا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے۔ اللہ اللہ کہتے ہوئے میں چہرے پر اڑھٹ کر کے ذرا پیچھے اس اجنبی نے مجھے اللہ اللہ کہتے سن لیا۔ اُردو میں بڑے ہمدردی کے ساتھ دیاقت کیا۔ کیا آپ کا کوئی اس ہسپتال میں ہے؟

میں نے جھجک کر اس کی صورت پر نظر ڈالی گورا چٹا، لمبا تھکا۔ چخابی یا پٹھان۔ خاصا خوش شکل برساتی ہے۔ وہ بھی اسی کوچ کا منتظر تھا۔ اس کے درد مند لہجے کے یہ دو بول سن کر میں جو اس وقت اس لمحے اس اتنی دنیا میں خود کو بالکل تنہا اور بے سہارا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہی تھی مجھے ایسا لگا جیسے تاریک طوفانی کی لہروں پر ایک روشن محفوظ ٹوکا اچانک نمودار ہو گئی۔ میں نے مومنیت کے ساتھ اُسے جواب دیا۔ میری ہسپتال میں ہے۔ اچھی ہے۔ اگلے ہفتے اُسے ڈسچارج کر دیں گے۔

تو پھر میں اس بڑی طرح بلک بلک کر رُد کیوں رہی تھی۔ اس نے وجہ نہ پوچھی۔ روشن کوچ سلیٹی رول میں سے نمودار ہوئی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راستے میں اس نے بتایا بیڈ فرڈ سے آرہا یہاں پہنچ کر اس کی کار خراب ہو گئی۔ اُسے ایک گیراج میں چھوڑا بس پڑوکر شہر جارہا ہے۔ آبائی وطن۔ یہاں لاکھور سے آیا ہے۔ بزنس کرتا ہے۔ باتوں سے اعلیٰ تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا آپ ہیں۔ مگر اردو اتنی صاف کیسے بولتی ہیں اور وہ بھی پنجابی لہجے میں۔ میں نے بتایا میں برسوں سے لندن کی ایک لارنٹ فیکٹری میں مزدوری کر رہی ہوں جہاں میری ساتھ دایاں سب پنجابی عورتیں ہیں۔ جی ہاں۔ میں ہوں لیکن ہول سیل قمیض سیتی ہوں۔ ناکام ڈانسر۔

ڈیر گڈ لک ڈانری۔ آج شام میں اور مقبول دیر تک ہمیشہ کورٹ کے باغات میں ٹہلتے رہے۔ اٹھا عنقریب بارنزمیں ایک شہت بڑا مکان خریدنے والا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ۔ مگر کو اشارہ کافی ہے۔

مقبول کہتا ہے میں فیکٹری میں مزدوری کرنا چھوڑ دوں اور اس کی فرم میں کام کروں۔ چار گنی زیادہ تنخواہ لے کیوں دل گوارا نہیں کرتا۔ میں اس کی احسان مند نہیں ہونا چاہتی۔ ابھی وہ میری بہت عزت کرتا ہے بہت ذمے دہ ہے۔ پھر میں اس کی خازم ہوجائوں گی اور وہ میرا آقا۔ نہیں۔ یہ بات غلط ہوگی۔ جہاں اللہ؟

اُو مجھے صراطِ مستقیم پر چلائے جائیو۔ آمین۔

جب شہزاد چھوٹی سی تھی۔ میں اور حیرلہ جیلسی کی ایک میوزیم رہتے تھے۔ ٹیلی ویژن پر ایک دیکھا تھا۔ AUTUMN CROCUS ایک مزید اسکول ٹیچر جس کی زندگی میں کوئی رنگ اسپنسر۔ کم مایہ۔ وہ پیسہ جوڑ کر تھقی گزارنے سوئیٹر زلیٹڈ جاتی ہے۔ وہاں سے ایک بڑا ڈاؤنر سا شخ ملتا ہے۔ نہایت اداس۔ ہلکا پھلکا غناک سا روٹا اس۔ چھٹیاں ختم ہوتی ہیں۔ وہ آدمی اپنے ملک چلا ہے۔ اسکول ٹیچر اپنی اجاڑ زندگی میں واپس انگلستان آجاتی ہے۔

بڑھیا مسز بلونٹ نے آج تک مجھے اپنے گھر نہیں بلایا۔ حرامزادی۔

شہزادہ کبھی ہے بہت خوبصورت دو منزلہ مکان ہے۔ بہت بڑا باغ۔ بڑھیا اپنی جوانی میں دنڈرا میں بھی ناچ چکی ہے۔ بہت دولت مند ہے۔ شیری اسی لڑے اس کی خوشامد میں لگی رہتی ہے۔ اور کوئی رشتہ دار نہیں۔ بڑھیا اپنے اکلوتے لڑکے حیرلہ کو معاق کر چکی ہے۔ شہزاد نے آج تک مجھے کوئی معمولی سا تحفہ خرید کر نہیں دیا۔ ہاں پھلی کر مس پر ایک سینڈ بیگ لے آئی تھی۔ سال میں ایک دو بار مجھ سے مل لیتے۔ خیر خدا سے خوش رکھے۔ آبا بچھے ماق کر چکے ہیں۔ دوسرے رشتہ داروں نے مجھے بھلا دیا۔ شاید وہ میرا ذکر بھی کرتے ہوں گے تو اس طرح کہ چل پائے گوری کے مولویوں کے خاندان کی لڑکی اور ادارہ نکل خاندان کی ناک کٹا دی۔ خیر میرا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میرے ہم وطن جب کبھی یہاں ملتے ہیں خصوصاً ڈھاکہ کے والے بڑے جوش سے کہتے ہیں۔ کراچی آجائے۔ آپ کے لئے حکومت ڈانس ایکڑ می بنا رہے گی۔ جب نے اس کے لئے خط و کتابت شروع کی۔ وہاں سے کوئی جواب ہی نہ آیا۔ میں بہت کمزور، بہت غیر اہم معمولی ہستی ہوں۔ کون میری سنے گا۔ وہ تو بالکل شروع شروع کی بات تھی۔ ایک بنگالی منسٹر کو خوش کرنا تھا جس کی سفارش پر حکومت نے میرے فارن ٹور کا بند بٹ کر دیا تھا۔ اس کے بعد میں ٹا۔ ڈیر ڈائری۔ دنیا بہت ہی ذلیل کہنی جگہ ہے۔ منسٹر ریحان الدین احمد کا رعیت دیکھا؟

فیکری میں میرے ساتھ کی دو بنگالی لڑکیاں بہت اچھی سنگرز ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے نو

مرنے نے مینوں ہشک نہ ملاں
مینوں مرن دا شوق مٹا دن دے
کجری بیاناں میری عورت نہ گھندی
میوں بچ کے یارہ مناداں دے

لاہی میں بندر روڈ کے جگمگاتے اونچے فلیٹوں کے نیچے رات کے وقت ایک اندھا فقیر سر پر گول ٹوپی۔
نا انگلی تھامے آنکلتا۔ اور منہ اٹھا کر چلاتا۔ اے گم کے مارو۔ خدا تمہارا گم دشتہ کرے۔ اوندہ دستہ؟
یا دلہ روز آواز میں گانے گھتا۔ دھسی حال کی جب ہیں اپنی خبر۔ رہے دیکھتے اھوں کے غیب و ہجر
یوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی بڑا دریا

۱۳۔ جولائی ۱۹۶۷ء ۲۱۔ ایشیائی ۱۳۸۷ھ ۱۵۔ سادوں ۲۰۲۴

۱۳۷۷

لک ڈائری۔ اس برس کے بھی سات مہینے نکل گئے۔ اور ایک اکیلا تنہا انسان اوداتے سائے
سا گھیرا ہوا ہے۔ کیوں؟ مسیحی۔ اسلامی۔ جنگالی۔ بکری۔ اور شاید ایرانیوں کا ایک اور کیلنڈر
اس ڈائری کے چھاپنے والوں نے ایرانی کیلنڈر بھی کیوں نہ شامل کر دیا۔ ذرا وقت کا کنفیوژن

ی رے۔ اور رنگین کشتی والے طراح۔ کستی موٹے۔ اس گھاٹ سے لگا دے۔ یہ ندی کرتیک
گی۔ اس ناؤ کو کب تک کھینا ہے۔ کس دھن میں شام سویرے کس دھن میں چلا جا تا ہے۔ تیرے
بچے ہیں۔ بھائی مانجھی۔ کیا اس دہیا کا کوئی انتہ نہیں۔ اس کا کوئی سرا نہیں اوانجھی رے۔

مانجھی سے بھائی۔ اب ہاتھ تھک گئے۔ کستی کھینے کی اب سکت نہیں میں نے دریا کے مخالف

ممت بھی چتوہ چلائے۔ پر اب ہمت نہیں۔ ادا نہیں رہے۔

یہ سارے ہیشیالی گیت بار بار یاد آتے ہیں میرے دکھی مظلوم خوبصورت دلہن کے ملاحو
لدوز گیت۔ کیا میں کبھی واپس جاسکوں گی؟

آج میں نے دیپالی کو خط لکھا۔

ردزی۔ اپنے میاں اور چاروں بچوں کے ساتھ مغرب کی سیاحت پر نکلی ہے۔ کیا؟
میں نے اسے نہیں بتایا کہاں رہتی ہوں۔ کیا کرتی ہوں۔ شام کو ان کے ساتھ جا کر پکپکٹی میں کھانا
لاھا اور پرانے دنوں کا ذکر نکلا جب ردزی اور دیپالی انڈرگرؤنڈ الفتلابی درکرز تھیں۔ ردزی
ساتھ ان کے ہمدردستانی میزبان کے لڑکے لوکیاں بھی تھے۔ میں نے ذکر کیا اسکول میں ہم دو
تھی کر پتی تھیں۔ کلینڈت اور کنکے لڑکا کی طرح کی ہیروئن نہیں تو ردزی کے میزبان کی لڑکی نے
یہ لوگ آپ کے زمانے کی فلم اسٹار تھیں؟

”کافکا کہتا ہے کہ بعض الفاظ کا مطلب محض اپنے زخموں کے ذریعے ہی سمجھ میں آتا۔
نے بھی لسا ہی بولا۔“

”اوہ گوڈ۔ کیپ کو آرٹ یا سمین یو آر کریزی۔ ڈونٹ ڈسٹرب می۔ میں اپنی کپنی کے کاغذ
”جھن جھن جھن۔ اچھا۔ سنو۔ ایک پولش رائیٹر نے کہا۔“
”ہیں۔ تمہارے پھر ناچ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر نے تم کو منہ کیا ہے۔“
”میںوں حج کے یار منا اولی دے۔ ۱۱۱۔“
”فور گوڈز سیک۔ گھنگر و اتارو۔ ڈاکٹر کا حکم مانو۔“

منو پولش رائیٹر نے کہا ہے۔ انسان کی روح جو سمات تالوں میں بند ہے اس میں
گیرش۔۔۔ بتاؤں۔ سن رہے ہو۔۔۔“

”بکو۔“

”ایک پوشیدہ گوشہ ہے۔ جس کو صرف مصائب کی کنجی ہی کھول سکتی ہے۔ اور اس گہرے میں
ت اور افضل ترین نہم اور ادراک چھپا ہوا ہے۔ اور مقبول ایک جگہ میں نے لکھا دیکھا ہے کہ جب
بھی میں نے خدا کو دیکھا۔“

”اور بکو۔“

”اور جب ہم اپنی مسرت کے باہے میں سوچتے ہیں اس وقت ہمارا تخیل بچے کے تخیل کی طرح
ور معصوم ہوتا ہے۔ اور یہ بھی کہ ہم حسن در بچے میں کھڑے ہوتے اس کے سامنے کا منظر تازہ
ہوتا۔“

”اور شیگور ایسا بول گیا ہے کہ یاد مندر کی وہ پکارن ہے جو حال کمار کر اس کا دل مردہ باطن کے سامنے
رہتا ہے۔“

”اور کیا کیا بول گیا ہے، تمہارے شیگور نے ناگ میں دم کر رکھا ہے۔“
”چھن چھن چھن۔“

جو پیرادے سو ہی پہنوں

جو دے سو ہی کھاؤں۔

جہاں بھادے تاں ہی بیٹھوں۔

سے یو لومی۔ میں نے التجا کی۔

”آئی لویو“ اس نے جواب دیا۔

مقبول اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھڑی دیکھی اور کہا اسے مزدوری کام سے جا ملے۔ خدا حافظ
باہر گیا کار میں بیٹھا اور چلا گیا۔ مقبول ایک سیلف میڈ سجدہ و لٹمنڈ کاروباری ہے اور عواماً سیلف
ایسا ب لوگ خود غرض ایگو سنٹرک اور خود پسند اور مغرور ہوتے ہیں۔ وہ بھی ایگو سنٹرک، خود پسند اور مغرور
مگر بہت سی چیزوں میں اصول پرست اور راست باز۔

وہ اپنی ایک کتاب میرے کمرے میں بھول گیا تھا۔ میں نے کتاب اٹھائی کہ سنہاں کر رکھ دوں جب دوبارہ
سے دوں گی۔ کتاب میں سے ایک کھٹا خط سرک کر نیچے گر گیا۔ ننانا کچی اردو تحریر۔

ڈیر میڈلک ڈائری میں نے وہ خط پڑھا:

میرے پیارے خاندانہ عالی جناب خان مقبول احمد خان صاحب۔ کینز دست بستہ آداب بجالا ہے اور عرض کرتی ہے کہ واضح ہو کہ نیا رڈ روموصول ہوا۔ میں خیریت سے ہوں۔ بچے بھی خیریت سے اور آپ کو یاد کرتے ہیں گے۔ دیگر یہ کہ آپ کو ولایت گئے بہت برس ہو گئے۔ اب اگر اپنی پیاری دکھا جائے یا ہم لوگوں کو وہاں جلد از جلد کر کے بلا لیجئے۔ اپنی ہیلٹھ کا خیال رکھیں۔ مکرمہ ساس صاحبہ مکرمہ سسر صاحب آپ کو ماکھواتے ہیں۔ پیاری شہد شاہدہ خاتون سلام عرض کرتی ہے۔ باقی ہر دم آپ کرنے والی

ناچیز زوجہ میمونہ سلطان

آج تاریخ 9 ستمبر بمقام لاہور دست پوسٹ کیا۔

اصول پرست راستباز خان مقبول احمد خان صاحب۔ عالی جناب خان صاحب۔ تم بھی

ہر اکتوبر۔ گہری رات۔ اٹو کی آنکھ۔ بلی کی آنکھ۔ چیتے کی آنکھ۔ برہن کی آنکھ۔ خاموشی سوہمی درز خزاں ایک ایسی کمرور بے بس عورت ہے جس کا آدمی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔ میمونہ سلطان خزانہ ہری تھی کایا جانے کس کا دلاری کا ایک بہت پرانا ناگھسا پٹا رڈ روم بند منزل میں موجود تھا۔ اور جہاں آراء آپا اسے اکثر بجا یا کرتی تھیں۔ جل جانے دو۔ جل جانے دو اس دنیا کو۔ یاں کوئی کہہ کا یا نہیں۔

تم بھی غم مت کرو میمونہ سلطان۔ اسے گم کے مارو گم مت کرو۔

ڈیر ڈائری۔ میں نے ابھی ابھی طے کیا ہے۔ کل کارمنٹ فیکٹری کے سالانہ جلسے میں خوب ناچا

WHAT THE BLOODY HELL

گی۔

ڈیر ڈائری۔ تم تو وہی سن سرسٹھ کی پرانی ڈائری ہو۔ آج میں نے لستے برسوں بعد ہماری کے پچھلے خانے

ن تم کو پڑایا یا سہراکتوبر کے بعد سارے درق ساھے۔ کیا ہوا تھا ہارٹ اٹیک۔ طویل بیماری پھر DOLE
رہینا۔ شہزادہ موڈ لنگ کر رہا ہے۔ کبھی دیکھنے بھی نہیں آتی۔ روزی، دیپالی کسی کو میں خط نہیں لکھتی
یا لکھوں اپنی ساس کا سر؛ مقبول نے اچانک مناجلنا چھوڑ دیا۔ ایک دائم المریض عورت کے ساتھ کو
نہ وقت خراب کہے۔ سنا ہے ایک حسین انگریز لڑکی اس کے ساتھ رہتی ہے۔

اورد جب تم گئے تو میں نے دیکھا کہ خدا کے پاؤں کے نشان فرش پر بنے تھے۔ جیگور نے کہا تھا۔ ہا ہا ہا
یرفنی۔

BUT WHEN THE NIGHT IS
ON THE HILLS, AND THE
GREAT VOICES
ROLL IN FROM THE SEA,
BY STARLIGHT AND BY
CANDLELIGHT HE COMES
BACK TO ME

دھت -

نادر دام تانا دی رے نا۔ نادر دام تانا دی رے نا۔
شیرازی کا باب جیرلڈ بلونٹ ایک GAY LIB رسالے کا اسٹنٹ اڈیٹر ہو گیا ہے۔ سنا
ہے اب ایک جرمن لڑکا اس کے ساتھ رہتا ہے۔ زندگی بڑی ڈرائی چیز ہے۔ بھیانک۔

ڈیر گڈ لک ڈائری۔ آج صبح برسوں بعد مقبول نے فون کیا۔ بڑی درد مندی سے کہا اگر مجھے ملازمت
کی ضرورت ہو۔ سیمبرگ میں اپنی برانچ میں ہکا پھلکا ریپیشنٹ کا کام دیدے گا۔ جس میں مجھے محنت کرنی پڑے
میں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کیا۔

ڈیر بیڈ لک ڈائری۔ آج میں خود مقبول کے دفتر گئی تھی۔ دقت مفرد انسانوں کو بھکاری بنا دیتا ہے۔ میں نے

اس سے کہا مجھے وہ جرمی والی نوکری دیدے۔ بڑے اخلاق سے ملا۔ میرے متعلق خاصا متحکمہ نظر آتا تھا۔
پینے سے انشاء اللہ میں ہمہ گم میں کام شروع کر دوں گی بشہر نادلا پتہ ہے۔ شاید امریکہ چلی گئی۔ باہر برون ہو
کی طرح گر رہی ہے۔ برسوں کر سمس ہے۔ میرے ساتھ کر سمس منانے والا کون ہے۔ چچا سارتر نے سچ کہا
ہے۔ جنہم دوسرے لوگ ہیں HELL IS OTHER PEOPLE

کرشن چیر ڈھی میں۔ اندھیری رات میں ایک بار میں دیپالی کے ساتھ پد پڑ گئی تھی۔ وہاں دیپالی
نے ہم سب کے نام کے چراغ جلا کر تپوں کی کشتیاں بنا کر ان میں رکھے تھے اور ان کو پانی میں چھوڑ دیا تھا۔ وہ
چراغ پانی پر بہتے کچھ دور جا کر گھب اندھیرے میں کھو گئے تھے۔

ریحان الدین احمد سنا ہے۔ کلکتہ سے ڈھاکے واپس چلے گئے۔ انڈیا میں داں زیادہ نہیں گئی۔
اب واپس ڈھاکہ میں بھی منسٹر نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دینا۔ لوگ پرسنٹی پیسج کی بات کرتے ہیں۔

”اور میں تو ایسی رخصت تھی کہ تپوں بلیدوں لے عقل چڑیوں تک کی دلازاری نہ کرتی تھی۔ لوگوں
نے مجھے اتنے دکھ کیوں دیئے؟“

“MUSIC IN WHERE YOU HEAR IT”

گارمنٹ فیکٹری میں میری سبھی رشتی کارمنجیت کو ر بڑے جذبے سے گایا کرتی تھی۔ آگ بار جو تری
در آوے۔ وہ بھوساگر توں تر جاوے۔ جن آجا عشاق والیا
جانے وہ ہے کبھی کہ نہیں۔ اب ذرا ذرا شبہ ہو چلا ہے

“LOVE IS THE STATE
OF TOTAL SECURITY
NON-LOVE IS THE
STATE OF TOTAL ABSENCE”

ڈیر گڈلک ڈائری۔ کل مقبول آیا تھا بہت دیر بیٹھا۔ کہنے لگا۔ میجر سلطان پیدائشی IMBEC ہے۔ چچا کی لڑکی تھی اس لئے نو عمری میں اس سے شادی کر دی گئی تھی۔ اسی وجہ سے اس کے ساتھ کبھی زیادہ نہیں رہا۔ اب تک وہ اپنی بزنس پھیلانے میں مصروف تھا۔ اسلام میں چار زہیں۔ کیا میں — ؟

”ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں جلد سب معاملات طے کرتا ہوں۔“

”وہ بارنزد والا مکان — — ؟“

”اس سے زیادہ بڑا اور زیادہ شاندار گروئرا سکوائر میں۔“

اس کے بعد سے وہ پھر غائب ہے۔ — — ادا مانجھی رے۔ افسوس کہ یہ ناؤ بھی۔

میجر برگ برانچ کا میجر پنجابی ہے۔ جب سے بنگلہ دیش دار چھڑی ہے کچھ طعنے دیتا رہتا ہے۔ میں چپ ہوتا ہوں۔ جواب دے کر کہاں جاؤں گی۔ زمانہ انسان کو بزدل اور نہضت پسند بھی بنا دیتا ہے۔ کل معلوم ہوا بول کی بہن ہینوئی اور دو بھائی سب کے سب دوسرے ”بہرا لویا“ کے ساتھ چٹا گانگ میں مارے گئے تھے۔ مقبول کا صدمے کی وجہ سے نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے مجھے اپنے گھروالوں کی خیریت معلوم ہیں۔ اس کا لی آندھی میں کس سے معلوم کرواؤں۔ آج صبح یہاں کے سابق مشرقی پاکستانی حال بنگلہ شیوں کا ایک گروہ میرے پاس آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں فوراً اس دفتر میں کام کرنا سوڑوں۔ کیونکہ مقبول پاکستانی ہے۔ میں نے کہا پہلے ہم ہندوؤں کے خلاف تھے۔ اس لیے پاکستان آیا۔ کیا مقبول مسلمان نہیں ہے؟ مگر وہ پاکستانی ہے۔ اور اگر میں یہاں کام کروں تو غدار۔ پھر جاؤں۔ دوسری ملازمت مجھے آسانی سے نہیں ملے گی۔ میرے پاس کوئی اکیڈمک کوالیفیکیشن نہ ہے۔ میں نے محض رقص میں بہارت حاصل کی تھی۔ میرے ہم وطن لو جھگڑ کر چلے گئے۔

آج صبح پنجابی میجر نے مجھے خود ہی فونس دیدیا۔ میں نے مقبول کو ٹرنک کال کیا۔ وہ کراچی گیا ہوا۔ اب میں پھر ڈول پر جاتی ہوں۔

ہندو بنگالیوں کے ہاں کالی اور مہادیو کا تصور لرزہ خیز ہے۔ تخریب۔ سنسٹی۔ قہر۔ بلا۔
 سینکراںدھیکار۔ خون۔ قیامت۔ دیہالی گی پھوپھی بھوتارنی دیہی چندر گنج میں بڑی عقیدت سے
 جھوم کر ایک ہندی کیرتن گاتی تھیں۔

اگر دم بگرو دم باجے ڈمو۔ ناچے سدا شو جلت گرد

برہاناچے دشنوناچے ناچے ہادیو

کھپڑے کے کالی ناچے ناچے چاروں دیو

کھپڑے کے کالی ناچے۔ کھپڑے کے کالی ناچے۔

نذر الاسلام کو کالی کے اس تصور نے کتنا فینسی نیٹ کیا تھا۔ کھپڑے کے

آتش نوانڈرل کا بنگال اس وقت آگ اور خون میں ڈوب گیا۔ یہ جملہ بھی ڈیر ڈاری ایک کلا

ن چکا ہے۔ اور کلپتے میں تبدیل ہو کر الفاظ اپنی معنویت اور اہمیت کھودیتے ہیں۔

چار سال گذر گئے۔ چار سال سے میں منتظر ہوں۔ شاید ایک دفعہ مقبول کے دل میں پھونکی آجا۔

دروہ یاد کر لے۔ لیکن اب ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ وہ خود گرد و نزا سکو اڑیں منتقل ہو چکا ہے۔ میں یہاں ا

نک میں شہرہ شہر ادنیٰ ترین نوکریاں کرتی پھر رہی ہوں۔ مزدور طبقہ کے ترکوں اور ایشیا یوں کی بھڑ میں شا

ہم وطن اعلیٰ مرتبت۔ بنگلہ دیشی یہاں ملتے ہیں کئی کترا کے نکل جاتے ہیں کہ شاید میں ان سے امداد کے لئے کہو

نیاہہ ترمئی جنریشن والے تو مجھے پہچانتے ہی نہیں۔ انہوں نے میرا نام تک نہیں سنا۔ پرانی نسل والوں کے

میں اب ایک EMBARRASSMANT ہوں۔ چند ایک نے مجھے سڑن مشہور کر دیا ہے۔ کیا واق

میرا کریگ آپ ہوتا جا رہا ہے، برتن دھو چکنے کے بعد رات گے تک، جب تک ریسٹوران خالی نہیں ہو

ایک کو نے میں تنہا بیٹھی مڑک کو تکتی، لگاتار سگریٹ پتی مغربی پوشاک میں ملبوس سائولی عورت۔ خالص

انتظار۔ کچھ نہ ہونے کا انتظار۔ کیا مقبول اب بھی سامنے مڑک کے دھند لگے میں سے نمودار ہو سکتا ہے،

ناممکن۔ اب یہ کیسے ممکن ہے۔

اسی طرح میں ایک روز ایک گوشہ میں بیٹھی سیاہ قہوہ پی رہی تھی۔ ایک خوفناک بوڑھے گلف

عرب نے دور سے مجھے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔ اس رات سے میں نے طعام خانے میں بیٹھ کر مڑک کو گنگر

رات آیتے میں مجھے اپنا عکس نظر نہیں آیا۔

گل میں فرینک فرٹ جا رہی ہوں۔

فرینک فرٹ۔ ۳۰ جنوری آج میں نے بنگلہ میں ایک ایسا سیاہ پوش FUGUE لکھا ہے کہ ارتقا
ہم دیکھ لے تو چلو بھربانی۔ INDIAN MODE PURAVI - SAD EVENING MEL. ^{ODY}
OVERTUR۔ وہ دیکھو دریا سے کہرہ اٹھا۔ غبار تاروں کا اُڑ رہا ہے۔
BAS: اکھنڈ رول کے دھند لکوں میں الم کے غمی پکارتے ہیں کہ وقت نے صرف غم دیا ہے کہ وقت
نے صرف۔ وقت نے۔

POIN۔ ہمیں یقین تھا کہ روز فردا کرن کرن دل میں آجے گا کیا کرے گا جہاں کو روشن۔
COANYERPA۔ الم کے ساتھی سیاہ کپڑوں میں، بیدلی کے غم اٹھائے یوں نوحہ زنی ہیں یہ وقت
بولا ہے آؤ۔ جھکاؤ سر، آنسوؤں کے دریغ پہاؤ یہ وادی غم ہے۔
BAS۔ جنازے واپس گھر لو کو آئے۔ جنازے واپس۔ جنازے واپس۔

بکواس۔ موربہ بکواس۔ اد۔ کے۔ میں MODE بسنت میں موسم بہار کا سیلے کر لو گوان کرتی ہوں
ہفت کرو دل سخت کرو را سی طرح زندہ رہنا ممکن۔
یہ جتنے لوگ مانتے ہیں بولتے آستہ آستہ پر اس وقت چل رہے ہیں، یہ دراصل کسی قبرستان، کسی
یوریم کی سمت قدم بڑھا رہے ہیں۔ جتنے لوگ زندہ ہیں سب POTENTIAL لاشیں ہیں۔ میرے

اس میٹے ہاؤس میں جتنے لوگ مقیم ہیں سب فانی۔

۲۴ جنوری۔ فرینک فرٹ میں کام نہیں بنا۔ واپس ہمیرگ۔

اب دریا اور سمندر برف سے ملتے ہیں۔

اللہ۔ میں ترے اسرار مجھ سے انکار کرتی ہوں میں تیرے قہر اور ترے جلال اور تیرے غضب کے

آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح لرزاں ہوں۔ سزائے موت کے قیدی کے مانند جو جلاد کی دستک کا منتظر ہو

خداوند! میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

میرادل۔ جو کالی کا مندر ہے جس میں خلقت اٹاٹوٹ گھسی ہوئی ہے۔ جس کے تنگ صحن؛

بجری کے پتوں کا سر کھڑی سے جدا کیا گیا ہے۔ کالی کی تین سرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر چہنہ

ہے۔ کالی کی مورقی کلکتہ کی کالی ہٹاری میں سولہ سو سال سے زمین میں آدھی دھنسی ہوئی ہے۔ آدھی دفن ہے۔

عورت کی طرح جو ہمیشہ آدھی دفن رہتی ہے۔ اور کالی کے منہ کے فرش پر کتوں کے پتے لٹتے پھر رہے ہیں۔

عورتیں بچروں کا سرخ سرخ گوشت کاٹ رہی ہیں۔ میرادل سونا گاچی کی تاریک گلی ہے جس میں میرا

آرزو میں میری پشمانیاں میری حیرتیں پاؤ ڈرے لمبی پتی بستھی ساڑھیوں میں، کونوں کھدروں میں، غلیظ دیو

سے مگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں۔ ہر آرزو یہ سوچتی ہے۔ اب کا آنے والا کئی لائے گا۔ او

اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

اب سامے دروازے مقفل ہیں۔

گلی تو چاروں طرف سے بند ہوئی۔ میں ہری من کیسے جاؤں۔

جب فون کی گھنٹی بجتی ہے دل لرزتا ہے۔ شاید مقبول نے فون کیا ہو۔ شاید شہر زاد نے فون

کیا ہو۔ اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہوگا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رساں مجھے مرتے دم تک کوڑ

ماتار ہے گا۔ خداوند! تو جو رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اس لئے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں۔ اور

بہانے کس طرح مروں گی۔ میری زندگی میں او خدا نے ذوالجلال تو خوب جانتا ہے کہ بیشتر وقت ای

مے میں جب میں نے کہا ہے یہ میری زندگی کا بدترین، خوفناک ترین لمحہ ہے۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا

کہ ابھی بھی اس سے کہیں زیادہ بُرے وقت آنے باقی ہیں۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکا لیا

ڈیر بیڈ لک ڈائری۔ میرا کریک آپ ہوتا جا رہا ہے۔ کیا مجھے پرسیکیوشن کو میڈیکس ہو گیا ہے

مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں —
اوانجھی رے۔ اپنی توار الگ رکھ دو۔ تمہاری ناؤ ٹوٹ چکی۔ جانے کا وقت آگیا۔

”آخری نقطہ نظر کے آگے اور کوئی منظر نہیں ہے۔“

دوسرا پارٹ ایک۔ میں نے رحمان الدین احمد کی بہن راجہ آپا کو ان کے ڈھاکے کے پرانے پتے پر خط لکھا ہے۔ کہ اگر میں یہاں مریضوں کو میری غائبانہ نماز جنازہ ڈھاکے کی کسی مسجد میں ادا کروا دوں۔ کیا یہاں سب بدبلاطن ہیں بھرتی ہری نے لکھا تھا معصوم انسانوں کے لئے ہر جگہ بدبلاطن انسان موجود ہیں۔ سانپ کی طرح ایک آدمی کا کان چاٹنے کے لئے دوسرے کو ختم کر دیتا ہے۔ برے انسان اپنی سے مندی کی طرف ترقی کرتے ہیں، جس طرح شفاف پانی سانپ کے منہ میں پیچ کر زہر بن جاتا ہے۔ اسی طرح معصوم آدمی کے الفاظ پر معاش کے منہ میں پیچ کر زہر بن جاتے ہیں۔ میں بدبلاطوں کے نشتروں کو ضبط کر کے ہنسا ہوں۔ کب تک؟ کب تک بھرتی ہری؟

کہیں میں نے یہ بھی پڑھا کہ دنیا THERMODYNAMICS کے دوسرے اصول پر عمل کر رہی ہے۔ کینٹون بڑھ رہا ہے۔ نظام عالم ختم ہو رہا ہے۔ دنیا اسی طرح بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گی۔ صبح سرد پڑ جائے گا۔ مذہب کتنا ہے قیامت آئے گی۔ شام کتنا ہے۔ نہیں سب کچھ باقی رہے گا۔ انسانیت زندہ رہے گی۔ اللہ جانے۔

میں بہت وقار سے مرنا چاہتی ہوں۔

دکھ سکھ۔ جنون اور صبحِ الدماغی۔ محبت اور نفرت۔ جنگ اور امن۔ غربت اور امارت۔ شکست اور فتح۔ شرافت اور رسالت۔ گناہ اور معصومیت۔ زندگی اور موت۔ سب میں نقطہ بال برابر کافر ہے۔ پل کی پل میں انسان ادھر سے ادھر ہو سکتا ہے۔

ڈرگڈاک ڈائری۔ کل رات میری بیٹی شہزاد کی شکاگو سے ٹرینک کال آئی میں گھر پہ نہ تھی۔ آج

دہ پھر نون کرے گی۔ بہت دنوں بعد اس کی آواز سنوئی گئی۔ میں بے انتہا مسرور

(نامم)

۳۹

شہر زاد کرستینا بلمونٹ

ہمبرگ - ۱۶ جون

ڈیر مسز سین۔ آپ مجھے نہیں جانتیں لیکن میں نے اپنی ممتی سے آپ کا ذکر بہت
مستنا ہے۔ آپ کو شاید اخباروں سے معلوم ہوا ہو۔ میری والدہ مادام یاسمین بلمونٹ ایک حادثے کا
شکار ہو گئیں۔ ایلب کے کنارے جاری تھیں پاؤں پھسل گیا۔ میرا ذاتی خیال ہے وہ خود دیرانے
اندھ چلی گئیں۔ میں آپ سے واقف نہیں۔ ممتی سے خاصی واقف تھی میرا ذاتی خیال ہے آپ جنگور۔ گانڈ
مسروجنی نائیڈو۔ ہنر و وغیرہ کے پرمستار لوگ خاصے کنفیوزڈ اور بھولے تھے۔ آپ لوگ اب C O P E
نہیں کر سکتے۔ C O P E تو میں بھی نہیں کر رہی ہوں لیکن مجھے کوئی دعوے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کو (ممتی
سمیت) بہت دعوے تھے۔ میں جانتی ہوں میں ایک تیرتا ہوا تنکا ہوا میں اڑتا ہوا پائر یا جینوئی یا کچھ
کی طرح بے لفاظت جاندار ہوں۔ زمانہ درمکان میں میری کوئی حیثیت نہیں۔ حیات انسانی بالکل ہمل اور
لا یعنی ہے۔ یقیناً آپ کہیں گی میرے منفی یا روحانی خیالات مغربی یورپین ڈیکسٹنس کا تجربہ ہیں۔ یوں ہی سہی۔
آپ لوگوں کے مثبت، صحت مند، اعلیٰ روحانی خیالات کا کیا نتیجہ نکلا۔ بات یہ ہے مسز سین کہ میں چوبیس سال کی
عمر میں آپ سے اذرا پتی بے چاری رو مینٹک غمزدہ آئیڈیلٹ ڈکھی ممتی سے کہیں زیادہ ہوشمند، تجربہ کار بلکہ
خرامٹ ہوں۔ دنیا کا کوئی تجربہ پوچھئے۔۔۔ ذہنی۔ روحانی۔ جسمانی۔ وہیں کر چکی ہوں کسی صومالی، گرو مسرٹ
یا ذکر کیجئے میں وہاں جا چکی ہوں۔ کسی خطرناک سے خطرناک منشیات کا نام لیجئے۔ خاکسار اس سے بہرہ ور ہو چکی
ہے۔ انلاقات کا آپ لوگوں کا نسخہ بیکار ثابت ہوا۔ ممتی کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوتی کہ وہ دررا ہے کی تہذیب سے
نی گئیں۔ بیکال، مسلمان، پاکستانی ہوتے ہوئے انہوں نے مغربی رو دیتے اپنا ناچا ہے، اندرونی روحانی تصادم
ندید تھا ہمیں ممتی تاب نہ لاسکیں اور ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اب میں آپ کو اصل وجہ بتاتی ہوں وہ کیوں مرنے۔

پچھلے بیس بائیس سال سے مغرب میں کافی تنگی ترقی سے گزر کر رہی تھیں۔ مختلف کارخانوں میں مزدوری۔ قص کا انٹرنیشنل کیریئر سنانے میں ناکام رہیں۔ کیونکہ ڈالس کی عمر دس سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ صاحب اور ایویسیوں نے ممی کو قبل از وقت کمزور اور بوڑھا کر دیا۔ دل کا عارضہ لگ گیا۔ لیکن اوہ اس وجہ سے مرین کہ کھیلے دنوں میں نے ان کو شکاگو سے فون پر مطلع کیا کہ میری تصویر دوائے کے صفحہ پر بڑے پر چھپنے والی ہے میرے لئے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔ بہت کم لڑکیاں فوش نصیب میں جن کو یہ اعزاز میسر ہو۔ میں نے ان کو بڑی مسرت کے ساتھ شکاگو سے یہی نے کے لئے ٹرنک کال کیا جو باؤہ خوب جینیں چلائیں اور ریسورٹ پر سٹخ دیا۔ چند روز بعد مجھے اُن مارٹے کی خبر ملی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کپڑے پہننے اور اتارنے اور جسم کی انٹومی کو آپ نے اتنی شدید اہمیت کیوں دے رکھی ہے۔ جنس کے بارے میں یہ سارے بے معنی اور لغو لئے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہر حال میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میں اب اچھی خاصی کامیاب لہ ہوں۔ اور اب تک ہر نسل اور قوم کے اتنے آدمیوں کے ساتھ سوچتی ہوں کہ ان کی نئی مجھے یاد نہیں۔ اور ممی بے چاری محض ایک مددچرلڈ ایڈرین بلونٹ سے شادی کر کے بقیہ عمر احساسِ جرم میں مبتلا رہیں کہ جس شخص سے ان کا نکاح غلط سلط پڑھا دیا گیا تھا۔ وہ تین سال اس کے ساتھ رہیں۔ میرے والد سے علیحدگی کے بعد مجھے یقین ہے مرحوم نے نہایت پاک دامن زندگی گزارنی ہوگی۔ بے صرف، بے کار، بے معنی زندگی۔ کتنا انمول وقت ضائع کیا بے چاری نے۔ جوانی واپس نہیں آتی۔ انسان دنیا میں صرف ایک بار ہی آتا ہے۔

دوسرا احساسِ جرم ممی کو یہ تھا کہ انہوں نے اپنی اجازت سے مجھے رومن کیتھولک بنوا۔ یہ سب میں آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میں پرسوں شکاگو سے یہاں آئی۔ ان کے کمرے میں ان کے نے سے ایک ڈائری برآمد ہوئی کئی سال پرانی ڈائری ہے جس میں وہ وقتاً فوقتاً لکھتی رہی تھیں۔ بنگلہ۔ کہیں کہیں انگریزی۔ اس میں آپ کا نام اور پتہ بھی درج ہے۔ مجھے بنگلہ آتی ہے۔ اردو۔ کی پرانی دوست تھیں لہذا یہ بے چاری المناک ڈائری میں آپ کو بھیج رہی ہوں۔ میں امید کرتی ہوں اسے ممی کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھنا پسند کریں گی۔ میں ہوں آپ کی مخلص:

شہر زاد کرستینا بلونٹ

P.S. 2 معلوم میرے والد کہاں ہیں۔ سنا ہے لندن میں GAY LIB تحریک کے آرگنائز

شامل ہو گئے ہیں۔ ان سے آج تک ملاقات نہیں ہوئی۔ میری داری کا انتقال ہو چکا ہے۔
یہ مقبول احمد خاں کون صاحب ہیں۔ ان کو گولی مار دینی چاہئے۔

P.P.S. آپ کی نسل کا دو غلامین اور اخلاق کے دو ہرے معیار حیرت انگیز ہیں۔ آپ لوگ

ندن آکر جوق در جوق "HAIR" اور "OH! CALCUTTA" دیکھتے ہیں اور پھر مہر

لیاں دیتے ہیں۔ ہم نے خود کو پرانی زنجیروں سے آزاد کر لیا ہے۔ شاید اس وجہ سے آپ ہم سے

لٹے ہیں۔ معاف کیجئے۔ میں یہ سب آپ کو اس لئے لکھ رہی ہوں کہ میرے بچپی میں می اکثر آپ کی

شن مشال دے کر مجھے لیکچر ملایا کرتی تھیں۔ آپ کیسی بڑی انقلابی تھیں۔ جان پر کھیل کر حصول

ادی کی جدوجہد کی۔ کتنا اعلیٰ کردار تھا آپ کا۔ ہا ہا ہا۔ آپ کی حاصل کی ہوئی آزادی ایسی

نی کہ خود آپ ہی کو تارک الوطن ہونا پڑا۔ اور آپ کے انقلابی بلند کردار بہرور بجان الدین احمد

کو بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ لندن میں ملے ہوئے کلب میں نظر آئے تھے۔ مخالف ملک کے دو منسٹر

تھے۔ سب بیٹھے ایک ساتھ شراب پی رہے تھے۔ صبح کو کانفرنس ہال میں ایک دوسرے کے خلاف

لڑے بیان دیتے۔ جن کے اثر سے دونوں ملکوں میں مزید خون خرابہ ہوا۔ معصوم غریبوں کی جائز

گیس۔ اس سے پہلے آئے تھے می نے ملنا چاہا صاف مال گئے کہ وقت نہیں ہے۔ اگر می کوئی اہم

ہستی ہوتی دوڑ کر ملتے۔ سیک۔ سیک۔ سیک۔ یہ آپ لوگوں کے دو ہرے معیار تھے۔ مجھے

پ کی نسل نے بہت ڈزا لوزن کیا ہے بسز سین۔ اور اگر ہم لوگ آپ لوگوں سے بغاوت کر کے

DRUGS اور سوایموں کے ریکٹ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں تو آپ کیوں متعجب ہیں؟ آپ

نے امن کے لئے کام کیا تھا؟ اصل عالمی امن تو ہم چاہتے ہیں۔ بسز سین۔ اگر نوجوان لوگ

فلاور چلڈرن بن گئے آپ کی بنائی ہوئی دنیا بہت بھیانک معلوم ہوئی۔ وہ اس سے علیحدہ ہو گئے۔

امید ہے آپ میری اس صاف گوئی کو معاف کریں گی۔ ادم شانتی شانتی شانتی۔

شہر زاد

۴۰ سوامی آتم آنند شنکر پرمی

روم ایرپورٹ پر ایک نوجوان سفید فام سوامی جی ترشول اور جھولا سنبھالے ساتھ ساتھ چلے
اسے پر سوار ہوئے۔ اور میٹ پر مسز سین کے برابر بیٹھ گئے۔ شوا ایشوا۔ انھوں نے لمبا سانس لے کر
ما۔ اور پھر مالا جینے لگے۔ مسز سین نے تعجب سے ان کی سنجیدہ صورت کو دیکھا۔ ایسا نوجوان عمر لڑکا اور
مکرانا نہیں جانتا۔

مسز سین نے دوبارہ اس کی شکل پر نظر ڈالی۔ ذرا مانوس معلوم ہوئی۔ مسز سین کو اپنی طرف
ردیختا پا کر سوامی جی نے جھولے سے اپنا تبلیغی لٹریچر نکال کر ذرا دہشتی سے اُن کی گود میں سرکا دیا۔

”معاف کرنا بیٹے تمہارا کیا نام ہے؟“

”سوامی آتم آنند شنکر پرمی۔“ لڑکے نے نہایت متانت سے جواب دیا۔

”ہنسی بیٹے۔ اس سے پہلے کا نام؟“

”مجھے پہلے کا نام یاد نہیں۔ میں اپنی پہلی زندگی بھول چکا ہوں۔“

”او۔ آئی سی۔ انھوں نے گورے چھو کرے کو نظر بھر کے دیکھا۔ یہ شکل کس کی تھی۔ کس کی تھی

س بار لو۔ آئی سی ایس۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ڈھاکہ۔ شاید وہ ہو۔ مسز سین خاموش رہیں۔

توقف کے بعد انھوں نے گھڑی دیکھی اور بولیں۔ ”ہم لوگ کتنی جلدی ایٹھنسن پینچ جائیں گے۔ سائینس

ترقی کمال ہے۔“

”سائینس۔؟ پراچین کال میں ویمان اڑتے تھے۔ اور ہابھارت کے زمانے میں ٹیلی ویژن

دہو گیا تھا۔ انگریز ہندوؤں کی قدیم کتابیں چرا کر لے گئے اور ان کی بنا پر اتنی ترقی کر لی۔ اس پر کون روکی

ہیں چاند پر پہنچ گئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ چاند پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔“ سوامی جی نے کہا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”ایٹھنسن۔ وہاں آئینم قائم کروں گا۔ پھر اٹھریا۔ ہر دو اور۔ نارڈ شوا کا مشہور۔“

”اٹریا جا رہے ہو تو قحط زندگان میں کام کرو۔ آج کل وہاں خشک سالی ہے“
 ”قحط زندہ لوگوں کو چاہئے کہ رین گوڈ کی پوجا کریں۔ تاکہ وہ پانی برسائے۔ ہر ہر مہا دیوا۔“
 ”تم کو چاہئے بیٹے کہ تم رام کرشنا مشن والوں کی طرح خدمت خلق کرو۔ ہندوستان میں بڑی
 غربت ہے۔“

”غریب لوگ ہمارے شکر پریم فاؤنڈیشن کے قائم کئے ہوئے مندروں میں آکر پرہاسام کھا سکتے
 ہیں۔ لڑکے نے جواب دیا۔

”دیکھو بیٹے۔ میں بھی شکتی۔ مہاکالی کی پجاری ہوں شاید شکر بھگوان کی مرضی تھی کہ تم
 مجھے اس طرح ملو۔ اس لئے میری بات دھیان سے سنو۔ شاید میں تمہارے والد سے واقف ہوں۔
 کیا تم انڈین سول سروس کے مسٹر چارلس بارلو کے لڑکے ہو؟

گودا سنیا سی چونک پڑا۔ پھر اس نے زیادہ مضبوطی سے آنکھیں میچ لیں۔ چہرہ سخت کر کے جولا
 دیا۔ ”او۔ کے چارلس بارلو۔ لیکن میرے لئے وہ ہاپک اجنی نام ہے۔ میں اُن سے دس سال سے نہیں
 ملا۔ وہ میرے والد نہیں دادا ہیں۔ میں اُن کے بڑے بیٹے ماس بارلو کا لڑکا ہوں۔“

وقت اتنی تیزی سے گزر گیا، ڈھاکے کے جواں سال حاکم اعلیٰ چارلس بارلو اور اس کی بیٹی کی
 طور پر جسینی ہوئی وائیکٹ بارلو کا پوتا اتنا بڑا ہے کہ سوامی بے چکلے۔

”بیٹے اگر تم۔“

”شو۔ شو۔“ میم آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔ آپ کو کیا دلچسپی ہے؟ سوامی شکر پریمی نے
 درستی سے کہا۔ ”میرے گریڈ پانچ چارلس بارلو آسٹریلیا میں ہیں۔ ان کی بیوی میری دادی لندن میں جرمن

بیماری کا نشانہ بن گئی تھیں۔ اب تک دوبارہ جنم لے کر بھی دوبارہ مر چکی ہوں گی۔ کیا معلوم میرے والد
 نام بارلو بھی مر چکے ہیں۔ میری چھوٹی کیرل بارلو شاید زندہ ہیں۔ مجھے پتہ نہیں۔ میں اور میری بہن سچے تھے جب
 ڈیڈ اور می کی طلاق ہو گئی تھی۔ میں ایک غیر اخلاقی زندگی گزارتی ہیں۔ انہوں نے ہماری کبھی پرواہ نہیں کی۔

گریڈ پانچ چارلس بارلو نے آسٹریلیا میں دوسری شادی کر لی تھی۔ ان کا ایک لڑکا ہے۔ میرا سوتیلی چاچا چرڈ۔
 اس کا نام گریڈ پانچ نے اپنے مرحوم بھائی ونگ کمانڈر چرڈ بارلو کے نام پر رکھا تھا۔ جو سیکنڈ ورلڈ وار میں
 جرمنی پر بمباری کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔ یہ چرڈ سنڈنی میں کانٹری ریڈیکو ریٹر ہے۔ اور آدھا GAY۔ میری

مزہ ہوندا کہ میں ایک لڑکھن کلب چلاتی ہے۔ میری والدہ ایک رئیس زادی ہیں۔ ایک فریج جگ لو کے ساتھ
یہ آف فرانس میں رہتی ہیں۔“

شکر ہے وہ تو نارمل ہیں۔ مسز۔ میں نے دل میں کہا۔

”مجھے اس دولت عیش و عشرت، کامیابی، گناہ آلود دنیا سے، چوہوں کی دوسے نفرت ہوگی

یاد ہے۔ میں سنیا سے چکا ہوں۔ تمہی آپ کو کہاں ملیں؟“

”تمہاری تمہی مجھے نہیں ملیں۔ میں پورٹ آف اسپین میں رہتی ہوں۔ میرے شوہر برسرِ طرہ ہیں۔ پھیلے

ہ۔ ایک سرکاری مقدمے کے سلسلے میں پرتخت گئے تھے۔ میں بھی ساتھ گئی تھی۔ بحیثیت انڈین سٹریٹ

بزنس پر میرا اثر و یو لیا گیا تھا۔ تمہارے دادا نے وہ پروگرام دیکھا اور پتہ لگا کر میرا سے ہوٹل ہم

نے آئے۔ ہمیں اپنے شیش فارم پر لے گئے۔ وہ بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر بے حد

ہوئے جیسے میں ان کی تدفین کی کچھڑی ہوئی رشتہ دار ہوں۔ حالانکہ ہندوستان کی جنگ آزادی

نے میں وہ مجھے اپنا سب سے خطرناک دشمن سمجھتے تھے۔ اب وہ اتنے اکیلے تھے۔ تنہا اور ضعیف۔

یوں نے مجھے بتایا تھا کہ بنگال سے آسٹریلیا آکر انہوں نے ایک امریکن لڑکی سے شادی کر

لی۔ اس سے طلاق ہو گئی۔ اس امریکن بیوی سے ان کا لڑکا سڈنی میں رہتا ہے مگر ان سے نہیں

ٹرا مار لو تم سب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ صحت گر چکی ہے۔ تم لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ

بنا کر تم سب ان سے ایک بار ہی مل آؤ۔؟ ان کا پتہ لکھ لو۔“

لو کاردر اکش کی مالا جیتا رہا۔ ”ان کو اپنا کرنا بھگتا ہے۔“ اس نے سرد مہرے سے کہا۔ ”ایک سنیا سی

نون کے رشتے بے معنی ہیں۔“

مسز۔ سین نے جھنجھو کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور ایتھنٹر تک اس سے بات نہیں کی جب

ایر پورٹ پر اترنے کے لمحے نیچا ہونا شروع کیا سو امی آتم آندہ شکر مری نے اچانک

کو مخاطب کیا۔ ”میرا سوتیل چاچا رچرڈ بارلو جو سڈنی میں اینٹریڈ ٹیکورٹیر ہے مجھے ابھی چند

میسرس میں ملا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک نیا ہوٹل سجانے کے لئے اسے ہنگل ڈیش ڈھاکہ بلایا

اگر اتفاق سے آپ کی دہاں اس سے ملاقات ہو تو اس سے کہئے گا کہ میں اگلے مہینے کی پندرہ

بعد ہر دو دن میں ہوں گا یہ رشی کیش میں میرے آخرم کا پتہ ہے۔“ اس نے اپنا کارڈ سرکایا۔

”اس سے کہنے گا مجھ سے وہاں آن کر لے۔ میں نے راہ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔ وہ مایا
 حال میں بری طرح پھنسا ہوا ہے۔ اور آپ بھی کبھی رشی کش آئیے۔ شوا۔ شوا۔ یہ
 طیارے نے لینڈ کیا۔ سوامی جی مسافروں کی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ایرپورٹ پر اتر کر
 ہجوم میں ان کا جھنڈا اور ترشول کچھ دیر تک نظر آتا رہا۔

۴۱ جگھر

ڈھاکہ ایرپورٹ پر یاسمین مجید یادگار کیٹی کے اراکین ہار پھول لئے منتظر تھے۔ شرمیلی دیپالی
 بنگلہ دیش کی ایک قابل فخر بیٹی، مشہور مفینہ، بنگلہ دیش کی دوسری قابل فخر بیٹی، نامور رقاصہ اور شہ
 مرحومہ یاسمین بلونٹ کی یاد میں منائے جانے والے تہذیبی جشن کے لئے آتی دور جنوبی امریکہ سے
 کی گئی تھیں۔ مرنے کے بعد یاسمین بلونٹ ”عظیم شاعرہ“ بھی قرار دیدی گئی تھی۔ واہ۔ جب وہ
 تھی پچیس برس پر دس کی فیکٹریوں میں مزدوری کر کے، ناقے کر کے، لیسٹورانوں میں برتن دھو
 رشتے داروں اور ہم وطنوں کی گالیاں کھلے، ایڑیاں رگڑ رگڑ کے، سرد بے رحم دیا میں ڈوب کر
 اب اس کے نام پر بین الاقوامی تہذیبی جشن منایا جا رہا ہے جس پر لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ
 گا۔ یادگار کیٹی نے مسز سین کو آمد و رفت کا ایرٹکٹ پیش کیا تھا۔ جسے لینے سے انہوں نے انکار کیا۔ یہ
 بڑا GHOULISH آسبھی سفر تھا۔ وہ اپنے سوگرہ پتا ڈاکٹر بنوے چندر مرکار اور سوگرہ پھو پی
 بھوتارنی دیپی کی راکھ ساتھ لائی تھیں کہ ان کی وصیت کے مطابق اسے ہر دار لے جا کر گنگا میں
 دیں۔ یہ شاید خود دیپالی سین کی وطن کی آخری دزٹ ہو۔ جلد شاید خود ان کا بلاوا سفر آخرت کا آجا
 سنسار میں کافی تورہ لیں۔

”آپ کے لئے انٹر کونٹینٹل میں انتظام کیا گیا ہے۔“ استقبال کیٹی کے سکریٹری نے کہا۔ ”ا
 آئے ہوئے فکرا بھی وہیں ٹھہرے ہیں۔ یا آپ کسی دوست کے ہاں قیام پسند کریں گی؟“
 اب ایک وردی پوش شو فر آگے بڑھا۔ ”میم صاحب“ وہ دانت نکوس کر بولا۔ ”نواب“

رحمن منزل سے گاڑی بھجوائی ہے۔ خود تشریف نہیں لاسکے۔ آج صبح اخبار میں آپ کا نام دیکھا حکم دیا
تاج گاؤں جا کر آپ کو لے آؤں۔ چلے۔" دیپالی نے استقبالیہ کمیٹی سے مندرت چاہی۔ شو فر کے
مذتیز تیز چلتی باہرائی۔ شو فر نے ایک سفید مسیڈیز کا دروازہ کھولا۔

نواب صاحب بچارے اربا بکتے ضعیف ہو گئے ہوں گے۔ مدتوں سے اس خاندان کی خیر معلوم
ل۔ ڈھاکہ اور پورٹ آف اسپن میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ جو محض ایر لیسٹرز کے ذریعے نہیں پاٹا جاسکتا۔
۱۹۶۰ء میں وہ کھلی مرتبہ یاں آئی تھی۔ اگلے سال اگلے کے مرنے کی خبر معلوم کر کے بھی جہاں آرا کو خط
نے کی ہمت نہیں پڑی تھی۔ اب اتنے برسوں بعد ان سب سے ملنے کی خوشی اور اضطراب سے اس کا دل
ڑکنے لگا۔

مسیڈیز ڈھاکہ کی سمت رواں تھی۔

"سب لوگ کیسے ہیں؟" اس نے شو فر سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں۔" اُس نے جواب دیا اور انہماک سے کار چلانا مارا۔ وہ لڑکا سا تھا۔ شاید رحمن
ل میں یا نیا ملازم ہوا تھا۔ اس وجہ سے لے اپنی اہمیت کا بہت احساس معلوم ہوتا تھا! اس کی گردن
پھلے حصے پر زخم کا بھرا نشان تھا۔

دیپالی نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچتی رہی۔ جہاں آرا کا سامنا کس طرح کروں۔ اگلے کی تحریر
الفاظ میں کروں۔ اگلے کو مرے بھی اتنے برس گزر گئے۔ جہاں آرا اب اپنے پوتے کے سہارے
نا رہی ہوگی۔ ممکن ہے بہو نے دوسری شادی کر لی ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تعزیت کے جملوں کی
سل شروع کی۔ پھر دل کڑا کر کے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف شہر تھا اور یادیں بندوق کی
دل کی طرح بوچھاڑ کر رہی تھیں۔ یادیں LAND MINES کی طرح دخن تھیں۔

"میم صاحب گانا سنئے گا۔؟ بنگلہ دیش ریڈیو" ڈرائیور نے کہا۔ اور ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔
کی کھاٹا کا گیت۔۔۔ بھٹیالی ختم ہو رہی تھی۔ اب نذر لگتی شروع ہوئی۔ بد روہی۔ کہہ دے لے
میں سر بلند ہوں۔ اتنا بلند کہ ہالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے سرچوں۔ کہہ دے لے بہادر کہ اس وسیع
ن کو جیر کر چاند سورج ستاروں کو توڑ کر جنت بھرخ دہا کر آسمان سے بھرا کر میں سارے عالم کے
بسمہ حیرت بن گیا ہوں۔" نوجوان ڈرائیور نے مرکز اطلاع دی: "میم صاحب۔ ہم بھی بہت لڑا۔"

گانا جاری رہا، میں سرکش سسٹل آتش نوا، قیامت کا دوست طوفان تباہی دمشت ہور
دنیا کے لئے سراپا ہلاکت۔ میں ہر چیز کو چکنا چور کر دیتا ہوں۔ اصول شکن۔ بربادی کا دیوتا۔
وہ بے اختیار خود بھی اس کے ساتھ ساتھ گانے لگی اور پل کی بل میں اپنے کالج کے زمانے میں وہاں
پہنچ گئی۔ جب وہ اور ریمان اور روزی بہزجی اور محمود الحق اور حیوتی سب مل کر خوش دزدوش سے یہ گید
گاتے تھے۔

اُسے پتہ بھی نہ چلا مرسیڈیز ارجمند منزل کی برساتی میں کب پہنچی۔

ایک پاگل سی عورت جھپڑے سفیر بال بکھرائے برآمدے کے ایک در میں بت بنی کھڑی تھی دیا
کو کار سے اترنا دیکھ کر فوراً اندر بھاگ گئی۔

ایک ملازم نے آکر اسباب کار سے اتارا۔ دیپالی اندر گئی۔ اور جمند منزل سنان پڑی تھی۔ جہاں آکر
— جہاں آرا — پکارتی وہ زنا خانے میں پہنچی۔ وسطی تالا بھی خالی پڑا تھا۔ دیپالی اوپر جانے کے
لئے منقش جو بی زینے کی طرف مڑی ہی تھی کہ وہ دیوانی عورت بھاگتی ہوئی اندر آئی اور اس کی ٹانگوں
پرٹ کر آ۔ آ۔ آ۔ کرنے لگی۔

”مالا۔ میم صاحب کو تنگ مت کر۔“ ملازم نے جو اسباب اٹھائے پیچھے پیچھے آکر ہاتھا
جھڑک کر کہا پھر بھان کو مخاطب کیا۔ ”میم صاحب۔ جب سے سب لوگ مارا گیا، آلا پاگل ہو گیا
اور گونگا بھی ہو گیا ہے۔“
”کون۔۔۔ مارا گیا۔۔۔؟“

”سب جنے۔ میم صاحب۔ بڑے نواب صاحب۔ نیرمیاں۔ اُن کا بی بی بچے۔ جہاں آرا
بی بی۔ ان کا بہو اور پوتا۔ سب مارا گیا۔ آدھی رات کے ٹائم۔ سب بندوق کا نشاہ بنا۔ یہی کوٹھی کے اند
لانے سب کو مرتے دیکھا۔ جب سے یہ گونگا ہو گیا۔“

دیپالی کی آنکھوں کے سامنے ایک کونڈا سا لپکا۔ وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ پھر کھڑے کھڑے زور سے
لہڑی۔ پھر اس کی ٹانگوں نے جواب دیا۔ داغ سننایا۔ سارے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ آنکھوں کے
سامنے سورن اندھیرا تیرا۔ وہ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی۔ کہہ دے اے نوجوان۔ جو اندر میں جنت دوزخ
دہا کر۔ عرش سے ٹکرا کر سارے عالم کے لئے مجتہ حیرت۔ اُس نے وحشیوں کی طرح چاروں طرف دیکھا

معد لچھے چپ رہی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا۔ اس کے بال بکھر گئے۔ روتے روتے اس نے معمولی سا کہ وہ انسان نہیں ہے۔ وہ درندوں سے بھرے جنگل کا ایک جانور ہے۔ جس کے بھٹ کے باقی جانوروں دو سے زیادہ خونخوار حیوان اگر حیر بھاڑ گئے ہیں۔ ادا ان کی لاشیں گدھ کھا چکے ہیں۔ اور سنان صحرا ریت نے ان کے ڈھانچے بھی غائب کر دیئے ہیں اور وہ گیدڑ کی طرح پنجوں سے زمین کھرحتی ان کو یاد کر رہی ہے۔ پھر اس نے جنگلی بٹی کی طرح رونا شروع کیا۔ اس کی آواز سن کر اجنبی شکلوں والے نوکر اگر دروازوں میں نمودار ہوئے۔ مالا اور زور سے آ۔ آ۔ آ کرنے لگی۔ جس طرح ایک نا سمجھ بچہ سر پتے کو روتا دیکھ کر ہمدی میں خود بھی رونے لگتا ہے۔ مالا نے دیپالی کو آنسو بہاتے دیکھ کر آنسوؤں جھری لگا دی۔

دفعاً دیپالی چپ ہو گئی۔ آنکھیں خشک کیں۔ اور سپاٹ آواز میں کہا۔ ”مجھے بڑے نواب صاحب پاس لے چلو۔ ان کو اطلاع کر دو۔ میں آگئی ہوں۔“

”وہ بھی مارا گیا میم صاحب۔“ ملازم نے جواب دیا۔ دیپالی نے فرش پر رکتہ مارا۔ ”اس بد لعاش وٹے کیٹنے ڈرائیور نے کہا نواب صاحب نے ایرپورٹ کار بھجوائی ہے۔ نواب صاحب نے۔“

”چھوٹے نواب صاحب نے۔ میں ان کو بلا کر لاتا ہوں۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔ باہر گئے تھے۔ آتے ہوں گے۔ میں ان کو خبر کرتا ہوں۔ دھیرج رکھئے میم صاحب۔ نیا زیمیاں میم صاحب کے لئے ایک ٹھنڈا پانی۔ جلدی۔“ دوسرے خدمت کار نے گھبرا کر کہا اور لپکا ہوا باہر گیا۔

دیپالی اب ایک نم جان کو کر اسپینل کی طرح فرش پر سرنگوں بیٹھی تھی۔ اس کے آنسو بوردی رنگ کے لہرائے ہوئے۔ ماہ اس کے نزدیک آ کر اکڑوں بیٹھ گئی۔ دیپالی نے آنسوؤں کی چلسی میں سے لے دیکھا۔ اور سپرد آرا کی پرانی عقادار خادمہ مالا۔ وہ اب اپنی دیوانگی میں لکڑی کی طرح ہنس رہی تھی۔ ان دونوں عورتوں نے ندگی کا، دنیا کا انجام دیکھ لیا تھا۔

چند منٹ بعد دیپالی نے سراٹھایا۔ صمد دوازے پر آہٹ ہوئی۔ ”تھ میں“ ”ٹائیوٹائیوٹائیو“

اسنجانے بڑیا سوٹ پہنے ریحان الدین احمد دہلیز پر کھڑے تھے۔

نواب قمر الزماں چودھری کے مہانچے۔ ارجمند منزل کے نئے مالک شمیم نواب کے واحد قانونی وارث میں زندہ بچے تھے۔ ارجمند منزل کے موجد نواب۔

دیپالی نے سرزور سے جھجکا اور آنکھیں لیں کالی جگت کے چوراہے پر بیٹھی تنگیں بناتی ہے۔ تنگیں بنا
ہے۔ تنگیں اڑاتی ہے۔

پنج کے بعد ریحان کارلے کرباٹ کی فیکٹری چلے گئے جو نواب قمر الزماں اور ان کے فرزند نیر الزماں مرحوم
کی فیکٹری تھی۔ جس کے اب وہ مالک تھے۔ زہرہ دیپالی کو آرام کرانے اور پر بیٹروم میں لے آئیں۔ یہ جہاں آرز
مرحوم کا بیٹروم تھا۔ دیوار پر ایئر فورس یونیفارم میں مہوس شہسوار اکمل مرشد زادہ اور اس کی ڈیپن کی تصویر
لگی تھی۔ یہ پائلٹ آفیسر اکمل مرشد زادہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان کی خاطر لڑتے ہوئے مرا تھا۔ دیپالی کا
گھومنے لگا۔ وہ دریچے کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ جس کے نیچے تالاب اور "وکر م آدتیہ کاراج سنگھ اس
نظر آ رہا تھا اور گلاب خاص کا درخت۔

دوسری سہری پر بیٹھی زہرہ اومارائے کی شکایتیں کر رہی تھی۔

"اوماریدی نے میرا نام میں دم کر رکھا تھا۔" پان بناتے ہوئے اس نے کہا۔ "وہ بالکل سٹھیا لگی ہے
جس طرح وہ بلوئڈیر جا کر لادارٹ ہلیوں کتوں کو کھلاتی تھیں ان کا خیال تھا ریحان صاحب اور میر
بھی ان کے پالتو جانور تھے۔"

"ریحان کے متعلق ساری عمر ان کا یہ رویہ رہا۔" دیپالی نے غیر شخصی انداز سے کہا۔ اب اس
لمحے وہ محض ایک دور کی تماشائی تھی۔

"جی ہاں۔ ہمارے لڑکے فرقان کو بھی انہوں نے ہی میرے خلاف بھڑکایا۔ وہ DRUGS

کھانے لگا۔ گھر سے نکل گیا۔ ہتی بن گیا۔ پھر وہیں معلوم ہوا کہ وہ ڈھاکہ آ گیا ہے۔ ریحان صاحب بیٹے کو سہ
چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا چلو ہم بھی کلکتہ کو خیر یاد کہتے ہیں۔ ڈھاکہ واپس جا کر نئی زندگی شروع کر سہ
ساری عمر گزارنے کے بعد شاید اومارائے ان کی سمجھ میں بھی آگئی تھیں۔ ۱۹۷۶ء میں ہم لوگ ایسٹ پاکستان
آگئے۔ ریحان نے کھانا میں بزنس شروع کر دی۔ وہ بنیادی طور پر سیاسی آدمی ہیں۔ پھر پولیٹیکس میں
پڑے۔ عوامی لیگ۔ شیخ مجیب الرحمن۔ وہ سب چکر لڑا کالونیورسٹی میں داخل ہو گیا۔ سدھ گیا۔ پھر

صاحب نے اسے آگے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا۔ ہم لوگ اپنا سارا روپیہ کلکتہ سے کسی ترکیب سے یہاں لے گئے تھے۔

اس کے بعد جو ہر اوہ آپ کو معلوم ہے۔ فرقان لندن میں تھا۔ زندہ بچ گیا۔ اب باپ کے ساتھ بزنس کچھ بھال کرتا ہے۔

”جب ارجمند منزل پر حملہ ہوا ہم لوگ کھلنا کے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ ارجمند منزل کا یہ گھر اناشیخ مجیب کا حامی بن چکا تھا اور جو کچھ ہوا کیوں اور کس طرح یہ لوگ مارے گئے وہ ریحان پتخ وقت آپ کو بتا چکے ہیں۔“

”ہاں۔ میں اس کی تفصیل نہیں سنا چاہتی۔“ دیپالی نے مضبوطی سے جواب دیا۔ ریحان نے کسی باٹ طریقے سے اس قتل عام کا تذکرہ کیا تھا۔ پھر اس نے خود کہا تھا ”جب لاکھوں اکٹھے مارے جائیں غ ماؤں ہو جاتا ہے۔ افراد کی موت کا اتنا شدید صدمہ ذہن پر نہیں رہتا۔ مرگ انہو واقعی ایک جشن ہے۔ کسی بھی قتل عام کے پس ماندگان کی نفسیات ہو سکتی ہے۔“ لیکن اتنا کہنے کے بعد ریحان خود بھروسہ ٹٹ کر رونے لگے تھے۔

ریحان کی بہن رابعہ اور اس کا شوہر اور چھوٹے بچے رفیع و حبی بن کر کلکتہ چلے گئے تھے اور وہاں پلے تھے۔ رابعہ کو بڑی لڑکی ناصرہ نجم اسحر کلکتہ جانے کے بجائے ایک گوریلا دستے میں شامل ہو گئی تھی بہت دنوں تک غائب رہی تھی۔ آزادی کے بعد بھی ہتھیار ڈالنے پر راضی نہیں تھی۔

”میں نے اس لڑکی کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ انتہا پسندوں سے جا ملی تھی، بڑی آفت میں پھنسی۔ ماہیہ دل کے گردہ سے الگ کر دیا۔ اسکا رشپ دلو اکرا اعلیٰ تعلیم کے لئے ماسکو بھیجا یا۔ فرنیٹشپ درستی میں پڑھ کر آئی۔ مگر ماؤسٹ بن گئی۔ یہاں کالج میں لیکچرر ہو گئی۔ اب وہ مجھ سے نہیں ملتی۔ بے خلافت بستی پھرتی ہے۔ نہ جانے یہ نوجوان کیا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی احسان فراموشی نسل ہے۔“ بان نے نواب تھمر الزماں کی آواز میں دیپالی سے کہا تھا۔ اسے ناصرہ نجم اسحر کی تلخ گفتگو یاد تھی جب وہ نو سال قبل اس سے یہیں ملی تھی۔ اب ریحان نے اپنی مرسیڈیز میں بیٹھ کر نرائنج جا چکے تھے۔ ان کا ٹائٹلش موڈ شاعر بٹیا فرقان اپنا پروگرام تیار کرنے میں دیرین سمنہ چلا گیا تھا۔ نوکر چاکر شاگرد پیشے میں تھے۔ پھر قبولے کا۔ سید شا کا وقت۔

”ایک بات سنو زہرہ۔ گویا تمہاری خوش قسمتی تھی کہ تمہارے مفلس باپ نریندورائے کی موٹر کے نیچے آکر مرے اور بطور نریندورائے تم سے ریمان نے بیاہ کیا۔ اور یہاں قتل عام ہوا اور تم ارجمند منزل کی ماں بنیں۔ زہرہ خدا کے لئے چپ ہو جاؤ۔ اور مجھے سونے دو۔“

”آ۔ آ۔ آ۔“ مالانے دہرایا۔

یہ ارجمند منزل ایک بھوت گھر ہے۔ کہتے ہیں جو لوگ اچانک اور بھیانک طریقے سے قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ ان کی آتائیں ان ہی جگہوں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔ کیا ان سب کی آتائیں مجھے دیکھ ہی بھول گئی۔ ایک روز شام کے وقت وہ میٹرھیاں اتر کر پائیں بلان میں آگئی۔ اوپر جہاں آرا م جو مر کے کمرے کا دریا پھر روشن تھا۔ جس میں اب زہرہ موجود تھی۔ اور اسی تخت پر بیٹھی مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔

جہاں آرا تم تو بھوسا گر سے پار اتر گئیں مگر میں تم سے کتنی شرمندہ ہوں۔ اس فیکٹری کا مالک اور اس گھر کا خاوند اما دہ بننے کی خاطر ریمان نے تم کو ٹھکرا دیا تھا۔ تم نے ایک غلط آدمی کے ساتھ زندگی جہنم میں گزار دی۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم اٹھایا۔ پھر خود سید زدی سے بے قصور قتل کر دی گئیں۔ اور آج اسی گھر میں وہی ریمان دران کی بیوی نئے نواب اور بیگم کی حیثیت سے براجمان ہیں۔

مایا تیرے کھیل۔

وہ ٹھہرتی ہوئی جل گھر کی طرف چلی گئی۔ جس کا دروازہ باغ میں کھلتا تھا۔ گواڑ چوڑے کھیلے پڑے تھے۔ وہ اندر گئی۔ بچی جلانی۔ سامنے دیوار پر ایک بڑی سی تصویر روشن ہو گئی۔ پارسی تھپیٹر۔ دھرم تلہ اسٹریٹ۔ کلکتہ۔ نندا اور مدھم فوٹو گرافٹ: ماسٹر مصطفیٰ، سراج الدولہ نانک کا ہیرو۔ مس تنکوری داس دی سنگر۔ مس راداس سولہ نانک کی ہیروئن۔ ایک بڑی روغنی پورٹریٹ۔

نوابزادہ فخر الزماں چودھری۔ اسے یاد آیا۔ یہ ریمان کے نانا تھے۔ نواب قمر الزماں کے جو امیرگ چچا۔ جنہوں نے تھپیٹر کے شوق میں اپنے حصے کی جائیداد اڑادی تھی۔ یہ ان کا جل گھر تھا۔ اس میں نواب زادہ صاحب نندو دست دیپالی کے ٹھاکر دادا بھی سنا ہے اگر گایا بجایا کرتے تھے۔ پرانے اسٹوڈیو ٹیک، بنگال کے تھپیٹر پرست ڈسوا، ارجمند منزل کے اس جل گھر میں ساٹھ ساڑھو ساٹھ اسی طرح موجود تھا۔ الماری میں ”شاہجہاں“

”سراج الدولہ“ کے کرم خوردہ چوغے۔ نقل تاج۔ تلواریں۔ بالسرہاں۔ سینہ بیل کے پردے لپٹے ہوئے

ایک طرف رکھے تھے۔ ہال کے چوٹی فرش پر گدی جمی ہوئی تھی۔ کونے میں جا لے۔ سرخ اور سفید کٹاؤ کے کام، جھالردار پنکھا۔ چھت گیریاں نوا بڑا نیر الزماں کی شادی کے دنوں میں اسی کمرے سے نکال کر نوا بڑا نیر الزماں مرحوم کے تصنیف کردہ اویسرا "راجہ بھوج" کا سنگھ آسن تالاب کے کنارے رکھ دیا گیا تھا۔ جس پر راجہ منزل کی بیگمات اور صاحبزادیاں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتی تھیں۔

دیپالی جلسہ گھر سے باہر آگئی۔ اندر بہت جس جس تھا۔ اور وحشت۔ باہر پر فضا باغ میں "دکرم آرتیہ" کا سنگھ آسن۔ اب بھی موجود تھا۔ گوشتیں برساتوں کی وجہ سے گل چکا تھا۔ اس کی مورتیوں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ اس کے جنگلوں میں اٹھائیس چھوٹی چھوٹی مورتیاں لگی تھیں۔ چار بڑی چوٹی مورتیوں کے سروں پر تخت کھڑا تھا۔ زیادہ تر مورتیاں بالکل شکستہ ہو چکی تھیں۔ سنگھ آسن تیسری کی دیو لوک سے جلا وطن اسپر ائیں!

گلاب خاص کے نیچے پیچ کردہ تخت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

ایک مرتبہ، گرمیوں کی ایک معطر شام جہاں آرا نے ذکر کیا تھا۔ "دیپالی۔ ہمارے چھوٹے دادا جاجا نوا بڑا نیر الزماں چودھری اللہ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے "راجہ بھوج" کا اویسرا خود کپور کیا تھا۔ راجہ بھوج کا پارٹ بھی خود ادا کرتے تھے۔ تمہارے ٹھکانہ دادا راجہ اندر بنتے تھے۔ کلکتے کی ایکڑ میں آکر رہے اور اردوشی کے پارٹ گاتی تھیں۔"

اُس شام منہ چڑھی خادمہ مالا حسب معمول تخت کے پاس گھاس پر بیٹھی تھی۔ یاسین اور رذری بھی آئی ہوئی تھیں۔ جہاں آرا نے حکم دیا۔ "مالا۔ راجہ بھوج کا قصہ کر۔"

"ارے بی بی۔ ہندو لوگ بولتا ہے کہ دیو لوک میں تیس چھو اسپر ائیں تھیں۔ ایک رذریوں نے شیوجی پر بڑی نظر ڈالی۔"

"گڈ گڈ۔" دیپالی اور سب لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسیں۔

"مادہ نط کیلاش اور مادہ نط اولیس واقعہ بہت دلچسپ جگہیں رہی ہوں گی۔" یاسین نے کہا۔ "تو بی بی! پارونی دی ہی جن گیس! انہوں نے شراب دیا کہ اسپر ائیں بے جان مورتیاں بن کر راجہ اندر کے تخت

میں لگ جائیں۔"

گی۔ اور پتہ ہے اس راج سنگھاسن کی اصل معنویت کیا پیش کروں گی۔؟ پھر اس نے بڑی ڈرامائی انداز میں کہا تھا۔ ”یہ سنگھاسن دراصل ہے۔ عاقدت کا دل۔“ اور آپا اس وقت یہ فرض کیجئے کہ ہم چاروں آپا روزی آپا، دیپالی دی اور میں اس کی چاروں بڑی مورتیاں ہیں۔ اور کوئی راجہ بھوج اس تخت پر بیٹھنے کے لئے تو ہم اسے لٹکا سکتے ہیں۔ ٹھہرو۔ تمہارے اندر یہ۔ یہ۔ اوصاف ہیں۔؟“

دیپالی نے آنکھیں ملیں۔ جہاں آرار اور یاسمین کے بھوت غائب ہو گئے۔ سامنے تالاب کی منڈیر پر گونگی مالا جپ چاپ بیٹھی اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتے جا رہی تھی۔ دیپالی نے غیر ارادی طور پر نظریں ادھر اٹھا لیں۔ تلاب خاص کی شاخوں سے کیا بیتال الٹے لٹکے ہوئے تھے؟
دور ڈرائیو پر کار آ کر رکی۔ ریکان کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے پوچھ رہے تھے۔ امریکہ والی سین میم صاحب کہاں ہیں؟
کسی نے جواب دیا ”باگ میں۔“

نورگش باگ میں بہار کی آگ میں
بھرے دل داگ سے درد دل زور۔ رنگیلا کوٹور
اُدُ — اُدُ — پیارے —

مکاتب خاص کے نیچے لڑکیاں نزل کا گیت گھڑ رہی ہیں۔ یاسمین کٹھ پتلی کی طرح گردن ہلانا کر رہی پوری رقص میں مصروف ہے۔ جہاں آرار اور دیپالی نوابزادہ نیر الزماں کی بری کے جوڑے بوقت رہی ہیں۔

دھگھاس کو قد صول سے سمجھنا اگر ایک فضول خیال کی طرح اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بن مالی بن مالی۔
سندھیا کال آج تم کہاں سے آتے ہو۔
”بیٹھ جاؤ ریکان۔“

وہ اپنے نانا نوابزادہ فخر الزماں کے بوائے بھئے فرضی راجہ اندر کے نقلی تخت پر بیٹھ گیا ہانک دیپالی کا جی چاہا اسے لٹکاے۔ ٹھہرو تم اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ریکان نے ایک سکرینٹ سکھایا۔ ”صوف کرنا آج فیکٹری میں

یہ ہو گئی۔

”بنگلہ دیش کی تعمیر نو میں مصروف ہو؟“

وہ چہیں رہیں ہو کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔

دفعاً دیپالی کو محسوس ہوا اور پر دے چکے ہیں سے جہاں آرا جھانک رہا ہے اس نے غم سے زہر دہتی۔ میگم زہروریمان الدین احمد۔ مجھے ہیلوسی میشن نظر آنے لگے ہیں۔ مجھے اس چھاپا لوک راز جلد بھانگنا چاہئے۔ محفوظ۔ دور افتادہ پورٹ آف اسپین، پرسکون، غیر جنگل شوہر برسر ملت بین، خوش باش برازیلین بھادوچ آریا روزینا۔ ایٹ انڈین ملازمہ سٹریس سرتوتی، نیگرو جبرائیلیا س۔ ری اصل، راحت بخش آرام دہ دنیا ہے۔ بیتالوں کے اس مرگھٹ سے اتنی مختلف رہیاں ہر ہر قدم پر مال ایک ایک پرانا تھمہ دہرائے جا رہے ہیں اور جنات کافولوں کی مسلسل پوچھ رہے ہیں۔ اور سناؤں، اول۔؟ اور سناؤں۔؟

ریمان نے بھی نظریں اٹھا کر جہاں آرا کے کمرے کے درپے کو دیکھا۔ دیپالی پر نظر ڈالی اور انہیں جھانک کر کہا۔ ”مالا۔ مالا برابر آ۔ آکر کے مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کی بات فیر یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ہاں۔ کاش میں بھی اس کی بات سمجھ سکتا۔ کاش ہم سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے۔“

دیپالی۔ جہاں آرا۔ یاسمین مجید۔ تین عورتوں میں سے دو بڑی بڑی طرح ٹوٹیں۔ دیپالی نے آدتیہ کے سنگھاسن کی ایک موٹی بڑھکھ رکھ کر دل میں کہا۔

پالکی چولے۔ پالکی چولے ہو ہو۔ وہ آہستہ سے گنگنانے لگی۔

”دیپالی۔ میں نے آج سے پینتیس سال قبل تم سے آخری بار گانا سنا تھا۔ چند سنگ کے بھاٹک پر بی طرح گوھوے کے وقت۔“

”سنا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں۔ ریمان تم نے۔ تم نے اتنے شرمناک سمجھوتے کیسے کر لئے۔ کلکتے میں رہیاں بھی؟ وہ غم دغصے سے جھنجھلا کر رہ گئی۔“

”سمجھوتہ! کیا تم نے نہیں کیا؟ کیا تم نے پورٹ آف اسپین میں سمجھوتہ نہیں کیا؟“

”میں نے اپنا ضمیر نہیں بیجا۔“

”یہ بات تم کہہ سکتی ہو۔“ وہ بھی ہنسی بھلا گیا۔ عمر رسیدہ لوگوں میں قوت برداشت کم ہوجاتی ہے۔ اچھا۔ چلاؤ نہیں۔ لوگ سنیں گے تو کہیں گے دو جھکی بڑھے بڑھیا کیوں لڑ رہے ہیں۔“
ریحان نے تھلا کر سگریٹ اپنے پوٹ کے نیچے کھٹلا۔

”یہاں اتنی خونریزی ہوئی اور نتیجہ کیا نکلا؟ مغربی پاکستان سے آئی ہوئی بورڈ رازی کر محال کرا
ذمہ داری پور رازی نے اس کی جگہ لے لی۔“

”شٹ اپ۔ پورا اے سلی اولڈ ٹائم۔ یہاں کے حالات سے واقف نہیں۔ آجاتی ہیں امریکا
یہاں نصیحتیں کرنے۔“ ریحان نے ہنسا کر جواب دیا۔

”تم کسی پاگل خانے گئے ہو؟“ اس نے ذرا تیز آواز میں کہا۔ ”میں ایک مرتبہ اپنے شوہر لالت
ساتھ ایک پاگل خانے گئی تھی۔ برازیل تک شہر میں۔ وہاں ایک آدمی خود کو چار دانی سمجھتا تھا۔ دو
کہہ رہا تھا میں جیزس کرائسٹ ہوں۔ ایک عورت کا خیال تھا وہ مگر مجھ سے۔ ایک عورت کو یقین تھا کہ
گرینڈ فادر کھاک نکل چکی ہے۔ وہ مستقل جگہ جگہ جگہ کر رہی تھی۔ اسی طرح۔۔۔ رونو۔۔۔
سب اپنے آپ کو وہ سمجھتے ہیں جو ہم نہیں ہیں۔“

”معلوم ہے۔ اب آپ بہت عقلمند ہو گئی ہیں۔ مجھے درس دے رہی ہیں۔“

”رونو۔ ایک قدر سناؤ؟“ دیپالی نے غیر ارادی طور پر سٹگھاسن کے پایوں کی بات مانہ
مورتی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جب ہم لوگ نئے تھے پوٹ آف اسپن نیچے۔ چھوٹا سا ایک مکان کر لے کر
گلی کے سرے پر ہمارے سامنے ایک خوبصورت دو منزلہ ٹورس ڈسٹنگ کامکان تھا۔ اس کے نچلے برآمدے
اب بڑا بڑا دو دروازے تھے جیسے سفید بال، روکنگ چیمبرز پر بیٹھی ننگ کیا کرتی تھیں۔ جتنے
پادری اور ننان کے ہاں آتی جاتی رہتیں۔ وہ پابندی سے چربچ جاتیں۔ پاس پڑوس کے غریبوں کی امداد کرتی تھیں
بڑی دھوا تھوڑی ٹورس تھیں۔“

”دونوں بڑھیاں روز بچے ٹیکسی پر بیٹھ کر بازار جاتیں ان کا نیگرو باورچی ایک بڑا سا تھیلا
لے کر ساتھ جاتا۔ واپسی پر اس کا تھیلا سامان سے بھرا ہوتا۔ ایک روز میں نے سوچا میں اس جگہ اجنبی ہوں
میں بھی ان کے ساتھ سبزی ترکاری کی ان دوکانوں پر جاؤں گی جہاں سے اچھی چیزیں مل سکیں۔ کئی در
کل گئے۔ میں ان فرشتہ صفت بڑھیوں سے نہ مل سکی نہ ان کے ساتھ بانٹا۔ جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ ایک

جب وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر روانہ ہوئی ہی تھیں۔ میں نے سوچا دوسری ٹیکسی لے کر میں بھی ان کے پیچھے سی جوں
 میں پہنچ کر ان کے ساتھ ہی خریداری کروں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا اس دوسری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے۔
 ”میری ٹیکسی مارکیٹ سے گذر کر ڈائفرنٹ کی طرف چلی۔ اگلی ٹیکسی ایک ہوٹل کے سامنے جا رہی جس
 اندر سے جہازی تاج نکل رہے تھے۔ ڈرائیور نے ذرا حیرت سے مجھے دیکھا۔ وہ دونوں بڑھیاں اپنی گاڑی
 اتر کر ہوٹل میں داخل ہوئیں۔ برآمدے میں دس بارہ ملاٹوں کیساں صوفوں پر ایک قطار میں بیٹھی مسگریٹ پی پی
 ن میں تعجب سے ٹیکسی میں بیٹھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ بڑھیاں باہر آئیں۔ نیگرو باورچی تھیلا اٹھائے کھا
 تھ۔ دونوں اپنی ٹیکسی میں بیٹھیں اور واپس چلی گئیں۔ ڈرائیور نے ایک قبہہ لگا یا اور لولا۔ میں آپ ابھی شاید
 نئی نئی آئی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ یہ دونوں بڑھیاں پچاس سال پہلے یہاں کی مشہور طوائف تھیں۔
 دونوں نیواورکینز سے یہاں آئی تھیں۔ اب اس ہوٹل کی مالک ہیں۔ روز صبح اگر مجھے قحبہ خانہ کی آمدنی
 سب کتاب کرتی ہیں اور رات کی آمدنی کے نوٹ اس تھیلے میں بھر کر لے جاتی ہیں۔ اور آمدنی کا زیادہ حصہ
 مت خلق پر خرچ کرتی ہیں۔ بڑا بڑا پارٹی لوگ جب یہاں آتا ہے ان کے یہاں ہی ٹھہرتا ہے۔

”جب میں گھر واپس پہنچی۔ وہ دونوں اطمینان سے روکنگ چیمبر پر بیٹھی بائبل پڑھ رہی تھیں۔
 ”تو رونو۔۔۔ اکثر لوگ دوغلی زندگیاں گزارتے ہیں تم ماہوزیل ماریٹیل اور ماہوزیل ماری نہیں
 تم وہ نیگرو باورچی ہو جو وہ تھیلا اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ تم بھی شامل ہو۔“

”کیا تم شامل نہیں ہو۔؟ کیا تم کو ویسٹ انڈیز ہجرت کے بعد ایک دو ہفتہ بیسٹ سے شادی کر کے
 انوی گورنر جیل کے ڈنرز میں جانے کے بجائے پلانٹیشنرز کے مزدوروں میں انقلابی تحریک کی تنظیم نہیں کرنی
 بنے تھی؟ تم نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ تم تنگ چکی تھیں یا ڈز الوژن جو چکی تھیں یا اب تم بھی آرام اور آسائش
 خواہاں تھیں۔ چراغ مسلسل جلانے رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ اب تم محض زبانی یا تخمیلی بھردی
 ناہور لوگوں کی بے انصافی اور بے ایمانی پر خفا ہوتی ہو۔ مگر تم بھی شام جو چکی ہو۔ مسلسل علیحدہ رہنا بہت
 ہے۔ جو علیحدہ رہتے ہیں ان کو سسکی یا غصی یا بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔“

”میں نے اخباروں میں تمہارے شوہر کا نام ایک ڈوبار دیکھا ہے۔ وہ اس جزیرے کی سیاست میں حصہ لے
 رہے ہیں۔ میں مکن ہے کہ وہ ایک دن وہاں کے وزیر اعظم ہو جائیں اور تم پر اہم مسٹر ڈیمنٹی۔ اس وقت دیپالی
 میں تم سے ملنے آؤں گا۔ اور تم سے یو جیوں کا تم کتنی آزاد ہو۔ تمہارے میں یو جیوں کی میز پر رکھے ہو

میں تک ہیں جن پر زندگی نے اپنے تجربے کئے۔“

”لیکن ہماری طرح سب ہی تو بوجھ نہیں نکلے۔“ دیپالی نے دفعتاً بڑی کمزور آواز میں کہا۔ ”بہت

ہیں جنہوں نے اب تک چراغ جلائے رکھا ہے۔“

”آل لگ ٹوڈیم۔۔۔“ ریمان نے سگریٹ تالاب میں پھینکتے ہوئے جواب دیا۔

۴۲۔ ناصرہ نجمہ اسمرقادی

روح پرست گذرتی ایک اداس صورت لڑکی آہستہ آہستہ چلتی آکر تالاب کی منڈیر پر بیٹھ گئی۔

”آداب ماموں جان۔“ اُس نے ریمان کو سلام کیا۔

”صحتی رہو۔“

”آداب دیپالی ماشی“

”صحتی رہو۔ آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“ دیپالی نے تخت کی طرف اسے بلایا۔

ریمان نے ذرا رکھائی سے دیپالی کو معنی طلب کیا۔ ”یہ میری بہن راجد کی بیٹی ہیں۔ میں ناصرہ قلندر

سے ان کا ذکر کر چکا ہوں۔“

”ماموں جان پیدا نام بتائیے۔ جوں آراخانہ حور نے میرا نام ناصرہ نجمہ اسمر رکھا تھا۔ اور میں ر

ماشی سے مل چکی ہوں۔ جب یہ پہلی بار یہاں آئی تھیں۔ سن چونسٹھ میں۔ اکمل کی شادی۔ اکمل کی۔

کی آواز ڈوب گئی۔

”مجھے خوب یاد ہے۔ کسی تو ناصرہ۔؟“ دیپالی نے مجھے بوسے لہجے میں کہا۔

”آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ ویسٹ انڈیز سے آئی ہوئی ہیں۔ سوچا مل آؤں۔“

”بہت اچھا کیا۔ مجھے بہت خوشی۔ بہت خوشی۔ آج کل کیا کرتی ہو؟“

”پہلے جنگ آزادی میں لڑ رہی تھی اب ایک گریڈ کالج میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتی ہوں۔ اسی کالج

آپ نے اور جہاں آوارہ حال رہے پڑھا تھا۔“

”تم جنگ آزادی میں لڑیں۔“ دیپالی نے گویا خود ایک اسٹیٹمنٹ دیا۔

”جی ہاں۔ جب پچھلی مرتبہ آپ یہاں آئی تھیں۔ سن چونسٹھ میں۔ پاکستان ایر فورس کے پائلٹ آفیسر اگل مرشد زادہ کی شادی میں شرکت کے لئے۔ اسی تخت پر اسی طرح ایک شام میں نے آپ سے کہا تھا۔ گوہم مغربی پاکستان کی زیادتیوں کے خلاف پھر کمر کھڑا کرتا ہوں اور پاکستان کی حفاظت کے لئے کٹ مریں گے۔“ وہ تلخی سے ہنسی۔

”ناصرہ۔ تمہاری والدہ رابعہ کیسی ہیں؟“ دیپالی نے ٹھکی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

”میرے والدین بحیرت ہیں۔ میرے ماموں جان بھی۔ جیسا کہ آپ ملاحظہ کر سکتی ہیں۔ بحیرہ عافیت ہیں۔ اس نے ریحان پر ایک حقیر آمیز نظر ڈالی۔

یہ لڑکی ریحان سے کس حد تک متنفر ہے۔ اور وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شاید وہ اس منہ بھٹ، منہ زور، تلخ مزاج، بد زبان نئی پیرھی سے ہارنا چکا تھا۔ ان سے خائف تھا۔ یا اس کا ضمیر مجرم تھا۔ دیپالی کو وہ وقت بڑا ہی دخت انگیز معلوم ہوا۔ مجھے یہاں سے بھاگنا چاہئے۔ سیاسی گفتگو کو ٹال کر وہ کچھ دیر تک ناصرہ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

اسکوڑکی گڑ گڑا ہٹ۔ فرقان نے اسکوڑا کر سنگھاسن کے بالکل قریب روک دیا۔ ”کیا اڈا ہو رہا ہے؟“ اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

”ہاں۔ تمہاری ہی کسر تھی۔ آؤ۔“ ناصرہ بولی۔

فرقان، دیپالی نے پہلی بار زور سے دیکھا اپنے انازا اور پچال ڈھال میں باپ سے بہت مختلف تھا۔

”یہ پہلے بھوکے پیرھی کے ہمدرد شامل تھے اب پیٹ بھری پیرھی کے لیڈر بننے والے ہیں۔“ ناصرہ نے کہا۔

فرقان نے اسکوڑ پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔ ”شانتی! شانتی!“ اس نے منہس کر کہا۔

”شٹ اپ بوگس خونڈی سی فیسٹ۔“ ناصرہ نے تلخی سے جواب دیا۔ ”معاف کیجئے گا دیپالی دی۔

ہم لوگ ایک بہت بڑے آگ اور طوفان سے ہو کر گزر رہے ہیں جس کے مقابلے میں آپ لوگوں کی برطانیہ کے خلاف جدوجہد اور تقسیم ہند کی خونریزی ایک پکنک تھی۔“

”شاید یہ ہماری خوشی نہیں تھی۔“ دیپالی نے عجز سے کہا۔ ”ہم سمجھتے تھے نذر الاسلام کے درد ہی ہم ہی لوگ تھے:

”ہم نے بڑی تباہی دیکھی۔ PACIFIST کے بھیس میں کیا لوگ خود سے سمجھتے نہیں کرتے؟ اس پسندناغیر

کیا کہتا ہے؟ "ناصر نے پوچھا۔" انتخاب کیا ہونا چاہئے؟ امن پرستی یا فلسطینی مجاہد؟ امن یا آپ کے کسٹلائٹ؟
 "یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ تم شاید اب بھی ہتھیار نہیں ڈالنا چاہتیں۔ تم شاید ٹائیگر صدر کی کوآئیڈیلایز
 کر رہی ہو۔ تم مسلسل سپیم انقلاب کی بات کرتی ہو۔ ناصرہ آپا تم بہت MIXED UP ہو۔" فرقان نے
 اطمینان سے کہا۔

"یہ ایک بنیادی سوال ہے فرقان احمد۔" ناصرہ جھک کر بولی۔ "کسی دوسرے کو MIXED UP
 کہنا ادھیچھا ہتھیار ہے۔ دیپالی ماشی۔ یہ سارا خاندان۔" اس نے ارجمند منزل کی طرف اشارہ کیا۔ "اور ہنزلا
 لاکھوں مارے گئے۔ میں نے مرگ انبوہ دیکھا۔ میں نے ٹا کے مذہب کاروں دیکھا۔ میں نے بنگالی پنجابی کی نفرت اور بنگالی
 بیماری کی نفرت کا سامنا کیا۔ سیاسی لیڈر کاروں دیکھا۔ فرقان احمد! جس وقت ہم یہاں مشین گنوں کا سامنا کر رہے تھے
 تم اپنے باپ کے پیسے کی بدولت لندن میں مصروف عیش تھے۔" وہ دریاغ کی طرح نظر انداز کر رہی تھی جیسے وہ
 اس جگہ موجود ہی نہ ہوں۔ چند منٹ بعد وہ اٹھ کر نزدیک روٹش پر شہنے لگے۔ دیپالی نے ذرا بے آرامی سے پہلو بدلا۔
 دیوانی مالا جو اس دوران میں کوشی کے اندر جا چکی تھی۔ دوبارہ کٹھ پتلی کی طرح سرطانی آکر سنگھاسن کے قریب تالاب
 کی ایک ریڑھی پر بیٹھ گئی اور پھٹی پھٹی خالی خالی نظروں سے ان تینوں کو دیکھنے لگی۔

اب ناصرہ فرقان سے کہہ رہی تھی۔ "ہرموزم اور QUIETISM اور امن پرستی بڑے خوبصورت الفاظ
 ہیں۔ لیکن تمہارے دلیمین اور ساں پٹیر اور حریمی نیتم آج تک ایک ہندوئی کی گولی نہ روک پائے۔ گاندھی نے جرمو
 یہودیوں سے کہا تھا شلر کے مقابلے میں انہسا استعمال کریں۔ ہا ہا ہا۔ جب یہاں ڈھاک گھرا ہوا تھا اس وقت میں دلیمیم
 اور برٹریڈ رسل کی دہائی دیتی؟ اور تمہارے جانج فاکس کی؟ اور تمہارے ٹاسٹائی کی؟"

"ایمرسن۔ جانتی ہوں ناصرہ آپا ایمرسن نے کہا ہے کہ جوگ میں دلچسپی ایک کچے اور ایمپور ذہن کی علامت ہے
 ایک آدمی کے قتل کی سزا بچاؤ ہے مگر ہزاروں لاکھوں قتل کر دئے جاتے ہیں۔ ان کے قاتل قومی ہیرو اور جانا باز
 اور ماروٹن کے سچوت کہلاتے ہیں اور پھر ایک اجتماعی قتل کو ناجائز قرار دینے کے لئے ایک اور اجتماعی قتل کر
 جاتا ہے۔ ہم بنگالیوں کو ایک کمزور روڈ میٹک شعر پرست بودی توڑ سمجھا جاتا ہے مگر ٹیوٹیو سے لے کر ٹر سٹ
 موڈ منٹ تک اور جب سے کئی باہنی اور کسٹلائٹ ٹرک تک سب سے زیادہ تشدد ہمیں ہوا ہے۔ فرقان نے کہ
 "اتھا۔ تو میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں۔" ناصرہ نے جوش سے بات کی۔ "آئین اسٹائن بڑے امن
 تھے کیا اگر وہ اس وقت زندہ ہوتے تو امرائیسٹی EXPANSIONISM کے موافقت نہ کرتے؟ مزدور

غرب کے جتنے یہودی جتنے زیادہ عالم فاضل اور ہیومنسٹ ہیں اتنے ہی زیادہ وہ فلسطینیوں کے مخالف ہیں۔
 ”مغرب میں تھوڑے سے یہودی انٹلیجنٹس کے اعتدال پسند بھی ہیں۔ دیپالی نے پہلی بار بحث میں حصہ لیا۔ وہ ایک
 بت بعد اس مانوس خالص بنگالی ”اڈے“ میں شریک تھی۔ مگر اس زبردست جزیشن گیپ کا بھی اسے شدید لہسا
 نا جو اس وقت اس کے لوران دونوں کے درمیان حائل تھا وہ ان سے بحث کرتے ہوئے ذرا جھجکتی تھی۔ غالباً
 ٹیٹ آف ڈیٹ ہو چکی تھی۔ ماضی کے ”اڈوں“ کا پرانا ساتھی ریخان اپنے خیالات میں کھو یا ڈر روشن پرٹنے میں
 عروت تھا۔ اور وہ بھی اب اس کا ساتھی نہ رہا تھا۔

”ہرزہمی رویہ نکلا س کی پیداوار ہے۔ امن پرستی سے بھی چند طبقوں کا فائدہ ہوگا۔ آپ پہلے فیکٹری اور بی
 جائے اور پھر امن کا پرچار کیجئے۔“ ہونے اپنے ماموں اور ماموں زاد بھائی پر کھٹی چوٹ کی۔ فرقان خوش دلی سے
 ہنستا ہ۔ ”اور اب شاید تم مذہبی بھی ہوتے جا رہے ہو۔“ ناصرو نے کہا۔

”مذہب میں امن کی اصل رصیح ہے۔ فرقان نے سنجیدگی سے جواب دیا
 ”یقیناً! دیپالی آئی۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے۔ سی۔ آئی۔ اے نے سوامیوں کے ذریعہ کتنا بڑا حال آدمی بنایا
 میں پھیلا دیا ہے؟“

”ناصرہ آیا۔ ڈونٹ بی ڈانٹ“ فرقان نے برطانوی لہجے میں کہا۔ ”کسی کو چینک آئی اور تم نے کہا یہ
 سی۔ آئی۔ اے کی کارستانی ہے۔“

”اور دمکتے کامیاب ہیں“ ناصرو کہتی رہی۔ ”وہ ایک موٹا مسخرہ بال لوگی جو امریکہ میں ہے۔ ایک مشہور
 لیٹرن فوجوان انقلابی، نیولفٹ کالیڈر اس کا چہرہ بن گیا کیا نام اس کا میں نام بھول رہی ہوں اور چلا بنے
 کے بعد اس نے پریس کو بیان دیا۔ — THE REVOLUTION IS OVER_BABY!

”ناصرہ آیا۔ بات یہ ہے کہ اب شروع ہی میرا ہوسے اور حسین“ بھی اور حسین کی نسل کے آٹھوں QUIETIST
 نام۔ وہ اصل QUIETIST تھے اور حشٹی صوفیاء۔“

”افیم کا تم پر پوری طرح اثر ہو چکا ہے۔“ ناصرو نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”مذہب کی امن پرستی! مغرب میں
 دونوں طرف کی فوجوں کے ساتھ فوجی پادری جاتے ہیں۔ ایک ہی خد سے فتح کی دعا مانگتے ہیں جو دونوں طرف کے مرنے
 والوں کے لئے ایک ہی خدا اور اس کے بیٹے سے جنت طلب کرتے ہیں۔ انڈیا پاکستان کی جنگوں میں ایک طرف کے جوان
 دہک کی تصویریں ساتھ لے جاتے ہیں۔ سمت سری اکال کے نعرے لگاتے ہیں۔ دوسری طرف نعرہ نکلیں اور نوجوان

اور یہاں تو سن اکہتر میں دونوں طرف اسلام ہی اسلام تھا۔ "ناصرہ چپ ہوگئی۔ پلاسٹک کے نیچے گھبریاں دھڑہی تھیں۔ سلسلے میں سرخ کنول کھلے تھے۔ دیپالی کو خیال آیا الیبر کا میونے کہا تھا۔ انسان کے مسلسل بہیم سوالات اور کائنات کی مکمل خاموشی۔

ناصرہ پھر گرج کر لوئی۔ کبھی جرج آف انگلینڈ نے یا یونوپ اور امریکہ کے قومی کلیساؤں نے ان جارجانہ لڑائیوں کو ڈناؤنس کیا جو ان کے لوگوں نے ساری دنیا میں لڑیں؟ پھلی جنگ میں پوپ نے تاسیوں اور فسطائیوں کو ڈناؤنس کیا۔؟ اور یہاں تو۔ ہمارا یہ پورا دیس ہی مولویوں کا دیس ہے۔ پاکستان کے علماء نے اس جنگ کو ڈناؤنس کیا؟ دونوں طرف ایک سے ایک بڑے مولانا موجود تھے۔ یاسمین خالد جرم کی مثال میں کروں۔؟

"کیا مثال۔؟" فرقان نے اب ذرا دھیان سے پوچھا۔

"یاسمین خالد، شاید تمہاری پیدائش سے بھی پہلے ولایت چلی گئی تھیں۔ سگن گچھے کے مولانا مجید اللہ کی بیٹی۔ پہلے انہوں نے رقص اپنا کیری بنایا۔ پھر انہوں نے ولایت میں ایک انگریز فیشن ڈزائینر سے شادی کر لی۔ مولانا مجید اللہ نے ان کو ماق کر دیا۔ حکم صادر کیا کہ کبھی ان کو اپنی شکل نہ دکھائیں۔ یاسمین خالد کے اپنے لاشعور میں مولویت رچی ہوئی تھی ان کو معلوم تھا کہ انگریز فیشن ڈزائینر جرد ایڈرین بلونٹ سے ان کا نکاح قطعی ہوگس تھا ایک FARCE ایک پاکستانی نقلی مولوی صاحب، جو دراصل ایک دوست تھے اور گواہ لوگ سب نشے میں آوٹ۔ تو احساس جرم نے یاسمین خالد کو مستنا شروع کیا۔ پھر اپنی لڑکی کو اپنی اجازت سے مجبوراً انہوں نے عیسائی بنوایا۔ پھر وہ لڑکی نیو ڈاڈل بن گئی۔ یاسمین خالد کو ان کے احساس جرم نے مار ڈالا۔ ان کا ضمیر ان کو کھا گیا۔ ٹھیک۔؟ مجھ کو یہ سب اس طرح معلوم ہے کہ جب ان کو دوسری بار ویسٹ جرمی میں ہارٹ ایٹک ہوا انہوں نے امی کو بڑا اندوہناک خط لکھا تھا۔ مفصل۔ اور آخر میں لکھا تھا کہ رابعہ آیا اگر میں پردیس میں مچاؤں یہاں نہ جانے میری لاش کا کیا حشر ہو۔ میری موت کی اطلاع پر ڈھلکے کی کسی مسجد میں میری غائبانہ نماز جنازہ ادا کروا دیجیے گا۔ اچھا تو مولویوں نے یاسمین خالد کو محاف نہ کیا۔ لیکن جب یہاں کی ہزار ہا لڑکیاں ریپ ہوئیں۔ سینکڑوں کو مجبوراً طوائف بنا چڑھا تو عالم اسلام کے کسی مولوی نے کچھ نہ کہا۔" ناصرہ چپ ہوگئی۔ اس کا چہرہ تمنا رہا تھا۔

یہ لڑکی اصل باغی ہے۔ بد روہی۔ ہم لوگ شاید اس حد تک باغی نہیں تھے۔ دیپالی نے سوچا۔ ودرہی

”اور آپ کو معلوم ہے دیپالی ماشی۔ لوگوں کو کس طرح مانا گیا؟ ان کو اسپتال لے جاتے تھے وہاں کرسی بھر کر ان کے جسم کا سارا خون نکال لیا جاتا تھا۔“ دفعتاً ذرا وقطار رونے لگی۔

AND WOMEN MUST WEEP

AND WOMEN MUST WEEP

دیپالی نے دل میں دہرایا اور خود اپنے آنسو پونچھے۔

”تو پھر کیمیں نہ ماتی۔ میں نے بھی کو میلا میں اپنے پستول سے ایک پنجابی فوجی سپاہی کو گولی مار دی۔ اور جاگنی کا کرب، اس کا ترپنا اور اس کا مرتا ہوا چہرہ۔ مرتا ہوا چہرہ مجھے بڑا خوب میں دکھائی دیتا ہے۔“

تی رہی۔ ”کیا کرے۔ انسان کہاں جائے؟ کس طرف جائے۔“ اس نے آنسو خشک کرتے ہوئے پوچھا۔

”ناصرہ آیا۔“ فرقان نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے لندن میں ایک بہت بڑی بھائی فلم دیکھی تھی۔

فیر انٹی وار فلم PATHS OF GLORY پہلی جنگ عظیم کے متعلق اس جنگ کے زمانے کا ایک

ایلی مارلین دونوں طرف منقول تھا تو دیپالی انٹی۔ اتحادی سپاہی ایک جرم لڑنے کو بٹلاتے ہیں اور

سے ملی مارلین گواتے ہیں۔ اور گاتے گاتے وہ رونے لگتی ہے اور سپاہی خود بھی جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر

ایک۔ شاید نوعمر بھائی سپاہی ہے جو بہت خوفزدہ ہے۔ اور وہ مورچہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

سے پکڑ کر واپس لاتے ہیں۔ بھگوڑے کی سزا موت ہے۔ وہ بیمار پڑتا ہے اسے فیلڈ ہسپتال میں داخل

ہیں۔ اس کا علاج کرتے ہیں۔ جب وہ ذرا بہتر ہوتا ہے اسے اسٹریچر پر ڈال کر میدان میں لاتے ہیں۔ پھر

انوجان کو ایک کھمبے سے باندھ دیتے ہیں۔ اور پھر فوجی قانون کے مطابق اسے گولی مار دیتے ہیں۔“

ریجان واپس آچکے تھے اور گلاب خاص کے نیچے کھڑے یہ فقرہ سن رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”میں بھی بھگوڑا ہوں۔ ناصرہ۔ تم۔ اور دیپالی تم۔ میرے لئے جو سزا چاہو تجو بڑ کر لو۔“

بڑا دہشتناک سناٹا چھا گیا۔ شام کی ہوا میں جھاؤ کی نازک ڈالیاں سرسرا رہی۔

ناصرہ نے سر اٹھا کر پہلی بار ذرا نرمی سے اپنے مضمحل ماموں پر نظر ڈالی اور دھیرے سے ہب ”لیکن ماموں

کیا روسی افواج ریورڈپ کے عوامی محاذ والوں کی سرفروشی کے بغیر فسطائیت کو سہرا جا سکتا تھا؟

عی جنگ بھی جرم ہے؟“

”یہ سلسلہ لانتا ہی ہے؟“ باپ کے بجائے فرقان نے جواب دیا۔ ”البر کا میونے جنگ کے فوراً بعد

لکھا تھا کہ میں کسی ایسی سچائی کو منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جس کی رو سے بالواسطہ یا براہ راست کسی کی زندگی کی قربانی کا مطالبہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اس وقت دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا ٹیوکلیر عہد میں داخل ہو چکی تھی۔“

اوپر جہاں آوارہ کے میڈروم کی کھڑکی کھلی۔ تیز روشنی کا راستہ ساتالاب تک بن گیا۔ زہرہ نے دیر میں سے جھانکا۔ پھر اس نے آواز دی۔ ”اڈا ختم کرو۔ کھب سے یاسین یادگار کیٹھی دلے کا خون آیا ہے۔ وہاں لوگوں کا ڈر پرا انتظار کیا جا رہا ہے۔“

”آ۔ آ۔ آ۔“ تالاب کی سیڑھی پر بیٹھی گونگی مالا ترائی۔

۳۳

رچرڈ بارلو

ڈنر کی طویل میز پر بہت بڑھیا دلالتی کھانا سرو کیا جا رہا تھا۔ ہال کے ایک کونے میں پھولوں سے سجی یا سمن بلونٹ موجود کی تصویر رکھی تھی۔ شہر کے اہم انٹلکچوئیل اخبار نویس، ادیب، چند وزراء اور باقی نئی دولت مند جنگل دہشی اپہ کلاس کے مرد اور عورتیں چھری کانٹوں سے کھانے کھاتے ہوئے مصروف گفتگو تاریخ کے اسباق سے انسان کی نصیحت حاصل نہ کرنے کا نام تاریخ ہے۔“ بھری نقاب مچھلیوں اب بھی چھپتا مار رہے ہیں۔

کھانے کے بعد وہ سب جا کر ایوان نشست میں بیٹھ گئے۔ ریحان الدین احمد بشارک اسکن کی سنا شیروانی، چوڑی کارپا نجمہ سلیم شاہی جوئے، سلوڈ گروے ہال۔ پہلے سے زیادہ ہینڈ سم نظر آ رہے تھے اس جگہ جگمگاتے مجمع میں اب بھی بیرونے ہوئے تھے۔ اہم، کامیاب، دو لختند۔ کل صبح ارجمند منزل۔ بریکفا سٹکی میز پر وہ صاف گوتی سے کہہ رہے تھے۔ میری موجودگتی کی روح خوش ہوگی جن کے ساتھ اٹا تیا نے بے انصافی کی تھی۔ ان کی جائداد ہڑپ کر کے ان کو ایک غریب کسان سے بیاہ دیا تھا۔ مگر قدرت۔ اب ان کے ساتھ انصاف کیا۔ وہ یہ سن کر بھونکتی رہ گئی۔ انسان کا ذہن، انسان کا دل و دماغ قطعاً نا فہم ہے۔ انہوں نے کہا تھا۔ دیکھو میں نے مدتوں پہلے متحدہ بنگال میں جوتیاں جٹھائیں۔ جیل کاٹے پھر

نگال میں۔ پھر جب مجھے وہاں اور یہاں چانس ملائیں اسے دونوں ہاتھوں سے قبول نہ کرتا؟
شام نہرہ نے کہا تھا فرقان بھوکی بیڑھی کا شاعر بننے جا رہا تھا اب وہ اس ہیٹ بھری بیڑھی کا لیڈر ہوگا۔
کھانا نہایت لذیذ تھا رکتب کے چیف شیفت نے بہترین فرانسیسی دشین تیار کی تھیں۔ دسپالی نے دوبارہ
سوچا اس "جشن یاسین بلونٹ" پر کتنا بے تحاشہ روپیہ خرچ کیا گیا ہوگا۔ جبکہ خود یاسین نے برسوں در در کی
ٹھوکریں کھائیں اور کارخانوں میں مزدوری کی۔

سیاہ چاند پہاڑ کی چوٹی سے نکل کر پاش پاش ہو گیا۔ یاسین تم کیسکی کا پھول تھیں جس نے سانپوں کو
اپنی اور کھینچا۔ زندگی کے سانپ تمہیں ڈس گئے۔

اس کے قریب ایک گردنہ پکستان اور جنگلہ دیش کی سیاست پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔ "ہم نے یہ کیا۔
انہوں نے یہ کیا۔"

انگریز یا فرانسیسی یا جرمن کہتے ہیں۔ ہم نے یہ جنگ لڑی۔ ہم نے وہ فتح حاصل کی۔ ہم نے فلاں ایکٹ
پاس کیا۔ اس سب کو نیشنلٹی کی ہسٹری میں "ہم" کہیں نمودار نہیں ہوتا۔ مغلوں نے یہ کیا۔ ہندوؤں نے
یہ کیا۔ پہلے انڈیا اور پاکستان الگ الگ "ہم" تھے۔ اب بنگلہ دیش اور پاکستان الگ الگ "ہم" ہیں۔
اچانک اس نے خود کو کہتے پایا:۔ "اگر جناب صاحب نے پاکستان بنایا ہوتا تو آج بنگلہ دیش
بھی نہ ہوتا" پھر وہ خاموش ہو گئی۔ اودو سوچنے لگی۔ "مراٹھیا" کا تصور بھی باقی ہندوستان کے قوم
پرستوں کو دہشت پسند ہندو بنگالیوں نے دیا تھا جو تحریک پسند کالی کے روپ میں شک کی پوجا کرتے تھے اور
دیہی ماں کے قدیم دراوڑی تصور کے پرستار تھے۔ اور ان ادیبوں دہشت پسندوں میں جن کو انگریزوں نے
ٹرسٹ کہا اور ہندوستانوں نے انقلابی۔ کافی اینٹی مسلم بھی تھے۔ اور نیکم چندر کا آئندہ ٹھکانہ کا
آدرش تھا۔ اور "مجھرا لوگ" کی سیاست اور "مسلم اشراف" کی سیاست کے CROSS-CURRENTS
نے پاکستان بنایا۔ اور پاکستان کی سیاست نے بنگلہ دیش۔ اور انفرادی طور پر مختلف لوگوں کی شخصیتوں
اور کرداروں اور مزاجوں اور اعمال و افعال کے CROSS-CURRENTS کے اثر سے افراد کی ادر قوموں کی
زندگیاں نئی اور گہرائی میں۔

وہ جھٹلا کر سامنے دیکھنے لگی جہاں آکر سٹراٹج رہا تھا۔ اور فلور پر رحمان الدین احمد کا کیس بروج پلٹ
پٹا فرقان بھڑا نئی سفارت خانے کی ایک لڑکی کے ساتھ معروف رقص تھا۔ اس لڑکی کے کی تازہ ترین ذہنی

جدید، عصری مغرب کی نوجوان نسل کے ذہنی ردیوں نے کی تھی۔ وہ برطانیہ اور فرانس کے "نیولٹ" اور طلحہ علی کے دور کے بعد کی پروڈکٹ تھا۔ کیا اس امن پرست اٹھکچوٹیل فرقان احمد کو معلوم ہے کہ ایک نانا میں انقلابی نظیوں نکھنے کی سزا کالاپانی تھی؟ کیا ہم پر تاریخ کے دروازے بند کر دئے جائیں گے۔ میرے چچا دیش چندر سرکار بھانسی کے تختے پر کیوں لٹک گئے؟ ان کا نام اب کسے یاد ہے؟ یا اشفاق اللہ کا؟ اور اس باغی نامہ و نجم اسحر کا کیا ہوگا؟ کیا بہت جلد وہ خود بھی اپنے موجودہ خیالات کو ترک نہیں کر دے گی؟ کیا کسی ایسے رویتے کے BACKLASH کے طور پر کھ کوئی نیا رویتے نمودار نہیں ہوگا؟ نامہ و کب تک باغی رہ پائے گی رجب انقلابی مسلسل ایک دوسرے کو REVISIONIST کہہ رہے ہیں جب خود انقلابی اعتدال پسندوں کو اتہا پسند ایک ESTABLISHMENT بکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب لیڈروں کے ذاتی کرداروں اور ان تعصبات، کمزوریوں اور ان کے مزاجوں اور اعصابی کیفیتوں کا اثر ان کی رہبری پر پڑتا ہے؟ پائلیٹ جو مسافر بردار طیارہ اڑاتا ہے اس کی صحت اور اعصاب کا برابر موازنہ کیا جاتا ہے۔ مگر لیڈر کی ذہنی اور اعصابی صحت کو بالکل نظر انداز کیا جاتا ہے۔

ہم لوگوں نے، ہماری جنریشن نے کیا کیا۔؟ اب ایسا لگتا ہے کہ ہم لوگ پچ ہائیکر تھے راستے کے کنارے کھڑے آنگوٹھے دکھا رہے تھے۔ ایک کارڈ کی اس نے لفٹ دے کر ماسکو سپنچا دیا۔ دوسری کارڈ کی اس نے واشنگٹن۔ کچھ لوگ اونٹ پر بیٹھ کر مکہ مدینہ واپس گئے۔ کچھ سیل گاڑی پر بیٹھ کر بنارس۔ میرے لئے جو کارڈ کی وہ ذرا آگے جا کر ہی فیل ہو گئی۔

بنگال کی دلشادومت میں بہر مرد کرشن اور بہر عورت رادھا کی تصویر ہے۔ گو اس کلویہ بات معلوم نہیں۔ تو کیا ریجان کرشن تھا اور میں رادھا۔؟ لوکپن میں میں ہی سمجھا کرتی تھی۔ ابھی گرمیاں آئیں گی اور بہان میرے اس پیارے حسین دسین میں قدم کے دل کی شکل والے پتوں میں زرد پھول کھلیں گے۔ لاکھ کے پیڑ پھولوں سے لد جائیں گے۔ سلطانہ چمنپا کے گی۔ برسات آئے گی۔ ساگوان کے سفید پھول۔

"آپ، مجھے مسٹر ریجان الدین احمد نے بتایا کہ بھٹانوی راج کے خلاف بنگال کی انڈر گراؤنڈ انقلابی تحریک میں شامل رہ چکی ہیں۔" ایک صحافی نے قریب آکر پوچھے ہوئے اس کا سلسلہ خیالات منقطع کر دیا۔ "کل صبح میں آپ کا انٹرویو لے سکتا ہوں۔ مع تصویر۔"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ چلے جائیے میرے پاس سے۔" اس نے تقریباً چلا کر دشت سے جواب دیا۔

نک کہ اس کی طرف دیکھنے لگے۔

آئی ایم سوڈی مسز سین۔ ”صحافی نے نرمی سے کہا اور وہاں سے نکل گیا۔

”عجیب بد مزاج بڑھیا ہے۔“ اس نے باہر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔

اب گلپوش ڈانس پر تقریریں شروع ہو چکی تھیں۔ مادام یاسمین بلونٹ مرحومہ کو خراج عقیدت و صوغ تھا۔ ان کے فن کی عظمت پر روشنی ڈالی جا رہی تھی۔ ابھی اس سے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا گیا۔ آخر اسی مقصد کے لئے اسے آئی دور ویسٹ انڈیز سے مدعو کیا گیا ہے۔ عجیب بات تھی۔ اس سے ان میں آج تک کسی نے گانے کے لئے نہیں کہا تھا۔ شاید لوگ یہاں کب کے بھول چکے تھے کہ وہ عباس لیلین شاگرد تھی۔ کہ ایک زمانے میں اس کے ریکارڈ گھر بچتے تھے۔ کہ وہ آل انڈیا ریڈیو ڈھاکہ سے گاتی تھی۔

و پاکستان ڈھاکہ بنا اور اب ریڈیو بنگلہ دیش۔ آواز کی لہریں۔

ریحان نک نے یادگار کیٹی والوں سے نہیں کہا تھا کہ وہ تقریرات میں کسی روز اس کے گانے کا پڑگلم ہیں۔ ہر طرف عجیب کنفیوژن تھا۔ ریحان اب بائی فنانس کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ ناقابل یقین! وہ ہال کے ایک کونے کی نشست پر جا کر بیٹھ گئی۔ اب ایک اور نوجوان اس کی طرف آیا جھک کر ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس مادام یاسمین بلونٹ کی ڈائری ہے۔ کیا آپ اسے میں عنایت کریں گی؟ بڑے شاندار طریقے سے کتابی صورت میں چھپوائیں گے۔ وہ ایک ادبی شاہکار ہو گا۔“

دیپالی کا چہرہ طیش سے سرخ ہو گیا۔ اُس نے زہریلی نظروں سے نوجوان کو گھورا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی جواب دہ دیا لوری تیز چلتی ایوان نشست سے باہر نکل آئی۔ اور برآمدے کے آخری در میں جا کر کھڑی ہو ماضی جاننے کے درختوں پر پونم کا چاند نکل آیا تھا۔ وہ چاند بھی بہت پشیمان معلوم ہوتا تھا جس طرح ان تھی۔ اور اندر سے دل ہی دل میں ریحان نام تھا۔ اور اور یاسمین تو اتنی کھٹائی تھی کہ اس دنیا ہی سے نکلی تھی۔

در کے نزدیک بھی چھوٹی میز پر ایک سفید فام نوجوان تنہا بیٹھا ڈنر کھا رہا تھا۔ ایک خاتون کو کھڑا دیکھ کر مغربی تہذیب کے مطابق تعظیماً وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”اندر اتنا ہجوم ہے کہ میں گھبرا کر باہر آگئی۔“ دیپالی نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ ”اس عمر میں انسان زیادہ بھرتا برداشت نہیں کر سکتا۔ میں بہت دور سے آئی ہوں۔ ویسٹ انڈیز سے۔ یہاں بیٹھ جاؤں

”شیور۔ میم۔“

”وہ مقابل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔“

”میں کرسٹوفر ٹیگرٹ ہوں۔ میں یہاں سیر کے لئے آیا ہوں۔ اس وقت لپے ایک دوست کا انتظار
ہوں۔ اب تک نہیں آیا۔ لپے لیجئے وہ آ رہا ہے۔“

ایک اور سفید فام سنہرے بالوں والا نوجوان لمبے لمبے ڈگ بھرتا اگر مزے کے قریب کھڑا ہو گیا۔
”رجرڈ بارلو۔“

”مسز سین۔“ ہاڈ ڈو پوڈو۔“

”ہو۔“ مسز سین نے کان کھڑے کئے۔

”یہ واقعی بہت مختصر دنیا ہے۔ میں تمہارے والد کو جانتی ہوں اور تمہارے بھتیجے چند روز
ایچھنزر کے راستے میں ملی۔ تمہارا سوتیلا بھتیجا سوامی آتم انڈسٹری پریمی۔“

”اوہ۔ آتم انڈسٹری کریزی گائے۔“ ڈگ بارلو نے شفقت سے مسکلا کر سر ہلایا۔

”وہ اگلے مہینے رشی کیش میں تمہارا انتظار کرے گا۔“ مسز سین نے کہا۔

ڈگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ اٹھائیس سال کی عمر میں کامیاب
انڈسٹری ڈیولپر بن چکا تھا۔ مگر زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اس کے دوست کرسٹوفر نے اس کے لئے میرے
کا آڈر دیا۔ ڈگ نے کہا۔ ”آر تھر کو لیس کرنے کہیں پر لکھلے ہے کہ اتفاقات کا سلسلہ عقل چکر ادا ہے۔
دیکھئے مسز سین۔ آپ کی میرے بھتیجے اور مجھ سے ملاقات!“

”ساری زندگی اتفاقات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔“ دوسرے انگریز نوجوان کرسٹوفر ٹیگرٹ۔
بہت زیادہ ذہین معلوم نہ ہوتا تھا۔ فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔

میرے لئے پھلی کی ڈش ملا کر رجرڈ بارلو کے سامنے رکھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سبزی
چکا ہوں۔ میرے لئے سلاڈے آؤ۔“ یہ پھلی۔ اس نے دیپالی کو مخاطب کیا۔ ”کیا معلوم میری مرحو
پھو بھی مس ایس بارلو یہ پھلی رہی ہوں۔ وہ گارڈ ہلڈ میں خشری تھیں۔ اور لن کی بھی پھو بھیاں۔ میری
گریٹ کانت۔ مشنری ٹیل بارلو سیتا پور میں پھنڈے سے مرے۔ اور مس ہاڈ بارلو چین میں مشن چلاتی تھیں۔
باکسٹریفادات کے دوران چینوں نے مار ڈالا۔ آٹ ایس کو کاروبار میں کیونٹ قبائلی حملے نے قتل کو دیا۔“

اپنے خیال میں شہید ہوئیں۔ اس وقت رو پہلے پراگائے فور کے ہالے پہنے لیسوئج سح کے سامنے
میں گا رہی ہوں گی۔ میٹھوڑ سٹ محمد۔

THERE IS A HAPPY LAND

FAR FAR AWAY

WHERE THE SAINTS IN GLORY

STAND BRIGHT BRIGHT AS THE DAY."

وہ لگنانے لگا۔ وہ متواتر شراب پی رہا تھا اور اس کا عرق آلود چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا یہ منتر
یہ آسٹریلیا میں بھی اسکول میں یہ حمد گایا کرتا تھا۔ لیکن ہی لینڈ کہیں نہیں ہے۔ یورپ، امریکہ،
تھان، بنگلہ دیش، انڈیا، پاکستان۔ کہیں نہیں۔ اور میرا سوتیلہ بھتیجا سوامی آٹم آئنڈ شکر کری
ہے ہم سب اپنی اپنی کمرہوں کا پھل۔ کھاد ہے ہیں۔ اور اپنے سنسکاروں کے مطابق میری بے چاری
نا چھوڑا خشک مزاج مجرم و مقدس آئنڈ ایٹس دو سہرا جنم لے چکی ہوں گی۔ تو کیا پتہ وہ اس پھل کی جڑ میں
لنگال کے ایک دریا میں پیدا ہوئی ہوں۔ اور وہ پھل اب اس پلیٹ میں میرے سامنے تلی ہوئی رکھی ہو۔
بے چاری آئنڈ ایٹس بارو کو کس طرح نوش کر سکتا ہوں۔ ۱۱۱۱

اب اس نے کرسٹوفر کولمبس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے پکھانے لگا۔ دیپالی دفعتاً شدید کراہت
ماٹھ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ ڈک بارو کہتا رہا۔ "سزسین۔ میم۔ گو میں۔ BI ہوں مگر مجھے کرسٹوفر
نسبت ہے کہ تھام دو نوں شادی بھی کر لیں۔ آپ کو ہتھ ہے GAY شاریاں اب کافی ہونے لگی ہیں۔"

کرسٹوفر نے شراب زیادہ نہیں پی تھی اور پتے ہوش و حواس میں تھا۔ وہ دیپالی سین کے سامنے
پ کر مرنے ہو گیا۔ اندر ہال میں یا سہین بلونڈ مرحومہ کے متعلق تقریریں جاری تھیں۔ دیپالی نے کہا۔ "اچھا
نٹ۔ اب میں چلتی ہوں۔"

جوک نے دہرایا۔ کیا پتہ اس پلیٹ میں آئنڈ ایٹس بارو تلی ہوئی رکھی ہوں یا گریٹ آئنڈ میل ان کو
SIZZLER پڑا گیا ہو۔ چھن چھن چھن۔ ہم سب SIZZLER پر تلے جا رہے ہیں۔ آپ بھی میں بھی
ب۔ میں۔ BI ہوں۔ اگر میرے بنگال سولین امپر پلیٹ بارو ہندو گوں کو اور زانوس گریٹ گریٹ فادر
یورڈ بارو احمد میرے چچا ونگ کمانڈر رچرڈ بارو کو جن کے اسم گرامی ریمبر ایام رچرڈ ایڈن رڈ بارو رکھا گیا۔

علوم ہو جائے اور میرے خاندان کی ان نامور موجود مشنری خواتین میں مثلاً، بیبل، ماڈ، آلیس کو معلوم
 کہ چارلس بارلو آئی۔ سی۔ ایس کا ایک پوتا ہندو سماجی بن گیا اور میزبان لو کا ایک پوتا، چارلس بارلو کا
 GAY۔ تو ان کی قبروں کے اندر۔ قبروں کے اندر بھونچال آجائے گا۔ مسز سین آپ اب بھی
 ہیں۔ ہم NOW جزیشن والے صاف گو لوگ ہیں۔ ریا کاری آپ لوگوں کا اور آپ کے پرکھوں کا
 تھا۔ میرے بارو بزرگ اور ان کے ساتھی جب MERRY انگلینڈ کے پبلک اسکولوں میں پڑھتے
 بھی GAY ہو کرتے تھے۔ مگر اوسکو وائیلڈ کو پرسیکیوٹ کرتے تھے۔ بیڈی چیئر لیز اور ممنوع تھی
 خواتین وہی سب کرتی تھیں۔ آپ بہت جاذب نظر خاتون ہیں۔ میں۔ بی۔ ہوں۔ کیا آپ محض 'ERO'
 ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو صد میں پہنچایا۔ آپ غالباً ایک CLOSET CASE
 وہ جلدی سے اٹھ کر تیز تیز قدم رکھتی واپس کلب کے اندر چلی گئی۔

۴۴

آتما رشتائی۔

بنگلہ دیش بمان سے ڈم ڈم پر اتر کر وہ سیدھی ریلوے اسٹیشن گئی۔ پھر ڈکاس کا ٹکٹ لیا۔
 کے تیس سال بعد کے ہندوستانی عوام کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹرین کلکتے سے نکلی۔ پرانے ٹھوں اور
 ایسٹ انڈیا کمپنی کے کافی آلود و منزلہ بنگلوں کے برابر سے گذرتی۔ بولپور روانہ ہوئی۔ مقابل کی سید
 ایک بوڑھی بنگالی بیوہ بال حنڈائے سفید موٹی دھوتی کے آنچل سے سر ڈھانپے اکڑوں بیٹھی تھی۔
 انہماک سے کدو کے بیج نکال رہی تھی۔ نوکیلی مونچھوں والا ایک تو مند لمبا تڑنگا پوربی بھیا گلے میں تھی۔
 پہنے اپنی چار سالہ بچی کو گود میں بٹھائے کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ بچی کی مانگ میں گہرا سیندھور
 چائیلڈ میرج اب بھی موجود ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دھکا سا لگا۔ کونے میں تین طالب علم ایک سیاسی
 میں مصروف تھے۔ پھر انہوں نے اگت کرا ایک ساتھ لمبی جمائی لی۔ دوسرے کونے میں ایک بد صورت مارو
 عورت کارچوبی نائیلون کی گلجانی ساری کے آنچل کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔ ایک اندھا دلینو بھیا
 ایک تارہ بجاتا بھیک مانگتا کو ریڈور میں سے گذرنا ڈرتے ہیں آیا۔ اور مادھو آچار یہ کا مدھر اشٹک لاپنے لگا

دھرم مدھرم ددہنہ مدھرم نینم مدھرم ہستم مدھرم — دو مسافروں نے اسے پانچ پانچ پیسے دئے۔ وہ کچھ
 یر متوق کھڑا رہا۔ پھر ٹوٹا ٹوٹتا باہر چلا گیا۔ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ دو مسلمان کسان —
 بڑی سی چھجے والی تنکے کی ٹوپیاں، چارخا، تھمیریں، چھدری داڑھیاں، ایک کے باہر کونکھے ہوئے دانت —
 ایک بوری اٹھائے اندر آئے۔ ڈبہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ دونوں فرس پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ٹرین پھر روانہ ہوئی۔
 دونوں طرف دھان کے کھیتوں میں سارس کھڑے تھے۔ سپاٹ غیر دلچسپ لینڈ اسکیپ۔ بنگلہ دیش
 کے مسکور کن پکھریسک مناظر سے اس قدر مختلف۔ وہ میرا وطن تھا۔ دیپالی نے سوچا اور اس کے دل پر ایک
 گھونٹہ سالگا۔ وہ میرا وطن تھا۔ مشرقی بنگال۔ جس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔ اور میں جلا وطن۔

برودان اسٹیشن آیا اور نکل گیا۔ بولپور پر ٹرین رکی، بیگ اٹھا کر وہ پلیٹ فارم پر اتری۔ سامنے ہی شو
 کس میں شانتی نکیتن کی مشہور ریشمی ساریاں رکھی تھیں۔ اور مرشد آباد میں اب بالوچر ساریاں دوبارہ بنائی
 جا رہی ہیں۔ روایتی باجوہ کارگریگر استاد عبدالباسط خان کوراشترتی کی طرف سے قومی انعام مل چکا ہے۔
 کلکتہ میں گھوگھو کی بیوی نے اسے بتایا تھا جو کالج انڈسٹریز کے محکمے میں ملازم تھی۔ اسٹیشن کے باہر سائیکل رکشاؤں
 کا بجوم۔ بدقوق رکشاؤں والے۔ ایک لڑکا دانت لکڑے سے خالی رکشا چلاتا اس کی طرف آیا۔ سامنے چھوٹا سا بازار
 اسلامیہ ہوٹل، بڑی مسجد، پرانا نانوس شانتی نکیتن۔ چند منجھی سے طلبا راٹھی کیس منہلے رکشاؤں پر بیٹھے
 اسٹیشن کی طرف آرہے تھے۔

”کہاں چلوں دیدی؟“ لڑکے نے پوچھا۔

”تمہارا کیا نام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”آمار نام علی حسین۔“

”علی حسین!“ اس نے دہرایا۔ یہ بدقوق رکشا والا علی حسین انڈیا میں بھی موجود تھا۔ بنگلہ دیش میں بھی

پاکستان میں بھی۔ اس کے لئے کچھ نہیں بدلاتھا۔

گیٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے اپنے پرانے پروفیسروں کے متعلق دریافت کیا۔ چند مرچکے تھے۔ پروفیسر نے ^{حسین}
 بھی مرچکے تھے جن کے اصرار پر وہ یہاں داخلہ لینے آئی تھی۔ ایک کمرے میں جا کر وہ دم سے پینگ پر بیٹھ گئی۔
 باہرات کا اندھیرا چھارہا تھا۔ اور کمرے میں پھر بھبھناہے تھے۔ اجاڑ۔ اجاڑ۔ اجاڑ۔ جلداز جلد پورٹ
 آف اسپین اپنے گھر واپس پہنچنا چاہئے۔ اس نے اپنے نفیس شاندار بیڈروم کا تصور کیا۔ لالت اس وقت

دے جانے کیا کر رہے ہوں گے۔ وہاں اس وقت نہ جانے کیا بجایا ہوگا۔ اونٹنہ۔ اب یہ سوچنے میں کون سرکھتا
 کہ اس وقت وہاں کیا بجایا ہوگا۔

بے رونق ڈانٹنگ ہال میں جا کر اس نے بڑبڑہا کھانا کھایا۔ ہدیزہ کھانا۔ بے نیلے لوگ۔ پہلی بار اسے
 احساس ہوا جنوبی امریکہ میں اٹھا۔ کئی سال گزارنے کے بعد وہ اس جگہ کے لئے اجنبی ہے۔

صبح تیز دھوپ میں وہ اپنی پرانی مادر در سگاہ پہنچی۔ بے رنگ۔ بے رونق۔ سمولی نو عمری میں یہ جگہ
 خوابستان معلوم ہوتی تھی۔ شانتی کی عین کاروانس! علم و فن اور آرزووں کا گہوارہ! وہ ادھر ادھر تھی۔
 ٹیگور کے مکان کا چکر لگایا۔ واپس گیسٹ ہاؤس جا کر کھانا کھایا۔ سوئی۔ شام کو پھر باہر نکلی۔ یہ جگہ اس
 کے لئے اجنبی تھی۔ توجہ! بیدی کے ساتھ اس درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئی جہاں وہ اپنے طالب علمی کے زمانے
 میں بیٹھا کرتی تھی۔ جہاں ہمارے ہیرو سیدنا تھ ٹیگور کو اچانک عرفان حاصل ہو گیا تھا۔

آمار پرانہ آرام

موبیر آئند

آمار شانتی

غلط۔ بالکل غلط۔ سب فراڈ ہے۔ کیسا عرفان۔ اور کس چیز کا۔

تسے کی اوٹ میں چند لڑکیاں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ امتیاز بچپن اور دھڑکنے کا تذکرہ کر رہی تھیں
 سامنے فلم قیصر۔ اسٹار ڈسٹ اور اسٹار رائیڈ اسٹائیل رکھے تھے اور ایک ٹرانز سٹر۔

یہ برصغیر ایک ایسا خلا ہے جس میں معلق نوجوان ٹرانز سٹریپر فلمی گیت سن رہے ہیں۔ ناصرو نجم انصاری اور
 اس کے جیسے نوجوان شاید بہت جلد اب ان تینوں ملکوں میں انوکھے کچھے جائیں گے، آؤٹ سائڈرز۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا دقت سے اٹھی۔ سبزے پر سے گزرتی پھانک کی سمت
 بڑھی۔ کلابھون کے باغ میں مہا تہا بدھ کا مجسمہ نظر آیا۔ سارا مجسمہ مٹی کا تھا۔ پاؤں بھی مٹی کے تھے۔

شام ہو گئی اور سال کی آئیو کے پرے سنخمال پر گننے کے کسان درستی لئے اپنے گاؤں کی طرف جا رہے
 تھے۔ کنول اور فصل اور دھنک کے دیوا! سورہ درن پر تھی! تو کہ بیچ ہے اور درستی اور ہمارا ہاتھ۔ اور

ہمارا دل اور ہمارا گھر۔ تیری تقدیس ہم نے جھانجھ اور بانسری بجا کر کی۔ وہ جنگل کی طرف بڑھی۔

چاند نکل آیا۔ کچھ پھرے شام۔ کچھ پھرے۔ دو ایک گول سفید سادھی جانتی میں

نک رہی تھی چاروں طرف سے بند کسی مٹھ کے جسہ خانے کی طرح بریتناک گول سادھی۔ سفید نیپاسا بند۔ کھیلے کسی زمانے میں سستی ہونے والی کسی مظلوم بے چاری کی خوفناک یادگار۔ دیپالی نے اپنی بیشاپانی سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ دہشت زدہ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی کٹھے سے باہر نکلی اور مرگ پر چلنے لگی۔

بولپور کے ہینڈلوم کارخانے میں باہر مسلمان جنگالی جولاہے کرگھول پر ساریاں بٹی رہے تھے۔ ان کے کھولنے نے ڈھاکے کی لہل اور مرد آباد کار شیم بنا تھا۔ "بھور بھے کر گھے پر بیٹھے، رات پڑے کر گھے پر بیٹھے ور کے پردہ ایسے رنگ والی ساریاں بننے والے۔ کسی ہمارا جگاری کے بیاہ کے لئے ساریاں بننے والے ولا ہے۔ او میاں جولاہے۔" سروجنی دومی نے پوچھا تھا۔ "سرد چاندنی میں۔ اتنے سنجیدہ، گھبر بیٹھے یا بٹھے ہو میاں جولاہے؟

"شاعرہ! پردوں جیسا، بادل جیسا سفید، کسی مرنے والے کا کھن بننے ہیں ہم۔ دلہن کی سرخ ماسی صوموت کا سفید کھن۔ تانا بانا۔ زندگی اور موت۔ سکھ اور دکھ۔ نیکی اور بدی۔ امن اور تشدد۔ بچان اور جہاں آزار۔ یاسمین اور شہر زاد۔ فرقان اور ناصرہ نجم السحر۔ چارلس بارلو اور سوامی آتم آند۔ اہدی بزرگی اور رادھیکا سانیال۔ ریمان اور منہرہ۔ ریمان اور دیپالی۔ گوری۔ میں نے تمہارے لئے الہاب کھود ہے۔ اور سبزی باڑی بنائی ہے۔ میں تمہارے لئے سیندھ کی ڈبیا اور ڈھاکے سے سیناگ کی بڑیاں لاؤں گا۔" یاسمین ایک بار کہہ رہی تھی وہ ایک مدد اپنا ٹروپ بنائے گی۔ اور مولوی شیم الدین کے کشی کا تار ماٹھ کا سیلے تخلیق کرے گی۔" دیکھو ہم نے اس کتاب پر سروجنی دیسی سے دستخط لئے ہیں۔ سے سنبھال کر رکھنا۔" دیپالی دیدی میں نے از جہد منزل کے جلد گھر میں سروجنی دیسی کے پانگی بردار کا سیلے ش کیا۔ سچ سچ پانگی چیلے۔ پانگی چیلے ہو۔ ہو۔" میری ان کی ہریت پلانٹ ان بن۔ کل نہ پانڈ ہاں بٹھارے تال ہی بیٹھوں۔ بیچے ٹوپک جاؤں۔ ارے وہ تو دھنک کی طرح فائرب۔ چاند بچھ یا۔ چاندنی کچھ تھی۔

"آدھی رات کا جنگل جہاں سٹیہ پرندوں کی آواز میں چہکا اور محبت ستاروں میں جملہانی اور شاکا دیوں کے روپ میں بھی۔" خزاں نے گایا۔ الم کے دل پر برستی شفق بادلوں پر پھیلی۔ دھان کے گوشوں کے سنہرے طوفان کو تیز آدھی نے بادل کی طرح اٹا دیا۔ ہوانے مجھے آوازی۔ تم سب کے ساتھ خرابان

پتوں کی طرح بکھر گئے۔ ”سانپ ایفون کے پھولوں میں خوابیدہ اور جگنو خاموش چپے کارا ستر روشن رہے ہیں۔“ جگنل کے ایک قدیم کوئی نے کہا تھا۔ ”ہو ایں جگنل کے مندر میں رقصاں ہیں اور خاموش کافا دیوتاؤں کو عود لبان چڑھا رہی ہیں۔“ شہزادی زیب النساء۔ نہیں۔ بیگم جہاں آنا مرشدانہ پھول بن میں چھپی کچھ کہہ رہی ہے۔ مگر اس کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ جہاں آرا اور یاسین اور گوگلی مالا تینوں کائنات کے جملہ گھر میں پردے کے پیچھے سے مسلسل چلائے جا رہی ہیں۔

- OFF-STAGE

اب صبح کا نارنجی دیشوریراگی سورج کا لوٹا ہاتھ میں لئے دریا کی اور بڑھ رہا ہے۔ وہ نیلو فر جانے والی بہاروں میں کھلیں گے۔ وہ ستارے جو آنے والی راتوں میں جگنکائیں گے۔ وہ یا تری جو استقبال کے مہما کی سمت بڑھیں گے۔ پتوں کی جھک میں ساد تری کا الم اور سینا کی دفا اور رادھا کا ہشت اور شکلا کے آنسو اور دینتی کا خوف پوشیدہ ہے۔

شاعر نے کہا۔ اور زرد پھول جو بہار کے قدموں کے گھنگر وہیں، اس نیم تاریکی میں کسی پہلنے والے کے چمکیے بھوت معلوم ہو رہے ہیں۔ آسمان کی منڈیر پر ستاروں کے دینے جل رہے ہیں۔ بادل نڈکاؤں کی طرح آسمان کے دیا پر سے گزرتے جا رہے ہیں۔

بولپور ریلوے اسٹیشن کے سامنے مسجد کے نیچے برگد تلے ایک مسلمان بوڑھی اندھی بھکارن اللہ پکار رہی ہے۔

”زندگی کا میلہ جو ابدیت کے میلے کی سمت رواں ہے۔ ایک بوڑھی فقیرنی مسلسل کلمہ پڑھتی رہے۔ وہ بارش اور دھوپ میں ٹیٹھی افلاس اور بھوک اور دکھ سے معروف گفتگو ہے مگر نشاں دنیا اس پکارنے یاد سننے اس کا ایمان اس کی حاجت اور مصائب سے زیادہ صاف تھا ہے۔ لا اللہ الا اللہ! الرسول اللہ! سیروجنی دینی نے کہا۔

ریلوے اسٹیشن کے سامنے رکشاؤں کا جھوم، مہنس کھد قوق علی حسین سے اپنی رکشا پر گیٹ ہوئے سے لیا ہے۔ ”دید می اب کب آئے گا۔“ وہ بغاشت سے پوچھتا ہے۔

”معلوم نہیں۔“ وہ جواب دیتی ہے۔

سامنے مسجد کے زیر سایہ برگد تلے، بوڑھی اندھی بھکارن لوگوں کے قدموں کی چاب پر دھیان سے

... ٹیٹھی ہے۔

۴۵ ونگالہ راگنی

علی پور روڈ کلکتہ اپنی کوچھی کے برآمدے میں روکنگ چیر پر بیٹھی کماری ادمار لے بالکل اپنی مرحومہ والو
ن پری توش رائے معلوم ہوئیں۔ وہی غصیلا چہرہ۔ وہی جھڑیاں۔ یا میں ہاتھ میں بڑے سے سزرد کی وہی انگشتری
ر شال۔ ہر ت جیسے سفید بال۔ بالکل کوئی بیوہ مہارانی۔ راج مانا۔ پہلے جتنی موٹی تھیں بیماری کی وجہ
ب اتنی ہی دہلی ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے پوڈ لڑکوں کو ناشتہ کروا رہی تھیں۔ باغ میں چند کالے کلوٹے شنگے پور بی بچے کھرنے لگے گھاس کھونڈنے
مروت تھے۔ چالیس سال قبل ووڈ لینڈز۔ رمن۔ ڈھاکہ میں بھی یہی منظر تھا۔ کون کہتا ہے کہ دنیا بدل گئی۔ یا
سوش انقلاب آگیا۔ یا ٹیکنالوجی تحریک چلی۔ اور وہی اوکو کریک اسٹو کریک عافا ذیہی۔ بے کالی
والی۔

”نوشکار اومادیدی۔“

”نوشکار۔ کیسے آئیں۔“ اب وہ زیادہ کڑنکی ہو گئی تھیں۔ دیپالی نے بنگلہ دیش اور انڈیا آنے کا

د بتایا۔

”تم کو معلوم ہے۔ میرا بھائی نریندر وشراب پی پی کر مر گیا۔ ریمان مجھے چھوڑ کر بنگلہ دیش چلا
دغا باز۔“ ان کی جھیر جھری آواز جھرا گئی۔ ریمان کی وجہ سے ان کی زندگی کتنی بڑی طریمڑی رہی۔ دیپالی
سوس کیا۔ وہ خود کنارے پر کھڑی ہلکی پھلکی تماشانی ہے۔

”ریمان اپنی روتس میں واپس گیا اومادی۔ ایک وقت آتا ہے جب انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک
موجوم ہندی تصادم ادبے آرامی سے بہتر ہے کہ انسان اپنی جڑوں میں واپس چلا جائے۔“

”کیا وہ تم سے یا مجھ سے شادی کر لیتا تو کلچر CLASH کا سامنا کرتا؟“

”شرع میں نہیں۔ مگر آخر میں۔ بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے انسان کو اپنے ہندی گہوارے کی

ت ہوتی ہے۔ وہ اپنی ماں کی تہذیب کا متلاشی ہوتا ہے۔“

”کیا ارجمند منزل اس کا گوارا ہے؟“ اُدامی نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ اور غصے سے ہاتھ لے کر کھانے لگیں۔

”فابآ۔ ایک حد تک۔ ارجمند منزل بھی۔ اور زہرہ بھی۔“ دیپالی نے اطمینان سے جواب دیا۔
 میں لڑکھن سے ان سے ڈرتی آئی ہوں۔ اب میں کیوں ڈروں۔ اب یہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہیں۔ اب یہ بولبی بولبی نہیں کر سکتیں۔ اب میرے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔ اصاب ریحان الدین احمد بھی درمیاں نہیں ہے۔ ڈاکٹر بنوئے چند سرکار۔ اود۔ اور۔ ایک لخت اسے ایک انتہائی لکیز خبی کیا۔ اب ہمارے سے زیادہ دو لہتمند ہوں۔ پورٹ آف ایس میں میرا کونسل مینشن ڈوڈ لیٹمنڈ : کم شاندار نہیں۔ تو رعب کس بات کا۔؟ کرسی پر آگے کوچھکی کھانسی ہوئی کھجور کی طرح سوکھی چمر اُدمارے بید قابل رحم امد مٹھکے خیز معلوم ہوئیں۔ کیا ہیں ان سب کو معاف کر دینا چاہئے۔ جیوں۔ ہیں اذیتیں پہنچائیں؟ کیا یا سہیں نے بھی معاف کر دیا تھا؟ شوا۔ شوا۔

”یہی نے ریحان کو ہر حال میں دیکھا اور اس کا ساتھ دیا۔“ اُدامی نے کھانسی کھانسی کر کہہ رہی تھی۔
 ”جنگ سے پہلے کے لندن میں طالب علم۔ ڈھلکے میں باؤں فقیر کے بھیس میں انڈر گراؤنڈ انٹھلابی۔ آدش وادی۔ رومیننگ۔ پارٹیشن کے بعد کلکتے میں مرگواں پریشاں حال۔ پھر کامیاب ایڈر۔ چندا فطر۔ اور اب تم اسے بنگلہ دیش کا نیا ٹائی کون دیکھ کر آ رہی ہو۔ اب وہ مجھے مدتوں خط بھی نہیں لکھ پھیلے دنوں اس کا امن پرست شاعر لولا کلکتہ آیا تھا۔ میں نے ٹیلی ویژن کے یوتھ پروگرام میں اسے دیکھا۔ مجھ سے ملنے تک نایا۔“ اچانک انہوں نے پیتر ابدل کر کہا۔ ”دیپالی۔ تم بہت خوش قسمت ہو۔ تم مجھ سے ہمیشہ باز رہے گئیں۔“

”آپ کا ایسا خیال ہے اُدامی دی؟“ اس نے سکون کے ساتھ کہا۔ معلوم ہوتا تھا محمد آن سپورٹنگ اور موہن بنگان کے فٹ بال میچ کے خاتمے پر دو خواتین کھیل کے متعلق تبادلہ خیالات کر رہی ہیں۔
 الم ایک حبیب سیاہ پرند کے مانند اڑتا ہوا آیا اور مڑھکا کر پھیل کر ان کے نزدیک بیٹھ گیا۔
 بیروہ حاضر ہوا۔ ”مس صاحب۔ گاڑی تیار رہے۔“

”چلو۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔“ اُدمارے نے دیپالی سے کہا۔

وقت کا کپالک کھوڑ لیں گی مالا پہننے۔ عسا میں گشتیاں اور جھنڈیاں لگائے آگے چل رہے ہیں۔

”کلب —؟“

”نہیں۔ مندو۔ ماں کے مندو۔“

اومارائے پہلے لائڈز میں تھیں۔ اب مذہبی ہو گئی تھیں۔ برہمچاریوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ اومارائے ایک ہیٹنگ۔ بے جان، گروٹسک مدنی کی پرستش کرنے کے لئے بنا رہی تھیں۔ ان میں اور جاہل بھوتارتی ویسی میں ندگی نے کیا فرق باقی رکھا۔

دو دونوں برآمدے کی مرمریں میٹھیوں سے لٹری کر کے لے گئیں۔

”کالی گھاٹ —؟“ شو فر نے دریافت کیا۔

”نہیں۔ سیٹور۔“ ماکن نے جواب دیا۔

سیٹور مٹھ کے ایک مرمر میں ہال میں درگا کی بڑی صورتی کے سامنے سندھیا کی آرتی اتاری جا رہی تھی۔ اراٹھ میں چند تک دھاری یورپین اور امریکن سیاسی ٹیلنٹ پھر رہے تھے۔ پھاٹک پر کالی کی خوفناک دیریں بک رہی تھیں۔

پوجا کے بعد دو لوں باہر آئیں۔ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ ڈالیوں پر بندر جھول رہے تھے۔ باپڑے کے نیچے گھنے سیاہ بالوں کا جوڑا کپڑی پر بنائے ایک یوگنی دھیان میں محو آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔

بھیروی اور ”بادلوں کو کھینچنے والی“ میگھر سبھی راگنی کے مانند نکالی یا بنگالی بھیروراک کی ایک نہ قدیم پراچین بنگال کی راگنی ہے۔ سارے راگ راگنیوں کی طرح اس کے ”نادا یاروپ“ سے علیحدہ اس

دیوتا یا یاروپ ”یا سائیکل سپیکر کا بھی تصور کیا جاتا ہے یوں کہ بن گالی راگنی شو کی ایک یوگنی ہے جو گھنے ہاپنی گٹی کے سامنے ایک مرگ جھالا پر بیٹھی ہے۔ درختوں پر بندر اور مرگ جھالا کے پاس ایک شیر ہو جوتا

سیٹور مٹھ کے کچ میں بیٹھی یہ بنگالی۔ راگن بنگالی راگنی نہیں تھی۔ کوئی معمولی کمزور عورت تھی جس نے شاید لہڑیوں سے تنگ آ کر یہ بوجہ ہونے کے بعد سنیا سہ لے لیا ہو گا۔ یا وہ بال دھوا تھی یا ایک پتہ وہ سج

رہا ہو۔ دیپالی نے حیرت سے سوچا۔ وہ اور اومارائے کچ سے گذر کر ایک سنان صحن میں داخل ہوئیں۔ بھی مکمل سنا تھا۔ وہ ایک منڈیر پر بیٹھی گئیں۔ اومارائے نے اپنی سینڈل نیچے گرا دیں۔ پاؤں منڈیر پر

۔ مراقبہ کے انداز میں بیٹھی گئیں۔ دیپالی نے بھی اپنے سینڈل نیچے گرائے پاؤں منڈیر پر سمیٹ لئے ان

دونوں کے جوئے سنگی، سپاٹ زمین پر اِدھر اُدھر پڑے نہایت مضحکہ خیز اور قابلِ رحم معلوم ہوئے۔ دیبا نے سراٹھا کر اوپر دیکھا۔ ایک لنگور درخت کی شاخ پر بیٹھا اسے بڑے غصے سے ملاحظہ کر رہا تھا۔

”کال راتری!“ دیپالی نے ہنس کر کہا۔

”کوئن۔۔۔؟“ اودا دیپوی نے چونک کر دریافت کیا۔

”کوئی نہیں۔“ دیپالی نے ذرا کینے پن سے کہا۔ ”کال راتری۔ شو کے گھر کا ایک بھتیجا۔ لنگور

دب میں۔ آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ غائب ہو گیا۔“

اس وقت تک بھورے کو اڈرینگل میں چاندوں طرف آنجانی مٹھ دھاریوں کے خالی تجربے بہت

اسرار معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے خالی پلنگوں کے ادران کے کھڑاؤں رکھے تھے۔ ہم اپنے جوتے دنیا ہی میں؟

جاتے ہیں۔

سانے چوڑا دیا بہرہ تھا۔ دیا کالی اور بیرو کے دس دس ہاتھوں کے ماندا نہیں پھیلائے؟

کی طرح پر بہ رہے ہیں۔ نردان کی کیا ضرورت ہے۔ کسی نے کہا تھا۔ پانی پانی میں مل گیا۔ میں شکر خانا نہیں

شکر کھانا چاہتا ہوں۔

اس کی یاد خوشبو کا بیس بدل کر ہزاروں میل دور رہن غری کے سائے میں ٹری ٹاپ ناؤ اس کے

بھی پہنچے گی۔

اودگین ناؤ دانے مانجھی۔ تو جوار کے ساتھ آیا۔ بھاتا کے ساتھ۔ شہد جیسے جیت مہنے میں کوٹلیں

پوس کی چاندنی میں مجھیرے مچھل پکڑنے لگے۔ پُشپ بن میں بھنورے گونجے۔

محبت کی باؤلی نوا خشکی پر بھی چلتی ہے۔

غلط۔ بالکل غلط۔

ایک قتل کر دی گئی۔ ایک نے خودکشی کرنی۔ ایک جلاوطن ہے۔

اور اُدھارے برگد تلے منڈیر پر بیٹھی سر جھکائے آہستہ آہستہ دھونکنی کی طرح کھانس رہی ہیں۔

قہرناک کالی۔ قہرناک۔ رحیم۔ مادرِ عظیم۔ تیری قربان گاہ میں میں نے پودینے کی پتیوں اور

چادل اور موت اور زندگی کے نذرانوں سے انجلی سمائی۔ اُدھا جاتی۔ میں تیرے لئے کلیاں اور جنگل کی

لے کرائی ہوں۔ ایسا پاروتی۔ سارے سکھ اور سارے دکھ تیرے لئے۔ گری جاشموی۔ درختوں نے سرسرا

برایا۔ ڈایاں آدمیوں کے ہاتھوں کی طرح بنے گئیں۔ شیل پتیری بخاشا کا نیا درگا۔ گری مدھر۔ دفتر کو جا
جب رام پر خاد سلین ماں ماں پکارنے پکارنے ماجرا گئے تھے تو انہوں نے کہا تھا۔ ماں۔ ماں مت
رو۔ پتہ نہیں وہ مر چکی ہے۔ دودہ آئی کیوں نہیں۔

اومارائے اپنی دولت اور اپنے پودے لڑ اور اپنے ملازموں کی ڈوسراقت میں دنیا میں بالکل تنہا تھیں۔
اچانک انہوں نے سراٹھا کر بڑے اضطراب سے کہا۔ "مجھے کوئی اچھی خبر سناؤ۔ میری زندگی
اچھی خبریں بہت کم ہیں۔"

"اچھی خبریں میرے پاس بھی بہت زیادہ نہیں ہیں اومادیدی۔ دنیا پی نے کہنے سے جواب دیا۔
دو دوڑھی تیلیاں تھیں جو ایک سنسان گلی میں برگد تلے اپنے اپنے پیچھے تیز گئے ایک دوسرے کے مقابلے پر
وجود تھیں۔ چند لمحوں بعد دیپالی نے کہا۔ "جہاں آراہ سے اپنے سامنے خانڈان کے گولی سے اڑادی گئی۔"
"اور کوئی بُری خبر سناؤ۔"

"یاسمین حمید نے خودکشی کر لی۔"
"اور۔۔۔"

"اومداس سے پہلے جہاں آراہ کی چھوٹی بیٹی ہے، ہوائی جہاز کے حادثے میں ہلاک ہوئیں۔ آپس کے
باڑوں پر جہانڈا گرا ان کی لاشوں کا پتہ تک نہ ملا۔ وہ ایک مردہ خانڈان کے سردیڈ جو کیدار کی طرح اب ذرا تفصیل
سے بیان کرنے لگی۔ "اور جہاں آراہ جب ماری گئی اس کے خون کے چھینٹوں سے سارا کمرہ جلال ہو گیا اور اس
بھیجی مکمل کر دیو اسے چپک گیا۔ اومدو اب قمران ماں کو کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے۔۔۔"
"اور کوئی بُری خبر سناؤ۔"

"میرے بابا۔ آپ کے سابق ہینڈ مین گلگتہ بنوئے چندر سرکار کینسر سے مرے۔ بہت سخت تکلیف
یہ جان نکلی۔ آخر وقت میں ان کی شکل دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور ان سے دو سال پہلے میرے بھوپو بھی ہوتا رہی
یہ اندھی ہو کر مرے۔ اور اتنا شدید بلڈ پریشر کہ پاگلوں کی طرح چیتھی تھیں۔"
"اور کوئی بُری خبر سناؤ۔"

۱۰ اظہار ہوس صدی کا بنگالی شاعر اور کالی بھگت۔ جس سے لیک مرتبہ ان کے گیت شاہی بجرے میں سفر
تے ہوئے فواب سراج الدولہ نے بھی سنے تھے۔

” اور — آپ سامنے دیکھ رہی ہیں — وہ ادھر دیکھئے — پریتوں کے منہ سے اگ نکل رہی ہے۔ سوچی کچھ بھوت آپ کے تعاقب میں ہیں۔ اور میرے تعاقب میں۔ زمانہ مغزور انسانوں کو کچل کر رکھ دیتا ہے ” اب تم کالی کے روپ میں میرے سامنے ظاہر ہوئی ہو۔ ” اومارائے نے خائف ہو کر کہا۔

” ہم اپنی جوتیں اسی طرح بھگتیں گے۔ کالی بھی مر چکی ہے۔ سمجھ ٹھنڈا پڑنے والا ہے۔ ” دیپالی سردھری سے جواب دیا۔ ” میں اپنے باپ اور بھوپتی کی راکھ لے کر ہر دو در جا رہی ہوں۔ راستے کا انتہا ہے۔ سنے امدادی سیلور مٹھ کے سناسی کیا گاتے ہیں۔ میں آپ کو سناؤں — ’دنیا کے اس ماٹ میں آن بیٹھی اپنی پتنگ اڑا رہی ہے۔ لاکھوں ڈوروں میں سے وہ ایک ڈور کاٹ دیتی ہے۔ اور جب پتنگ کو لے سیکر اس دست میں پھینچ جاتی ہے تو اس ہنس کرتالی بجاتی ہے تے

۴۶ بھیرورگ

آخر شب کی سیکر ان تاریکی میں بوئنگ جٹ فضائے بسط میں تیر کی طرح نکلتا چلا گیا۔ پھر اس کو جگ کر تے روشنیوں کو گھپ اندھیرے نے نکل لیا۔ تاریکی اور آسمان میں گھرے اس فولادی پتھرے جو کئی سو اجلی آتماؤں کے ساتھ مھسور غیر ام بے معنی دیپالی سین نے غیر ام بے معنی یا سین بلونٹ کی ڈائری مٹھا جو اس کے بیگ میں محفوظ تھی۔ اُسے میں واپس لے آئی۔ کس کو دوں۔ کوئی اس کا وارث نہیں۔ خود میرا دیپالا سین کا کوئی وارث نہیں۔ ہر انسان اپنا آغاز اور انجام خود ہے۔ لیکن شاید یا سین بلونٹ کی ایک وارث موجود ہے — نامہ نجم السحر قادری۔ شاید —

ٹوکیو۔ ہونو ٹوٹو۔ سان فرانسکو۔ پورٹ آف اسپین۔ بہت لمبا سفر ہے۔ وقت کا اندازہ مفر اور بیرونی۔ اور اس کے آگے ہتھیان بہا کر لے جانے والے دریا کا سفر۔ اور قبر کے کیڑوں کی زمین کا سافت۔ دفعتاً اسے بڑی شدید طمانیت محسوس ہوئی۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ زندگی بڑی نعمت ہے

لہ مردہ خور بھوت سے سوئی جیسے بائیک مندا لے بھوت
تے رام پرشاو سین کا ایک مھین۔

اسمین نے اپنی "ٹری میں نیک بولگیا تھا۔ IT WAS GOOD KNOWING YOU, WORLD!

اس کے برابر بیٹھے ہوئے امریکن نوجوان نے پوچھا۔ "انڈین۔؟"

"اودر سیز انڈین۔ ویسٹ لنڈیز۔"

"اوہ۔! جیکا۔ کننگز ٹن ٹاؤن۔؟"

"ٹری نیٹراڈ۔ پورٹ آف اسپین۔"

اچانک بڑی سُرّت کے ساتھ اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔ اسپیش کولونیل مینشن۔ وسیع باغ
الہ۔ رین ٹری کا جھڑمٹ۔ کلبسویوزک۔ مشٹریس مس سوتی۔ مشٹریس خیر النساء۔ قابل اعتبار غیر دلچسپ
نوہر لٹ سین۔ اس کی اپنی آرام دہ خوبصورت متمول دنیا خوش گوار موسم۔ موسیقی۔ لذیذ کھانے

سیر و سیاحت I SHOULD COUNT MY BLESSINGS اُس نے یک لخت بے انتہا
نوفزہ ہو کر سوچا۔ ہوا میرے باپ۔ دھتی میری ماں۔ آگنی میرے دوست۔ پانی میرے عزیز۔ آسمان میرے
جانی۔ تمہارے ساتھ وہ کرجم ملتا ہے۔ انت سے تم کو سلام بھیجتا ہوں۔ یوگیشور نے کہا تھا۔

اور بیسویں صدی کے نصف آخر کے بنگال کی رفاقت یا سمن مجید نے لکھا تھا۔ موربڈٹی نہیں۔ لکھا
ہیں۔ ہندو۔ موسم بہار کا بیسے۔ ساری کائنات کا بیسے۔

کہ اپنی ساری بدی اور زالت اور کینگی کے باوجود دنیا بڑی سہانی جگہ ہے۔ قابل قدر
اس نے کھڑکی سے ناک چپکا کر باہر دیکھنا شروع کیا۔ گھپ اندھیری رات۔ چند لمحوں میں صبح کا
پچے سیاہ سمندر اب نظر آنے لگا۔ اوپر سیاہ آسمان۔ تخلیق کی اولین رات۔ ہتیاک، لرزہ خیز بھیرو کے
شر۔ آہستہ آہستہ۔ ہیٹ دھم اُجالا۔ اب میں بھیرو راگ کا دھیان کرتی ہوں۔ اُس نے آنکھیں
ندکیں۔ شجھ۔ سپید پوشاک۔ ششی دھر۔ گلے میں مالا۔ حلق میں زہر۔ رکت نیرہ۔ خون سی سرخ آنکھیں۔
اتوں میں جگمگاتے کڈل۔ بخور جتنے جسے دیوتا گاتے ہیں۔ آنکھیں کھولیں۔ افق پر تلکی سی سپیدی اُچلی
تھی۔ اپنا زسنگھ بھونکتا شدہ بھیرو ساری کائنات۔ اُس نے ہیٹ آہستہ آہستہ مختلف ٹرگیس گنگانی
طرور کیں۔ شو بھیرو۔ ونگا بھیرو۔ آند بھیرو۔ غنیرگی سی آگنی۔ دہ راگ کے سُرور پر تیراکی۔

یہ نوین صدی بنگال کا سنکرت شاعر ٹے سر پٹال

پھر اس نے چینگ کر باہر دیکھا۔ اب پو پھٹ رہی تھی۔ اب مجھے کھیر وراگ میں شو جہاں کی تقدیس کرنے چاہئے۔ وہ اندر ہی اندر ایک بنگلہ بھی گنگنا نے لگی۔ پھر باہر نظر پڑی۔ بہت ہی خوبصورت منظر تھا۔ عہ نگاہ تک شفات پانی اور شفات آسمان۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ کس کا خیال کروں؟ مہاکال اور مہاکالی پر تو دھیان نہیں جتا۔ شو اور شکتی، دونوں فیمل ہو گئے؛ اندر ہی اندر بہت سے گپٹ چیز ہیں۔ کسر پردھیان لگاؤں۔ اور کون سا راگ کاؤں۔ اندر ہی اندر بہت سے گپٹ راگ —

نیچے بکیرہ چین کی موچیں پگھلی چاندی معلوم ہو رہی تھیں۔ رفتہ رفتہ اُجالا پھیا۔ سو دیر ٹھا کر سنبہر انوہ ماسک پہنے جاپان کے ادیر نمودار ہو رہے تھے۔

لاکھوں برس سے سورج اسی طرح ظلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے۔ اور ظلوع ہوتا ہے۔

اور غروب ہوتا ہے اور ظلوع

